www.iqbalkalmati.blogspot.com

محمد اختر ممونکا

سفر تین درویشوں کا

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ترتیب

پہلی بات	----------	۷
تھائی لینڈ	----------	۱۱
سنگاپور	----------	۶۳
ملیشیاء	----------	۸۷
انڈونیشیا	----------	۱۰۷
آسٹریلیا	----------	۱۳۷
جاپان	----------	۱۶۷
فلپائینز	----------	۲۱۷

www.iqbalkalmati.blogspot.com

پہلی بات

۱۹۷۰ء کی بات ہے۔ میں گلبرگ مارکیٹ کے ایک موچی کے تھڑے پر بیٹھا اپنے "رک سیک" کی مرمت کروا رہا تھا۔ تاکہ حسب معمول گرمیوں میں یورپ کے سفر پر نکل سکوں کہ ہمارے علاقے کے ڈاکیئے نے اپنی سائیکل کو بریک لگائی اور خاکی رنگ کے لفافے میں بند ایک رجسٹرڈ' خط مجھے تھما دیا۔ ہم ٹھہرے پینڈو بچے' خاکی وردی اور خاکی لفافہ دیکھتے ہی خاک میں مل جاتے ہیں۔ اگر یہی خاکی لفافہ مجھے گاؤں میں وصول ہوتا تو یقیناً لفافہ کھولے بغیر ہی وہاں کہرام مچ جاتا۔ مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ امتحان میں کامیابی کی خوشخبری سنانے کے لئے میں نے بہاول نگر میں کسی صاحب کو فون کیا تاکہ وہ یہ اطلاع میرے گاؤں تک پہنچا دیں۔ بہاول نگر سے پچیس میل دور جب گاؤں میں میرے فون کی خبر پہنچی تو کچھ یوں پہنچی ـــــ "لہور اچ اختر خون کیتا اے" یعنی لاہور میں اختر نے قتل کر دیا ہے۔ اور یوں میرا معصوم سا فون' خون بن گیا۔

ان وسوسوں کے باوجود ڈرتے ڈرتے خاکی لفافہ کھولا تو معلوم ہوا کہ ملک قاسم کی ایک سالہ پرانی سفارش نے رنگ دکھایا اور شاکر الہدرانی نے مجھے پی۔ آئی۔ اے میں مارکیٹنگ آفیسر مقرر کر لیا تھا۔ میری ٹریننگ کلاس میں اور بھی سات لوگ شامل تھے۔ جن سے میں شرمندہ تھا کیونکہ میں سفارشی تھا۔ مگر بعد میں احساس ہوا کہ حمام میں سب ننگے ہیں۔ میری مراد سفارشی ننگوں سے ہے۔ ویسے تو ہماری کلاس میں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ایک لڑکی بھی تھی ——— درویش دوم ' سید محمد غالب سے میری پہلی ملاقات پی آئی اے کی ٹریننگ کلاس میں ہوئی جو بعد میں دوستی میں بدل گئی۔

ایف ۔ سی ۔ کالج کے سٹیج پر آغا سہیل کا لکھا ' تاریخی ڈرامہ رگ سنگ پیش کیا جا رہا تھا ۔ صلاح الدین لغاری ' مغل شہنشاہ جہانگیر کے کردار میں دربار سجائے ' تخت پر بیٹھا تھا ۔ مَیں منگل سنگھ کے روپ میں زنجیروں میں جکڑا اس کے دربار میں پیش تھا۔ ڈرامہ "کلا ٹھکس" پر تھا جب لغاری اپنے مکالمے بھول گیا ۔ اس نے زور دار تالی بجائی اور دربار برخاست کر دیا۔

صلاح الدین لغاری ڈیرہ غازی خان کا رہنے والا ہے ۔ اور وہاں کے لغاریوں کی سیاسی پہنچ چونکہ ہم لوگوں سے بہت زیادہ تھی ۔ اسی لیے وہ پی آئی اے میں بھرتی تو ہمارے ساتھ ہی ہوا ۔ مگر سیدھا ٹریننگ ڈائریکٹر کی سیکرٹیریٹ میں جا پہنچا ——— صلاح الدین لغاری ' سفر تین درویشوں کا ' درویش اول ہے۔

ہم تینوں دوستوں نے پی ۔ آئی ۔ اے میں ملازمت کے دوران بے شمار سفر کیے اور ہمیشہ اکٹھے سفر کیے ۔ یہ کتاب ان خوشگوار یادوں کی یاد میں لکھی گئی ہے ۔ ان سفروں میں جو کچھ ہوا ' جیسے ہوا اور جس جس سے سرزد ہوا اسے ویسا ہی لکھنے کی کوشش کی گئی ہے ۔ اس کتاب کا کوئی کردار فرضی نہیں ۔ اور کوئی قصہ من گھڑت نہیں ۔ البتہ کرداروں اور قصوں کو پیش کرنے کا انداز میرا اپنا ہے ۔ مَیں لغاری اور غالب دونوں کا بے حد ممنون ہوں کہ انہوں نے اپنی بیویوں کے غیض و غضب کی پرواہ کیے بغیر ' مجھے سب کچھ لکھنے کی اجازت دے دی ۔ اور مَیں نے ان کی اجازت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے کئی ایک ایسی بدنامیاں بھی ان کے نام منسوب کر دی ہیں ۔ جن سے ان کا کوئی واسطہ نہیں۔

۱۹۸۴ء تک ہم تینوں درویشوں نے پی آئی اے کی مارکیٹنگ ڈیپارٹمنٹ میں کام کیا اور اپنے زور بازو سے خاطر خواہ ترقی بھی کی ——— درویش اول سیکنڈی نیویا میں پی آئی اے کا مینجر بنا دیا گیا ۔ دریش دوم کینیا میں اور مجھے مصر میں مینجر بنا دیا گیا ——— مگر پاکستان کے اس بین الاقوامی ادارے میں حالات تیزی سے

بگڑنے لگے۔ محنتی اور دیانتدار کارکنوں پر وجیلنس ڈیپارٹمنٹ کے نا اہل افسروں نے اپنی گرفت مضبوط کر لی تھی ۔ خود دار افسر مشکل میں تھے ۔ پی آئی اے کا کام کرنے کی بجائے بڑے افسروں کے گھروں میں سبزیاں پہنچانے والے ترقی پانے لگے ——— ایم اسلم خان جیسے پروفیشنل گوشہ نشین کر دیے گئے ——— اسلم آر خان جیسے دبنگ افسر کمپنی چھوڑ گئے ۔ اور ارشد مسعود جیسے ذہین افسروں کو پی آئی اے چھوڑنے پر مجبور کر دیا گیا ۔ یہ پی آئی اے کا بد ترین دور تھا ۔ لہٰذا تینوں درویشوں نے "بھریا میلہ" چھوڑنے کا یک لخت فیصلہ کیا اور اپنے اپنے کاروبار شروع کر دیئے ۔

درویش اول اپنی زمینوں پر ڈیرہ غازی خان لوٹ گیا ۔ اور بھیڑ بکریوں کا فارم کھول لیا۔ جب دریش دوم نے درویش اول کے اس نئے پروفیشن کے بارے میں سنا تو اس نے کہا کہ "خدا درویش اول جیسے بھیڑیئے سے بھیڑوں کو محفوظ رکھے۔"

درویش دوم 'کینیا میں قیام پذیر ہو گیا اور سنا ہے کہ ہاتھی پالنے اور ہاتھی دانت بیچنے کاروبار شروع کر لیا ہے ۔ درویش اول نے درویش دوم کے پروفیشن پر تبصرہ کرتے ہوئے صدق دل سے دعا کی کہ "خدا درویش دوم جیسے بھالو سے ہاتھیوں کو محفوظ رکھے"۔

میں نے انڈس گائیڈز کے نام سے ایک سیاحتی ادارہ شروع کیا ہے جو غیر ملکی سیاحوں کو پاکستان کے چپے چپے کی سیر کراتا ہے ۔ میرے اس معصوم سے پروفیشن پر بھی دونوں درویشوں نے مجھے بد دعا دی اور کہا کہ "خدا سیاحوں کو درویش سوم جیسے لیچڑ سے محفوظ رکھے ۔"

کتاب کا نام میرا من دہلوی کے "قصہ چہار درویش" سے متاثر ہو کر ' "سفر تین درویشوں کا" رکھا گیا ہے ۔ "مونو" سفر نامے تو اردو ادب میں موجود ہیں اور سفر ناموں کو پاپولر ادب بنانے میں مستنصر حسین تارڑ کی بہت بڑی "کنٹریبیوشن" بھی ہے ۔ مگر تین سیاحوں کا سفر' ان کے اپنے کردار ' ہر کردار کا اپنا تجربہ ' ایکشن اور ری ایکشن ' یہ اردو ادب میں پہلی کوشش ہے ۔ اگر پسند آجائے تو حوصلہ افزائی ہو گی اور

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اگر ناپسند ہو تو فکر کی بات نہیں ۔ اگلی ایڈیشن میں اپنے علاوہ دونوں درویشوں کو گول کر دیں گے۔

محمد اختر مونکا
لاہور
۱۹۹۳ء

تھائی لینڈ

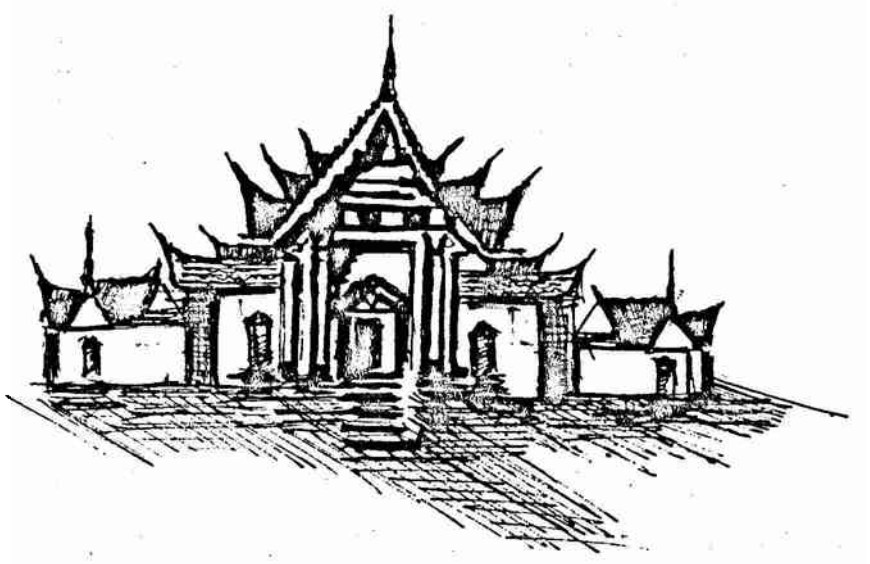

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تین امریکی خلا بازوں کا چاند کا سفر اس صدی کا بڑا کارنامہ ضرور سہی مگر سفر تین درویشوں کا گرد نصف کرہ ارض بھی اپنی نوعیت کا واحد کارنامہ ہے۔ خلابازوں کے سفر کے لیے امریکی سرمایہ اور درویشوں کے سفر کے لئے ان کی اپنی ہی جیب بے مایہ۔

خلا باز تو چاند چکوری کے رشتے توڑ کر لوٹے، مگر درویش چکوریوں سے رشتے جوڑ کر لوٹے۔ ان کا مشرق سے مشرق بعید کا سفر ان گنت کہانیوں اور لا تعداد حماقتوں کا نچوڑ ہے۔ تین یار۔۔۔بے یارو مدد گار۔۔۔بیگانے لوگ۔۔۔انجانے شہر۔۔۔پرائے دیس۔۔۔اور درویش۔۔۔

درویش اول عمر کا پختہ اور قد کا پستہ تھا۔ چلتا تو ایسا گمان ہوتا جیسے جاپانی کھلونے کو چابی دیکر چھوڑ دیا جائے۔۔۔ اسکا بلانگ پیچر نما چہرہ شروع ہوتا تو پیشانی کی حدوں کو پار کرتا ہوا چوٹی تک چلا جاتا۔۔۔ درحقیقت اس کی پیشانی، چہرے اور سر کے درمیان متنازعہ علاقہ تھی۔ کبھی ہوا شرارت کرتی تو اس کی قلیل سی زلفیں بکھر جاتیں اور چہرے سے سر تک ایک وسیع چٹیل میدان سا پیش نظر ہو جاتا۔ درویش اول فوراً ہو پر کنگھی کا جوابی حملہ کرتے ہوئے اپنی خوش بخت پیشانی پر زلفوں کا جال سا بچھا دیتا اور یوں گنجا کہلانے سے بال بال بچ جاتا۔

درویش دوم، قد میں سب سے چھوٹا اور جسم میں سب سے موٹا تھا۔ کچھوے کی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

چال اور جسم پر بھالو سے بال ..... جب کبھی قمیص اتارتا تو محلے کے نادان اور جوان سبھی " بھالو انکل ..... بھالو انکل " کے نعرے لگاتے اور تالیاں بجاتے..... اس چلتے پھرتے چڑیا گھر کا رنگ اتنا گورا تھا کہ اکثر دوران سفر غیر ملکی سیاحوں کے گروہوں میں اسے ڈھونڈنے کے لئے باقاعدہ منادی کروانی پڑتی۔

درویش سوم کی چال بھی ویسی اور چلن بھی ..... چرب زبان' بے لگام اور طوطا چشم ..... اپنی طوطا چشمی کو چھپانے کے لئے اکثر چشمہ لگائے رکھتا۔

درویش اول رنگین مزاج ..... درویش دوم کمپیوٹر دماغ اور درویش سوم زبان دراز ..... تینوں اپنے اپنے فن میں ماہر اور یکتا .....

کراچی ائیرپورٹ میں داخل ہوتے ہی پہلے بکر منڈی سے گزرنا پڑا ' جہاں سفید وردیوں والے قصابوں نے ہمارے سوٹ کیسوں کو بھیڑ بکریوں کی طرح ذبح کرکے اکھیڑ بکھیر دیا۔ اور ہم سامان کی رانوں کو اکٹھا کرکے سوٹ کیسوں کی کھالوں میں بند کرتے رہ گئے۔

درویش اول نے قطار پھلانگتے ہوئے ہمارے پاسپورٹ امیگریشن افسر کی میز پر جا پٹکائے ۔ افسر آخر افسر ہوتا ہے بھلا وہ اس طرح کی بے تکلفی کیونکر برداشت کرتا۔ چنانچہ اس نے ہمارے پاسپورٹ واپس پھینکتے ہوئے حکم جاری کیا " قطار میں آؤ"..... کاؤنٹر کے ارد گرد مکھیوں کی طرح چمٹے ہوئے لوگوں کو قطار تو آپ کسی صورت نہیں کہہ سکتے ..... اسی لئے درویش اول نے ہمت کرکے پھر پاسپورٹ آگے کھسکاتے ہوئے کہا ..... " جناب ہمیں ذرا جلدی ہے مہربانی کرکے ٹھپے لگا دیجئے۔"

موٹی توند والے افسر نے گرج کر کہا ..... " ارے کاہے کی جلدی ہے ..... ٹرین چھوٹی جارہی ہے کیا؟ " اس پلس (پولیس) مقابلے میں درویش اول کی چٹیل پیشانی پر سیلاب سا آگیا..... جہاندیدہ درویش دوم نے پاسپورٹوں میں قائداعظم کی تصویر رکھی اور افسر کے سامنے کردئے ۔ یابائے قوم کے فرمانبردار فرزند نے جھٹ سے پاسپورٹ پکڑے اور پھٹ سے ٹھپے لگادئے' مگر درویش اول کا پاسپورٹ کھول کر تصویر

کو غور سے دیکھنے لگا ..... دراصل پاسپورٹ میں تصویر اس زمانے کی تھی جب موصوف شیر خوار تھے ۔ اب خیر سے اچھے خاصے خونخوار بن گئے تھے' مگر تصویر وہی پرانی ..... پلس والے نے قائداعظم کا بھرم رکھتے ہوئے بس جانے ہی دیا ..... اور درویشوں نے جہاز میں پہنچ کر سکھ کا سانس لیا .....

اس سفر میں درویش سوم کا درجہ میرا تھا ۔ دونوں درویشوں کا سامان اٹھانا اور غصہ برداشت کرنا میری ڈیوٹی میں شامل تھا ..... چنانچہ درویش اول کا بریف کیس اور کیمرہ' درویش دوم کا تھرماس اور شیو کا بھدا سا تھیلا میرا ہمسفر تھا ۔ اور میں سامان کی لڑیوں میں کڑے کی طرح جکڑا جہاز میں داخل ہوا .....

درویش اول نے "آئیل" اور درویش دوم نے کھڑکی والی سیٹ سنبھالی اور اطمینان سے بیٹھ گئے ۔ مگر میں ان کا سامان سنبھالے بدحواس مسافروں سے بچتا بچاتا ابھی تک راستے ہی میں بھٹک رہا تھا ..... درویش دوم کھڑکی سے ناک چپکائے جذباتی ہوکر ہوائی اڈے کے عملے تک کو ہاتھ ہلا ہلا کر بار بار الوداع کہے جارہا تھا۔ ادھر درویش اول ہر آنیوالی ایئر ہوسٹس کو دیکھکر تو اخبار تان لیتا ' مگر ہر جانیوالی کا بغور مطالعہ کرتا۔ ائیر ہوسٹسوں کی اِسی جانچ پڑتال کی خاطر ہی اس نے "آئیل" سیٹ پر غاصبانہ قبضہ جمایا تھا' حالانکہ اس سیٹ پر میرا حق زیادہ تھا۔ کیونکہ میں بھی وہی کرنا چاہتا تھا جو وہ کر رہا تھا۔

جہاز کے اڑتے ہی درویش دوم نے ایک عدد انگڑائی اور دو عدد جمائیاں لے کر خوفناک خراٹوں کا ساز چھیڑ دیا۔ درویش اول ہوائی لنگر کھلنے کا بے چینی سے انتظار کرنے لگا۔ جونہی جہاز نے اپنی مخصوص بلندی پر پرواز شروع کی حفاظتی بند بھی کھل گئے اور میخانوں کے در بھی ..... یہ اس زمانے کا ذکر ہے جب پی۔ آئی۔ اے ابھی مشرف بہ اسلام نہیں ہوئی تھی۔ لہٰذا انکے میخانوں میں مشروب مشرق بھی ملتے تھے اور مشروب مغرب بھی۔ جونہی ایک صحت مند ساقی مشروب کی ٹرالی لئے ہمارے قریب پہنچی' درویش اول نے بے صبری سے ایک جام تھاما' بڑا سا گھونٹ لیا' بُری سی شکل بنائی اور کہنی مار کر مجھے کہا۔ " کچھ پیو گے؟ "۔ گویا وہ نہ پوچھتا تو میں پیاسا ہی رہ جاتا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

مگر بے صبر ساقی نے مجھے کچھ کہنے سننے کا موقع ہی نہ دیا اور ٹرالی دوڑاتی ہوئی دوسرے مسافروں تک جا پہنچی۔ میرے لبِ آرزو کھلے کے کھلے ہی رہ گئے اور ہم پیاسے کے پیاسے ہی رہ گئے۔۔۔۔

کوئی چار گھنٹے کی پرواز کے بعد ہم لوگ بنکاک کی فضائی حدود میں جا پہنچے۔۔۔ فضائی میزبانوں نے تکئے اور اخبار سمیٹنے شروع کیے۔ میں نے کھڑکی سے باہر جھانکا' سبزہ زار کو چیرتی ہوئی گدلی نہریں اور نہروں کے کنارے سرخ چھتوں والے گھر۔۔۔۔

بنکاک کی ڈون مانگ ایئرپورٹ پر تقریباً پینتالیس بین الاقوامی ہوائی کمپنیوں کے جہاز بھی آتے ہیں اور یہ تھائی لینڈ کی ہوائی فوج کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ "رن وے" کے قریب لڑاکا طیاروں کی قطاریں تھیں' جن کی حفاظت کے لئے پستہ قد تھائی فوجی متعین تھے۔

ایئرپورٹ کا کچھ حصہ زیرِ تعمیر تھا جہاں مرد اور عورتیں دونوں مل کر مزدوری کر رہے تھے۔ اکثر مزدور گلے سے ننگے (عورتیں شامل نہیں۔ اگرچہ ہمارے جذبے اختیارِ شوق کا شوخ تقاضہ یہی تھا) سر پر بڑے بڑے ہیٹ پہنے کام میں مصروف تھے۔

جونہی جہاز رُکا بونے بونے تھائی فوجی جہاز کو گھیرا ڈال کر کھڑے ہو گئے اور اپنی پلاسٹک کے کھلونا نما سٹین گنیں اس طرح تان لیں گویا جونہی مسافر باہر نکلیں گے فائر کھول دیں گے۔۔۔ درویش دوم فوراً کھڑکی سے پیچھے ہٹ گیا۔ اس کے کمپیوٹر دماغ میں نہ جانے کیا کیا وسوسے جنم لینے لگے۔ ادھر جہاز میں کھلبلی سی مچ گئی۔ چیخ پکار کرتے بچے' چنگھاڑتی مائیں اور دہاڑتے باپ۔ ایسی بد نظمی' افراتفری اور نفسا نفسی کا عالم' جو ہماری زندگی کے ہر شعبے میں نظر آتا ہے۔ جہاز سے اترتے وقت تو کم از کم دنیا کی مہذب ترین قومیں بھی اسی مرض کا شکار ہوتی ہیں۔ ہمارا پیشوا درویش اول تو جنبیری کی طرح گھومتا ہوا دروازے تک جا پہنچا۔ مگر درویش دوم اپنی جسامت کے سبب اور میں سامان کے سبب ابھی تک دھکم پیل کا شکار تھے۔ اس طرح کے ہجوم میں ہر طرح کے حادثے ہو سکتے ہیں۔۔۔ پی۔ آئی۔ اے والوں کو اصولاً "تمباکو نوشی سے

پرہیز" اور "حفاظتی بند باندھ لیجئے" کے ساتھ ساتھ "جیب کتروں سے ہوشیار" کا سائن بھی جلانا چاہیے۔۔۔

جہاز سے باہر نکلتے ہی بارش کی بوچھاڑ' اور بوچھاڑ سے بچاؤ کے لئے چھتریاں تانے تتلی نما تھائی لڑکیاں۔۔ اس گیلے گرم استقبال سے درویش دوم کا چہرہ سرخ اور ہونٹ نیلے ہو گئے۔۔ درویش اول ان تتلیوں میں بھونرا سا بنا پھرتا تھا۔ اسے ایک چھتری کے سائے میں اتنا سکون ملا کہ اس نے بس اور جہاز کے درمیان کئی پھیرے لگا لئے۔۔

امیگریشن ہال میں بھانت بھانت کے سیاحوں کے ہجوم تھے' جو تھائی لینڈ کی اس جنت ارضی کی حوروں کا ٹرائل لینے دور دور سے آئے تھے۔ پاسپورٹ پر ٹھپہ لگوانے کے لئے درویش اول اک سرمنڈے بدھ بھکشو کے پہلو میں جا کھڑا ہوا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ اسے اپنی زلفوں کی بے ترتیبی پر کچھ ملال نہ تھا۔ تھائی امیگریشن افسر نے بھی درویش اول کے چہرے اور پاسپورٹ کی تصویر کا بغور جائزہ لیا۔۔۔ اور پھر اپنے دانتوں پر چڑھے سنہرے خول کی نمائش کرتے ہوئے "ویلکم ٹو تھائی لینڈ" کہا اور ٹھپہ لگا دیا۔

جو پاکستانی کسٹم سے گزر جائے وہ تو پل صراط سے بھی دندناتا ہوا گزر جائے گا۔ اب بھلا تھائی کسٹم والوں کی ہمیں کیا پروا تھی۔ چنانچہ حسبِ ڈیوٹی میں نے دونوں درویشوں کے بھدے بھدے سوٹ کیس اٹھا کر کسٹم آفیسر کے سامنے پیش کئے اور اس نے دیکھنے کا تردد کئے بغیر ہی چاک کے نشان لگا دئے۔۔۔

ارائیول ہال میں نو واردوں کی سہولت کی ہر شئے موجود تھی۔۔۔ "گوائے" ہوئے سیاحوں کی راہنمائی کے لئے ٹورسٹ آفس' زرمبادلہ کے لئے بنک' شہر پہنچنے کے لئے ٹرانسپورٹ کے کاؤنٹر اور ہوٹل بک کروانے کی ایجنسیاں۔۔۔ درحقیقت ہوائی اڈے ملک کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔ جو حشر ہوائی اڈوں پر ہوتا ہے وہی نقشہ ملک کے اندر زندگی کے ہر شعبے میں دکھائی دیتا ہے۔۔ مثلاً "کراچی کا ہوائی اڈہ تصور کیجئے۔۔۔ مسافروں کی آمد۔۔۔ پہلی رکاوٹ محکمہ صحت کے میلی کچیلی وردیوں والے لاغر

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کارندے..... دوسری رکاوٹ امیگریشن' جہاں آمد کی مہر لگانے والے تو چند آفیسر ہی ہونگے مگر چہل قدمی کرنے والے سینکڑوں..... تیسری رکاوٹ ٹرالیوں کی چھینا جھپٹی' پورٹروں سے نجات اور سامان حاصل کرنے کا طویل انتظار..... اسی دوران مسافروں کو تاڑتے ہوئے سادہ لباس والے کسٹم کے جیمز باؤنڈ..... چوتھی رکاوٹ اور بہت بڑی رکاوٹ 'کسٹم کا قصاب خانہ..... پانچویں رکاوٹ تحفوں کی امید میں "جگراتہ" کاٹنے والے رشتہ داروں اور دوستوں کے ہجوم..... چھٹی رکاوٹ ادھ موئے مسافر کے حصے بخرے اور پرزے پرزے کرنے والے ٹیکسی ڈرائیور..... مگر بنکاک میں ایسا کوئی مسئلہ درپیش نہ تھا..... ہاں ٹیکسی ڈرائیور سے سودے بازی کرنا لازمی ہے۔ کیونکہ وہاں بھی ٹیکسیوں پر میٹر تو ہیں مگر میٹر سے ٹیکسیاں نہیں چلتیں..... باقاعدہ سودے بازی کرنی پڑتی ہے۔ یہ سودے بازی بھی اہل مشرق کو ورثہ میں ملی ہے' جس کا اپنا ایک خاص حسن اور انداز ہے۔ اب تو مغرب والے بھی مشرق میں آتے ہیں تو اس انداز کو اپنانے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ ایئرپورٹ سے شہر کوئی بائیس کلو میٹر کے فاصلے پر ہے۔ ٹیکسی ڈرائیور نے دو سو باتھ کا مطالبہ کیا۔ درویش دوم فوراً سودا بازی کے میدان میں کود گیا۔ "سو" چاہے پیسے ہوں نام تو بڑا ہے۔ میں نے سوچا جس رفتار سے "سو" ہماری جیب سے نکلیں گے اسی رفتار سے ہم لوگ بنکاک سے نکلیں گے۔ اور بنکاک میں آنے کے بعد جلدی جانے کو کس کا جی چاہتا ہے۔ سودے بازی کے اس میچ میں ہمارے بھاری بھرکم درویش کا پلہ بھاری رہا اور ایک سو پینتیس باتھ میں فیصلہ ہوا (ایک ڈالر کے تقریباً پچیس باتھ ہوتے ہیں) سودا طے ہوتے ہی دونوں درویش اس اطمینان سے ٹیکسی میں سوار ہو کر بیٹھ گئے گویا ان کے ساتھ سامان ہی نہ ہو۔ مجبوراً ٹیکسی ڈرائیور اور میں سامان سے گتھم گتھا ہونے لگے۔ درویش اول زندگی میں پہلی مرتبہ گاڑی کی اگلی سیٹ پر بیٹھا تھا..... جس میں یقیناً کوئی راز ہوگا جس کا مجھے ابھی اندازہ نہ ہوا۔

بنکاک کا ایک خاص موسم بھی ہے اور ایک خاص مہک بھی۔ دونوں سے

سمجھوتہ کرنے میں وقت لگتا ہے۔ مثلاً ایئرپورٹ سے شہر پہنچنے تک موسم نے کئی رنگ بدلے۔ پہلے بلا کی دھوپ اور کڑاکے کی گرمی تھی اور شاید اسی وجہ سے درویش اول نے آگے کی سیٹ سنبھالی تھی۔ کیونکہ ڈیش بورڈ پر چھوٹا سا پنکھا لگا ہوا تھا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے ہر سو کالی گھٹائیں چھا گئیں اور موسلا دھار بارش سے سڑکیں جل تھل ہو گئیں۔ مگر گرمی بدستور تھی۔ گاڑی کے شیشے کھولیں تو بارش سے بھیگتے تھے اور بند کریں تو پسینے سے۔ کچھ دیر بارش کی بوچھاڑ نے ساتھ دیا۔ پھر ہوا بادلوں کو ہانکتی ہوئی لے گئی اور دھوپ چھاؤں کی ایک عجب کھچڑی سی پکنے لگی۔ اس روپ بدلتے موسم کی بدولت ہی چھتری یہاں کے لوگوں کے لباس کا حصہ بن گئی ہے جو دھوپ سے بھی بچاتی ہے اور برسات سے بھی۔

یہاں کا موسم جتنا غیر یقینی ہے مہک اتنی ہی یقینی ہے۔ بدبو سے کچھ کچھ ملتی جلتی یہ مہک ہر سو پھیلی رہتی ہے۔ لگژری ہوٹلوں کے ایئرکنڈیشنڈ کمرے ہوں یا شہر کی گندی گلیاں' یہ مہک ہر جا آپ کا ساتھ دیتی ہے اور تب تک ساتھ دیتی ہے جب تک آپ سانس لیتے ہیں اور بنکاک میں رہتے ہیں۔ ٹیکسی شاہراہ پر بنکاک کی جانب دوڑتی جا رہی تھی۔ بسیں' ٹرک' رکشا اور پرائیوٹ گاڑیاں سبھی بنکاک کی جانب دوڑتی جا رہی تھیں۔ اگر بنکاک نہ ہوتا تو نہ جانے ان سب کی منزل کیا ہوتی؟.....

سڑک کے دونوں جانب چاول کے کھیت' جنگلی گھاس' کیلے کے باغات' پھولدار جھاڑیاں اور ناریل کے پیڑ..... گندے پانی کے تالاب اور گدلے پانی کی نہریں..... گدلے اور گندے پانی میں گھرے چھوٹے چھوٹے گھر' لکڑی کے گھر' ٹین کی چھتوں والے گھر' پھولدار جھاڑیوں اور کیلے کے باغات سے جھانکتے بڑے بڑے گھر' سرخ چھتوں والے گھر..... ناریل کے پیڑوں سے بھی اونچی طرز جدید کی عمارتیں..... پھر لوگوں کے ہجوم..... نیلی جینز اور شوخ رنگ بشرٹوں والے نوجوان..... رنگ برنگ بلاؤز اور شوخ و شنگ مسکراہٹوں والی نوجوان خواتین..... بڑے بڑے ہیٹوں کے سائے میں چھپی چھوٹی چھوٹی بوڑھی عورتیں..... کپڑوں سے بے نیاز' دنیا سے بے نیاز..... گندا

www.iqbalkalmati.blogspot.com

پانی اچھالتے... گدلے پانی میں ناؤ بہاتے ننگ دھڑنگ بچے... چہل پہل والا جیتا جاگتا شہر...

ٹیکسی ڈرائیور نے چلتی گاڑی میں اپنا کاروبار شروع کر دیا۔ موصوف نے ہلکا پھلکا تعارف کرایا اور درویش اول کو ایک البم پیش کی' جسے کھولتے ہی ہمارے رنگین مزاج پیشوا کی آنکھوں کی ہیڈ لائٹس روشن ہوگئیں۔ اس نے درویش دوم کو البم دیکھنے کا اشارہ کیا' جسے دیکھتے ہی اس کے کان سرخ ہوگئے۔ بات یقیناً خطرے کی تھی.... چنانچہ جو وہ دیکھ رہے تھے وہ دیکھنے کے لئے میں بھی البم پر شکرے کی طرح جھپٹا.... بات واقعی خطرے کی تھی.... ہر صفحہ پر ایک بی بی اور تین تصویریں۔ جبیں' جسم اور جوانی.... تینوں زاوئے.... نام' ناپ اور عمر.... تینوں کوائف.... ہر زاوئے اور ہر طرح کے کوائف پر بحث کرتے تینوں درویش..... جب تک البم ختم ہوا ٹیکسی ہوٹل کے سامنے کھڑی تھی.... درویش اول نے اس جنسی سوداگر کا تعارفی کارڈ حفاظت سے اپنے بٹوے میں رکھا اور شام کو بزنس میٹنگ کا وعدہ کر کے ہوٹل کی لابی میں گھس گیا۔ درویش دوم نے اپنی چھوٹی سی گردن ٹیڑھی کر کے ہوٹل کی جانب اوپر کو دیکھا۔ حد نظر تک منزلیں ہی منزلیں تھیں۔ اس ہوٹل کی چودہ منزلیں تھیں اور ہر منزل کا ایک ڈالر بھی لگائیں تو کمرے کا کرایہ چودہ ڈالر ہونا چاہئے۔ درویش دوم کے کمپیوٹر دماغ نے اپنی مخصوص منطق سے یہ جواب نکالا۔

ہوٹل کے استقبالیہ پر ٹوتھ پیسٹ کی اشتہار نما مسکراہٹ سجائے کوئی آدھی درجن بیسیاں کھڑی تھیں۔ جنہوں نے دونوں ہاتھ جوڑ کر سلام کرتے ہوئے کہا۔ "سوات دی" (صبح بخیر)۔ درویش اول نے اسی طرح ہاتھ جوڑ کر ذرا جھکتے ہوئے کہا۔ "سوات دی ناتگ ساؤ"۔ (صبح بخیر مس) ہم دونوں نے بھی جلدی جلدی درویش اول کی نقل کی اور اس فقرے کی جگہ منہ میں کچھ ایسے ہی بڑبڑا دئے۔ درویش اول نے تھائی بول چال کے کتابچے سے صرف چند فقرے ہی رٹے تھے۔ مگر ابھی تو ہم لوگوں پر اس نے اپنی قابلیت کی دھاک بٹھادی تھی..... ہمارے پیشوا نے نام لکھواتے

وقت لڑکی سے کہا۔ "ہم مسٹر خان کے دوست ہیں۔ ہمیں کمروں کے کرائے میں پچاس فی صد رعایت دیں" اور وہ رعایت ہمیں مل گئی۔ اگر مسٹر خان سے دوستی پر پچاس فی صد رعایت مل سکتی ہے تو اس سے دشمنی پر جرمانہ بھی تو ہوسکتا ہوگا.....

اس ہوٹل کے قیام پر سب سے زیادہ خوشی مجھے ہوئی۔ کیونکہ دونوں درویشوں کا سامان میری بجائے ایک باوردی نوجوان نے اٹھایا۔ لفٹ میں سامان رکھتے ہی اس نے اپنا تعارف کروانا شروع کیا۔ "میرا نام عمران ہے اور میں اس ہوٹل میں واحد مسلمان ہوں۔ ویسے تھائی لینڈ میں کوئی ساڑھے دس لاکھ مسلمان ہیں جو تھائی لینڈ کے جنوبی اضلاع میں رہتے ہیں.... ادھر بنکاک میں سو کے لگ بھگ چھوٹی بڑی مسجدیں ہیں۔" وہ ایک ہی روانی میں طوطے کی طرح رٹی ہوئی باتیں ہمیں بتاتا گیا۔ اس مذہبی ناطے کے سبب ہمیں یقیناً اس سے کچھ انس سا ہو گیا۔ شاید اسی لئے ہمارے وزیر خزانہ درویش دوم نے دل کھول کر اسے ٹپ دیا۔ میرے خیال میں جب سے عرب بھائیوں نے بنکاک کو اپنی شکار گاہ بنایا ہے وہاں کے مسلمانوں نے بھی پٹرول والے اسلام سے گہرا رشتہ جوڑ لیا ہے۔

تھائی کے معنی ہیں آزاد۔ تھائی لینڈ جنوب مشرقی ایشیا کا واحد ملک ہے جو پچھلے ۸ سو سال سے آزادی کی فضا میں پروان چڑھ رہا ہے۔ یعنی حکومت غیر ملکی غلامی سے آزاد اور عوام مادر پدر آزاد۔ سیام' تھائی لینڈ کا قدیم نام ہے جو ۱۹۳۹ کے فوجی انقلاب کے بعد بدلا گیا۔ اس انقلاب نے اس ملک پر تین گہرے اثرات چھوڑے۔ پہلا تو یہ کہ خاندان چاکری کی دو سو سالہ شہنشاہیت کو آئینی طرز شہنشاہیت میں بدل دیا گیا۔ دوسرے ملک کا قدیم نام بدل دیا گیا اور تیسرے یہ کہ تھائی لینڈ سرکار برطانیہ کے اثر سے نکل کر انکل سام یعنی امریکہ کے پہلو میں جا پہنچا۔

اس نسل در نسل آزادی نے تھائی عوام کو احساس کمتری سے آزاد کر دیا ہے۔ اسی لیے وہاں ہر شخص مسکراتا دکھائی دیتا ہے تھائی لینڈ کو "لینڈ آف سمائیلز" کہا جاتا ہے۔ اور ان کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ اس وقت بھی مسکراتے رہتے ہیں جب

انہیں سنجیدہ ہونا چاہیے۔ اس کے برعکس ہم لوگ اسوقت بھی سنجیدہ رہتے ہیں جب ہمیں مسکرانا چاہیے۔

کراچی سے منجراب تک مسکراہٹوں سے محروم چہرے دکھائی دیتے ہیں۔ زندہ دلان لاہور تو خدا خبر کب سے مسکرانا بھول گئے ہیں۔ اگر کوئی تھائی نوجوان لاہور پہنچے تو یقیناً آدھے گھنٹے کے اندر اندر اسکے دانت نکال دئے جائیں۔ لیکن کوئی تھائی لڑکی ادھر پہنچ جائے تو آدھے گھنٹے میں آدھا لاہور اسکے پیچھے ہوگا۔ حالانکہ دونوں کی مسکراہٹوں کا مطلب انکی مخصوص معصومیت کے سوا کچھ نہیں ہو گا۔ تھائی لینڈ کے عوام اپنی زبان اپنے تمدن' اپنے مذہب اور اپنی روایتوں پر بڑا فخر کرتے ہیں۔ بنکاک جیسے بین الاقوامی شہر میں بیشتر دکانوں پر بورڈ تھائی زبان میں نظر آئیں گے۔ اور اگر کوئی دکاندار سیاحوں کی سہولت کے لئے کسی اور زبان میں بورڈ لٹکانا چاہے تو اسے اسکا مخصوص کرایہ ادا کرنا پڑتا ہے۔ چینی اور سکھ دو ایسی قومیں ہیں جو جہاں بھی ہوں اپنی روایتوں اور زبان کو نہیں چھوڑتے۔ مگر تھائی لینڈ میں سب "اک مک" ہو گئے ہیں۔ اور ایسے "اک مک" ہوئے ہیں کہ سرداروں نے اپنے نام تک بدل ڈالے ہیں ۔ مثلاً ہمارے ایک سردار جی دوست جو ہمارے لئے تو کلونت سنگھ ہی ہیں مگر وہاں وہ "کلوات پٹی وانگ سی" کے نام سے پکارے جاتے ہیں۔

مسٹر خان کے پاس جانے کے لئے ہوٹل سے باہر نکلنا تھا کہ رنگ برنگی بشرٹوں والے ٹیکسی ڈرائیوروں نے ہم پر بھرپور حملہ کر دیا۔ ہر ایک اپنی طرف گھسیٹ رہا ہے۔ اگر ہمارے جسم کاغذ کے ہوتے تو یقیناً پرزے پرزے ہو کر بنکاک کی گلیوں میں اڑ رہے ہوتے۔ ہر ایک یا تو سوانا باتھ کا ذکر کرتا یا پھر لڑکی کے حسن کی تعریف۔ مسٹر خان کے پاس جانے کے لئے گاڑی کی ضرورت تھی لڑکی کی تو نہیں۔ بڑی مشکل سے جان بچا کر ایک ٹیکسی میں سوار ہوئے۔ اسے سوراوانگ روڈ پر پی آئی اے کے دفتر جانے کو کہا۔ اس نے پندرہ باتھ کا مطالبہ کیا۔ ہم نے دوسرے ٹیکسی ڈرائیوروں سے جان بچانے کی خاطر فوراً اسکا مطالبہ مان لیا۔ اس وقت دوپہر کے کھانے کا وقت تھا۔

سڑکوں پر بہت زیادہ ٹریفک تھی۔ فٹ پاتھوں پر پیلی پیلی گول مٹول گڑیوں جیسی لڑکیاں ادھر ادھر گھوم رہی تھیں۔ ڈرائیور شہر کی خوبصورت شاہراہوں پر ٹیکسی بھگاتا جا رہا تھا۔ ہم بے صبروں کی طرح ادھر ادھر دیکھ رہے تھے۔ سوراوانگ روڈ پر اکثر ہوائی کمپنیوں کے دفتر ہیں۔ پی آئی اے کے خوبصورت سے دفتر میں گئے۔ مسٹر اسلم خان بنکاک میں پی آئی اے کے مینجر ہیں۔ مگر نہ جانے اس شخص کے پاس کیا جادو ہے۔ اس کا نام بنکاک میں سکے کی طرح چلتا ہے۔ اگر اسی طرح کے تعلقات ہمارے سفارتخانوں کا عملہ بھی رکھے تو پاکستان کے کئی مسائل ختم ہو جائیں۔ مگر پاکستانی سفارتخانوں کے عملے کا کیا رویہ ہوتا ہے۔ اس سے آپ واقف ہیں۔ اور اس عمل کے نتیجے میں پوری قوم کو خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے۔ اسلم خاں اپنی سیکرٹری سے خط لکھوا رہے تھے۔ ہمارے جانے کی خوشی اسلم خاں سے زیادہ ان کی سیکرٹری کو ہوئی۔ کیونکہ اسے فوراً چھٹی مل گئی۔ اسلم خاں نے پاکستان کے متعلق طویل قصے چھیڑ دیئے۔ قصوں اور قہقہوں میں ہم شیرٹن ہوٹل پہنچ گئے۔ جہاں رنگین ماحول میں خان صاحب نے کھانے کی دعوت دی جو ہم نے حسب عادت فراخدلی سے قبول کر لی۔ درویش اول نے اپنی رنگین مزاجی کی تسکین کے لئے خاں صاحب سے بنکاک کے بارے مزید تفصیلات معلوم کرنا چاہیں۔ انھوں نے بنکاک کا کونہ کونہ حفظ کر رکھا تھا۔ ایسی ایسی باتیں سنائیں کہ درویشوں کی بھوک ختم اور پیاس بڑھ گئی۔ جس سیاحت کا مسٹر خان نے ذکر کیا وہ رات کو ۹ بجے کے بعد شروع ہوتی تھی۔ چنانچہ ہم ہوٹل میں جا کر آرام بھی کرنے لگے اور رات کا انتظار بھی۔

بنکاک کا شہر بڑا ہرجائی ہے۔ سورج نکلتا ہے تو ایسا لگتا ہے جیسے یہاں کبھی بارش ہوئی ہی نہ ہو اور اگر بادل آجائیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے برسوں سے سورج نہ دیکھا ہو۔ شاید یہی ہرجائی پن یہاں کی حسیناؤں میں ہو۔ شام کو ناگنوں کی طرح پھن پھیلائے گھٹائیں آسمان پر چھا گئیں اور موسلا دھار بارش ہونے لگی۔ بارش پڑتے ہی درویش اول کی امیدوں پر بھی اوس پڑ گئی۔ اس نے سوچا کہ پورا پروگرام

www.iqbalkalmati.blogspot.com

چپٹ ہو گیا۔ بارش میں لوگ گھروں سے ہی نہ نکلیں گے۔ ہم ہوٹل کی کھڑکی سے باہر دیکھتے رہے۔ گھٹائیں حاتم طائی بنی رہیں۔ سڑک پر گاڑیاں چیونٹیوں کی طرح رینگتی رہیں۔ گڑیاں رنگ برنگی چھتریاں لئے دوڑتی رہیں۔ آخر ہم نے بھی ہمت کی' ہوٹل سے نیچے آئے اور ٹیکسی میں سوار ہو گئے۔ گاڑیوں کے بمپر سے بمپر لگے ہوئے تھے۔ گاڑیاں کیا کشتیاں تھیں۔ جو پانی میں چلی جا رہی تھیں۔ وہاں گاڑیوں کے سائلنسر اس صورت سے لگائے جاتے ہیں تاکہ پانی میں نہ ڈوب سکیں۔ ایک ایک چوک کو پار کرنا عذاب بن گیا تھا۔ مگر ڈرائیوروں کے تحمل کی داد دینی پڑتی ہے کہ وہ بڑے صبر کے ساتھ انتظار کرتے ہیں۔ کوئی ڈرائیور اگر "ون وے" ٹریفک میں مین روڈ پر گاڑی موڑنا چاہے تو دونوں جانب سے ٹریفک رک جاتا ہے۔ اور اسے گاڑی موڑنے دیتے ہیں۔ نہ تو ہارن مینڈکوں کی طرح چلانے لگتے ہیں نہ گالیوں کی بوچھاڑ ہوتی ہے اور نہ ہی پولیس والا ڈرائیور کو ایک طرف لے جا کر چالان کی دھمکی سے اپنا غصہ ٹھنڈا اور جیب گرم کرتا ہے۔

پیٹ پانگ کی روشنیوں اور شعلہ رخوں کے قمقموں نے رات کا دامن چاک کیا۔ ہم بھی بنکاک کی اس حسین سڑک پر پہنچے جس کے نائٹ کلبوں نے بنکاک کو مشرق کا پیرس بنا دیا ہے۔ ڈیڑھ سو گز لمبی سڑک پر سینکڑوں چھوٹے بڑے نائٹ کلب ہیں جن کی روپ بدلتی روشنیوں سے کبھی چہرے سرخ اور جسم سیاہ اور کبھی جسم سرخ اور چہرے سیاہ ہونے لگے۔ بھیگی بھیگی فضا میں انگڑائیاں لیتی رات کو دیکھ کر درویش اول نے کہا۔ ساتھیو وعدہ کرو کہ اس جوان رات کا ساتھ دو گے۔ یہ رات پھر نہ آئے گی۔ بنکاک میں ہر رات جوان ہوتی ہے صرف رات کے ساتھی بدلتے رہتے ہیں۔ اور پھر ہم نائٹ کلبوں کے طلسم کدے میں کھو گئے۔ یہ چنگھاڑتی موسیقی' یہ تڑپتی جوانیاں' یہ انگور کی بیٹی' یہ آدم کے بیٹے' یہ اکھڑی اکھڑی سانسیں' یہ بہکی بہکی باتیں' یہ بکھری بکھری زلفیں' یہ نکھری نکھری بانہیں' یہ بڑھتے ہوئے ہاتھ' یہ سمٹتے ہوئے جسم' یہ لمبے لمبے امریکن سیاح' یہ چھوٹی چھوٹی تھائی لڑکیاں' یہ مشرق کی بیٹیاں' یہ مغرب

کے بیوپاری' یہ ڈالر' یہ جسم' یہ زر' یہ ضرورت۔ یہ ذکر ہے اس جوان رات کا جس کا ساتھ نبھانے کی ہم نے قسم کھائی تھی۔ ہم نے جس نائٹ کلب میں بھی جھانکا وہیں آدم کے بیٹوں کی رگوں میں انگور کی بیٹی اور بانہوں میں حوا کی بیٹی کو پایا۔ ایک طرف تو قدرت نے تھائی لڑکیوں کو بھرپور جسموں سے نوازا ہے جو قدرت کی اس فیاضی کو بڑی فراخدلی سے استعمال کرتی ہیں۔ دوسری طرف انکی اس فیاضی کے چرچے دور دور تک پھیلے ہوئے ہیں' جن کو پھیلانے میں انکی وزارت سیاحت کا بڑا ہاتھ ہے۔ چنانچہ دنیا بھر کے سیاح' زر کے حاتم طائی بن کر تھائی لینڈ آتے ہیں اور جنس کی ان حاتم طائیوں سے طویل ملاقاتیں پاتے ہیں۔ ان نائٹ کلبوں میں ہر شام نہ جانے کتنی کلیاں چٹک کر پھول بنتی ہیں اور نہ جانے کتنے پھول مرجھا جاتے ہیں۔ کلیوں پر بھونروں کو بھٹکتے تو ہم نے دیکھا ہے' مگر جتنا لالچی بھونرا درویش اول تھا اسکی مثال نہیں ملتی۔ اسکا بس چلتا تو اس پورے چمن کے پھولوں کا رس نکال کر ایک ہی سانس میں پی جاتا۔ کہتے ہیں خدا گنجے کو ناخن نہیں دیتا۔ شاید اسی لئے اس سفر میں درویش اول کو دولت تو محدود ملی تھی مگر جذبات کی فراوانی تھی۔ نائٹ کلبوں میں کھلنے والے یہ پھول تھائی لینڈ کے دور دراز علاقوں سے آتے ہیں۔ ہر نائٹ کلب میں کوئی دو سو کے قریب لڑکیاں ہوتی ہیں۔ شام کو جب مہمان آتے ہیں تو لڑکیاں رقص میں مشغول ہوتی ہیں۔ سیاح اپنی پسند کی لڑکی کے ساتھ رقص کرنے لگتے ہیں۔ اسی وقت سے وہ لڑکی اس مہمان کے لئے مخصوص ہو جاتی ہے۔ اور مہمان کے ساتھ ہی شراب پیتی ہے اور کھانا کھاتی ہے۔ جب مہمان رقص سے اکتا جاتا ہے تو یہ لڑکی اس کے ساتھ چلی جاتی ہے۔ مگر جانے سے پہلے مہمان کو کاؤنٹر پر ٹول ٹیکس ادا کرنا پڑتا ہے۔ بنکاک کے شعلہ رخوں سے دامن بچانا کس روسیاہ کو مقصود تھا' مگر مجھے تو پاس تھا ان وعدوں کا جن وعدوں کی آس لگائے دور دیس میں کوئی میرا انتظار کر رہا تھا۔ مگر دونوں درویشوں نے اس گلستاں کے گلچینوں کا پورا پورا ساتھ دیا۔

سورج کی پیلی روشنی میں مندروں کے کلوڈے اور سرخ چھتیں چمک رہی

تھیں۔ زعفرانی لبادوں والے بھکشو سیاہ کاسوں میں عقیدت مندوں سے خوراک کے نذرانے وصول کرکے مندروں کو لوٹ رہے تھے۔ ناریل کے سبز پتے ہوا میں جھومتے تو شبنم کے موتی بکھرنے لگتے۔ رات کی خوابیدہ سڑکوں پر ریل پیل شروع ہوگئی۔ مندروں میں گھنٹیوں کے جل ترنگ بجنے لگے۔ مگر ہمارے کمرے میں ابھی درویش دوم کے خوفناک خراٹوں کا شور تھا۔ دروازہ کھلا۔ ملتانی کڑھائی والے سفید کرتے شلوار' بہاول پوری سلما ستارے والے کھسے اور تھائی ہیٹ میں ملبوس درویش اول نمودار ہوا۔ میری سمجھ میں تو نہ آیا کہ آخر وہ لباس کی اقوام متحدہ کیوں بنا ہوا تھا۔ اس نے آتے ہی درویش دوم کو جھنجوڑا۔ درویش دوم نے ایک عدد انگڑائی اور دو عدد جمائیاں لے کر درویش اول سے کہا "ہیٹ پہن کر تم کیا پاسنگ شو کا اشتہار بنے ہوئے ہو۔" درویش اول نے اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ "تم زیادہ باتیں نہ بناؤ۔ جلدی سے تیار ہوجاؤ' ابھی ناگ اور مگرمچھ دیکھنے جانا ہے۔" ناگوں کی اس بستی میں ناگوں سے ملاقات کی منطق میری سمجھ میں نہ آئی۔ "مگرمچھ دیکھنے تھے تو منگھوپیر چلے جاتے' بنکاک آنے کی کیا ضرورت تھی۔" درویش دوم نے کروٹ بدلتے ہوئے کہا۔

ٹیکسی میں سوار ہوئے اور ڈرائیور سے ناگوں کے فارم چلنے کو کہا۔ بنکاک میں ہر ڈرائیور کو اپنا لائسنس گاڑی میں فریم کرا کر لگانا پڑتا ہے۔ چنانچہ اس ڈرائیور نے ایک طرف تو اپنا لائسنس لگایا ہوا تھا اور دوسری جانب اپنی ایک (فٹبال کھیلنے کی حالت میں) تصویر۔ ہماری بدقسمتی سے ان دنوں فٹبال کا ٹورنامنٹ ہورہا تھا۔ جس کی کمنٹری ریڈیو پر نشر ہو رہی تھی۔ چنانچہ یہ ڈرائیور صاحب گاڑی سڑک پر چلا رہے تھے اور دھیان فٹبال کے گراؤنڈ میں لگائے ہوئے تھے۔ کمنٹری سننے کے ساتھ ساتھ وہ نعرے بھی لگا رہا تھا اور ہاتھ پاؤں بھی فری سٹائل میں چلا رہا تھا۔ درویش اول' جو ڈرائیور کے قریب بیٹھا تھا' خوف سے زرد ہو رہا تھا اور اس کی خنداں پیشانی پر رومال کا دایئر متواتر چل رہا تھا۔ خدا خدا کرکے فارم آیا اور ہمیں اس خطرناک سفر سے نجات ملی۔

سنیک فارم میں ہزاروں قسم کے عجیب و غریب سانپ تھے۔ جنھیں مختلف سائنسی تجربوں کی غرض سے پالا جاتا ہے اور ناگوں سے زہر بھی نکالا جاتا ہے۔ اس لیبارٹری کے ایک طالب علم نے ہمیں بتایا کہ سانپ کے دانت میں زہر نہیں ہوتا بلکہ حلق کے اندر زہر کی تھیلی لگی ہوتی ہے اور جب سانپ دانتوں سے زخمی کرتا ہے تو تھیلی سے زہر زخموں میں پہنچ کر خون میں شامل ہوجاتا ہے۔ ناگوں کے اس زہر کو دواؤں میں شامل کرکے مختلف بیماریوں کا علاج کیا جاتا ہے۔ کیا بنکاک کی حسین ناگنوں کے ڈسے کا علاج بھی کیا جاسکتا ہے؟ یہ ایک ایسا سوال تھا جس کا جواب حاصل کرنے کے لئے زخم کھانا ضروری تھا۔

پاک نام مگرمچھ فارم جانے لگے تو درویش اول گاڑی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا اور مجھ کو آگے ڈرائیور کے ساتھ بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں نے فوراً اس کے حکم کی تعمیل کی۔ اب فٹبال کا میچ ختم ہوچکا تھا اور ڈرائیور بھی بیٹھا شرافت سے گاڑی چلا رہا تھا۔ چنانچہ اس بیس میل کے سفر میں درویش اول گرمی میں جھلستا رہا اور میں مزے سے سینہ تان کر پنکھے کے سامنے بیٹھا رہا۔ پاکنام فارم میں بہت بڑی مصنوعی جھیل ہے۔ جس میں تقریباً دس ہزار مگرمچھ پالے گئے ہیں۔ جھیل کو اس طرح کئی حصوں میں تقسیم کردیا گیا ہے تاکہ نوجوان مگرمچھوں کو بوڑھے اور خرانٹ مگرمچھوں سے علیحدہ رکھا جائے۔ یہیں ایک حصے میں کوئی چھ سو کے قریب دس سال کی عمر کے مگرمچھ چھوڑے گئے ہیں۔ یہ علاقہ مگرمچھ کی افزائش نسل کے لئے مخصوص کیا گیا ہے۔ یہاں ہر مادہ کے مقابلے میں دو نر رکھے جاتے ہیں۔ جھیل کے ارد گرد گھنی جھاڑیوں میں مادہ کئی درجن انڈے دیتی ہے اور دو مہینے تک ان انڈوں کی حفاظت کرتی ہے۔ جب بچے نکل آتے ہیں تو کچھ عرصے انہیں ایک اور جگہ منتقل کردیا جاتا ہے۔ مگرمچھ کے بچے جن تالابوں میں بند تھے ان کے اوپر مچھردانی کی طرح جالیاں لگی تھیں۔ جو مگرمچھ کو مچھروں سے بچانے کے لئے لگائی گئی تھیں' کیونکہ مچھر کے کاٹنے سے بچہ اندھا بھی ہو سکتا ہے اور لنگڑا بھی۔ مگرمچھ گو اتنا بڑا جانور ہے مگر دھماکے سے اس کا دل پھٹ

www.iqbalkalmati.blogspot.com

جاتا ہے۔ جب مگرمچھ کھال اتارنے کے قابل ہوجاتے ہیں تو انہیں قصاب خانے میں کاٹا جاتا ہے اور ماہر قصاب ان کی کھال اتارتے ہیں۔ دس برس کی عمر والے مگرمچھ کی کھال سے پانچ دستی بیگ تیار کئے جاسکتے ہیں۔ اس کا گوشت ہوٹلوں میں فروخت کیا جاتا ہے۔۔۔۔۔ مگرمچھ کا گوشت کھانے سے دمہ کی بیماری ختم ہوجاتی ہے۔ یہ بات سننے کے بعد ہمیں اتنا وہم ہوا کہ بنکاک میں جب بھی کھانا کھاتے یہی فکر رہتی کہ کہیں مگرمچھ کا گوشت تو نہیں۔ اس فارم سے سالانہ چار ہزار کے قریب کھالیں حاصل کی جاتی ہیں۔ فارم کے اندر ہی ایک سٹور ہے' جہاں سے مگرمچھ کی کھال کے دستی بیگ' جوتے اور بٹوے وغیرہ سستے داموں مل جاتے ہیں۔

بنکاک میں سڑکوں پر بھکاری نظر نہیں آتے۔ یہ بات ہمارے لئے باعث فکر تھی' کیونکہ بھکاریوں کے بغیر تو ہمارے ہاں کی سڑکیں سونی سونی دکھائی دیتی ہیں۔ لوگ وہاں بھی غریب ہیں مگر پیسہ حاصل کرنے کے لیے وہ محنت کرتے ہیں۔ بھیک نہیں مانگتے۔ ہوٹل پہنچ کر درویش اول نے بنکاک کا نقشہ سامنے پھیلایا۔ ہماری کابینہ نے اپنے ہنگامی اجلاس میں دوسری صبح مندروں کی سیر کا پانچ گھنٹے کا منصوبہ تیار کیا اور ہم دوسری صبح کا انتظار کرتے کرتے رات کے پہلو میں سو گئے۔

تھائی لینڈ میں بدھ مت ایک طریقہ زندگی ہے اور مذہبی رنگ زندگی کے ہر شعبے میں دکھائی دیتا ہے۔ شہنشاہ اشوک کے زمانے میں دو مشن ہندوستان سے تھائی لینڈ پہنچے جنہوں نے بدھ مت کا پرچار کیا اور اسی زمانے سے تھائی لینڈ کی کثیر تعداد اس مذہب میں شامل ہو گئی۔ صبح سویرے بدھ بھکشو زعفرانی لبادوں میں لپٹے ہاتھوں میں سیاہ کاسے لیے گلی گلی گھومتے ہیں۔ گو پرہتوں کو دنیاوی چیزوں سے دلچسپی نہیں ہوتی مگر وہ عقیدت مندوں کی تسکین کے لیے گھومتے ہیں۔ اس طرح لوگ انہیں خوراک دے کر ثواب حاصل کرتے ہیں۔ یہ صدیوں پرانی رسم ہے جو بدستور چلی آرہی ہے۔ اگرچہ بنکاک میں اکثر بارش ہوتی رہتی ہے مگر اس کے باوجود ہم نے دیکھا کہ پروہت بلا ناغہ ہر گلی کوچے میں جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ ہم نے انھیں چھوٹی چھوٹی کشتیوں

میں سوار ہو کر ان جگہوں پر جاتے دیکھا ہے جہاں لوگ کشتیوں کے گھروں میں رہتے ہیں۔ پروہت صبح کے ناشتے کے بعد صرف رات کو کھانا کھاتے ہیں۔ پورے تھائی لینڈ میں کوئی اٹھارہ ہزار مندر ہیں اور ایک لاکھ پچاس ہزار کے قریب پروہت ہیں۔ اکیس سال کی عمر ہونے سے پہلے ہر مرد کچھ عرصہ کے لئے ضرور پروہت بنتا ہے۔ اس مذہبی رسم سے بادشاہ بھی بالا تر نہیں۔ راما چہارم ۲۷ سال تک بدھ بھکشو بنا رہا۔ اس زمانے میں اس نے انگریزی زبان بھی سیکھی اور مغربی طرز زندگی سے بھی آشنائی حاصل کی۔ مشہور فلم "کنگ اینڈ آئی" اسی دور کی کہانی ہے۔ اگرچہ تھائی لینڈ کی اپنی فلموں کی کہانیاں امریکن فلموں سے بالکل مختلف ہوتی ہیں' مگر ان کی کہانیوں اور ہماری فلمی کہانیوں میں رتی بھر فرق نہیں ہوتا۔ صرف فرق ہوتا ہے تو لباس کا اور زبان کا۔ مگر آجکل تو ہمارے فلمسازوں نے وہ فرق بھی قریباً ختم کر دیا ہے۔ کیونکہ زیادہ تر فلمیں بنکاک کے فنکاروں کے ساتھ تھائی لینڈ کے مناظر میں فلمائی جاتی ہیں۔ ویسے انکی اپنی فلموں میں وہی ایک بابرہ شریف کو غریب ندیم سے محبت۔ پھر ظالم سماج راستے کی دیوار۔ ان گنت مشکلات کے بعد دونوں کا ملاپ۔اور بس اللہ اللہ خیر سلا۔ ہاں تو یہاں ذکر مذہبی رسومات کا ہو رہا تھا۔ موجودہ بادشاہ ۱۹۶۴ میں تین ہفتے کے لئے پروہت بنا رہا۔ اس نے بھی دوسرے پروہتوں کی طرح اپنا سر منڈوایا اور دوسرے کام سرانجام دیئے۔ کچھ عورتیں بھی مہاتما بدھ کے نام پر زندگی وقف کر دیتی ہیں۔ ان کی پہچان ان کے سفید لبادوں سے کی جاسکتی ہے۔

بنکاک کے تاریخی مقامات میں سب سے اہم بدھ منادر ہیں۔ درویش اول نے رات کو ان مقامات کے بارے میں تفصیلی مطالعہ کیا اور صبح ہم ان کی سیر کو نکلے۔ بنکاک میں پانچ سو کے قریب مندر ہیں۔ ان سب کو دیکھنا تو ناممکن ہے مگر ان میں چند ایسے ہیں جنہیں دیکھے بغیر مندروں کی سیر ادھوری رہ جاتی ہے۔ سب سے پہلے ہم شاہی محل کے اس مندر میں گئے جس میں گوتم بدھ کا اڑھائی فٹ اونچا ہرے رنگ کے قیمتی پتھر کا مجسمہ ہے۔ یہ بت ۱۷۷۹ میں لاؤس میں جنگی کامیابی کے بعد ملا۔ اہل

www.iqbalkalmati.blogspot.com

تھائی لینڈ کا عقیدہ ہے کہ جب تک یہ بت سلامت ہے ملک آزاد و آباد رہے گا۔ مندروں کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ سرخ اور سنہرے رنگ کا کام اس خوش اسلوبی سے کیا گیا ہے۔کہ کاریگروں کی مذہبی عقیدت ایک ایک نقش سے ظاہر ہوتی ہے۔ اس مندر میں ہم نے بھی اگربتیاں جلائیں اور باہر رکھے ٹین کے بکس میں نذرانے کے پیسے ڈالے۔ کچھ اور عقیدت مند مجسمے کے سامنے سجدے بھی کر رہے تھے اور دعائیں بھی مانگ رہے تھے۔ مندروں کے سامنے ثواب کے لئے لوگ قیدی پرندوں کو خرید کر آزاد بھی کرتے ہیں۔ ایک رسم نرالی تھی۔ وہ یہ کہ لوگ بتوں پر سونے کے ورق لگاتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ تمام بت سنہرے ہوتے ہیں۔ واٹ پو مندر میں ۱۴۰ فٹ لمبا اور ۴۰ فٹ اونچا بت سونے کے ورقوں میں اس طرح چھپا ہوا ہے کہ دیکھنے والا اسے سونے کا مجسمہ ہی سمجھتا ہے۔ مگر ایک مجسمہ اندرلا ویران مندر میں ایسا بھی ہے جس میں سونے کے ورق نہیں بلکہ وہ اصلی سونے کا ہے اور اس کا وزن ساڑھے پانچ ٹن ہے۔ شاہی محل کے جس احاطے میں اس ایمرلڈ بدھ کا مندر ہے وہیں شاہی ہتھیاروں اور سکوں کا عجائب گھر بھی ہے۔ موجودہ بادشاہ نے اپنی رہائش کے لئے شاہی محل کی بجائے چترالا محل کو ترجیح دی اور اس طرح یہ محل اب صرف سرکاری تقریبات کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ دنیا کے ہر شاہی محل کی طرح یہاں بھی شاہی حرم موجود ہے' جہاں بادشاہوں کی ملکائیں شہزادیاں اور کنیزیں رہا کرتی تھیں۔ حرم کے گیٹ کے اس پار بادشاہ کے علاوہ کوئی مرد نہیں جاسکتا تھا۔ ہاں "نیوٹرل" مخلوق کو اندر جانے کی اجازت تھی - درویش اول نے گیٹ کے اندر جھانکنے کی کوشش کی تو درویش دوم نے اسے کہا۔ "تم تو اندر جاسکتے ہو ..... تم لوگوں پر تو کوئی پابندی نہیں' صرف مردوں کو جانے کی اجازت نہیں" درویش اول نے اس فقرے کو سرے سے نظرانداز کیا اور متواتر اندر جھانکنے کی تگ و دو کرتا رہا۔ حالانکہ اندر ماضی رفتہ کی یادوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ واٹ پو (برگد والا مندر) گئے تو وہاں ایک نوجوان بھکشو سے ملاقات ہو گئی۔ جو بنکاک یونیورسٹی میں اکنامکس کا طالب علم تھا اور اپنی مذہبی رسم کو پورا کرنے کے لیے چھ مہینے

کے لیے بھکشو بنا ہوا تھا۔ اپنے بھکشو پن کے دوران اکثر نوجوان اپنی آئندہ زندگی کے راستے کا تعین کرتے ہیں۔ یہ اصلاح نفس کا بہترین طریقہ ہے۔

تھائی لینڈ میں لازمی مذہبی سروس کے علاوہ لازمی فوجی سروس بھی ہے۔ جو ہر نوجوان کو دو سال کے لیے کرنی پڑتی ہے۔

فوجی ملازمت نچلے طبقے کے نوجوانوں کے لیے اونچے حلقوں میں داخلے کا شارٹ کٹ ہے اور وہ وردی پہنتے ہی شودر سے برہمن بن جاتے ہیں۔ اگرچہ ہندو کاسٹ سسٹم کے مطابق تو برہمن کے رتبے کو کوئی نہیں چھو سکتا مگر تیسری دنیا کے انقلابی فوجیوں نے ذہانت کا ثبوت دیتے ہوئے مذہب کو اپنے ساتھ ملا لیا ہے۔ چنانچہ مذہب اور "مسل" (مضبوطی) کے اس جوڑ توڑ نے آزادی کی کمر توڑ دی ہے۔

وہ نوجوان بھکشو ہمارے ہمراہ ہو گیا۔ اس نے اپنی انگریزی کی اصلاح کرنے کی سوچی اور ہم لوگوں کو صفت میں گائیڈ مل گیا۔ اس نے درویش اول کی خوش بخت پیشانی کو دیکھتے ہوئے حیران ہو کر پوچھا۔ "آپ کس مذہب کے بھکشو ہیں۔" اس کے نزدیک ہر سر منڈا بدھ بھکشو ہوتا ہے۔ مگر اس نیم سر منڈے کو دیکھ کر وہ اس کے مذہب کا اندازہ نہ لگا سکا۔ درویش اول نے اس وقت تو کھسیانی ہنسی ہنس کر بات ٹال دی مگر بعد میں اس نے تھائی ہیٹ کو اپنے لباس کا مستقل حصہ بنالیا۔ یہاں تک کہ ہوٹل میں ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں جاتے وقت بھی ہیٹ سر سے نہ اتارتا۔ کوئی بعید نہیں کہ وہ غسل بھی ہیٹ سمیت ہی کر ڈالتا ہو۔

اس نوجوان پروہت نے پہلے چھوٹے چھوٹے پگوڈے دکھائے۔ یہ پگوڈے امیر خاندان کے تھے اور ان میں ان کے مردوں کی خاک دفن تھی۔ جوں ہی کسی خاندان کا فرد فوت ہوتا ہے اور اس کی راکھ دفن کی جاتی ہے تو اس پگوڈے کو نئے سرے سے رنگ کر دیا جاتا ہے۔ چنانچہ پگوڈوں پر تازہ رنگ اس بات کی نشانی ہوتا ہے کہ اس خاندان میں کوئی موت ہوئی ہے۔ اسی طرح چار بڑے بڑے پگوڈے تھے جو تھائی لینڈ کے چار بادشاہوں نے اپنے اپنے وقتوں میں تعمیر کروائے تھے۔ اس مندر

www.iqbalkalmati.blogspot.com

میں سب سے دلچسپ جگہ وہ تھی جہاں ایک دیوار پر انسانی جسم کی تصویریں بنی ہوئی تھیں۔ پروہت نے بتایا کہ یہ تصویریں طالب علموں کو انسانی جسم کی تعلیم دینے کے لئے بنائی گئی تھیں۔ اس زمانے میں تعلیم صرف مندروں میں دی جاتی تھی۔ گو اب بھی ہم نے سینکڑوں لڑکیوں اور لڑکوں کو ان تصویروں کے سامنے کھڑا پایا جو اپنی کاپیوں پر ان کی نقلیں اتار رہے تھے۔ پروہت نے مزید بتایا کہ ان تصویروں کے ذریعے لڑکیوں کو جسمانی مالش کی تربیت دی جاتی تھی۔ بدھ مذہب کی رو سے عورت مرد کو سکون پہنچانے کے لئے پیدا کی گئی ہے۔ اس آرام میں جسمانی آرام بھی شامل ہے۔ چنانچہ عورتوں کو باقاعدہ مالش کی تعلیم دی جاتی تھی تاکہ وہ اپنے خاوندوں کی خدمت کر سکیں۔ آج بھی وہ تعلیم دی جاتی ہے مگر سب عورتوں کو نہیں۔ آج جو عورتیں یہ ہنر سیکھتی ہیں وہ اپنے مجازی خداؤں کے لئے نہیں بلکہ ان سیاحوں کے لئے جن کی جیب میں ڈالر ہوتے ہیں۔

صبر و تحمل' بردباری اور مستقل مزاجی گوتم بدھ کی تعلیم کا ایسا کرشمہ ہے جو ہر تھائی میں موجود ہے۔ ہم نے اپنے قیام کے دوران کبھی کسی کو لڑتے نہیں دیکھا۔ ہر شخص کے چہرے پر مسکراہٹ ہوتی ہے۔ ہمارے ہاں تو ہر چوک پر زور آزمائی ہوتی ہے۔ مگر وہاں غصہ کرنے والے کو بہت بدتمیز سمجھا جاتا ہے۔ وہاں ایک دوست نے بتایا کہ اگر کوئی نوکر پر غصہ ہو تو نوکر جھگڑا کرنے کے بجائے کام چھوڑ کر چلا جاتا ہے اور اپنی تنخواہ بھی نہیں لیتا۔ اسی قسم کا ایک واقعہ ہمارے ساتھ بھی ہوا۔ جس دن ہم نے مندروں کی سیر کی ایک ٹیکسی والے کے ساتھ مقررہ وقت سے کچھ زیادہ دیر ہو گئی۔ اسے طے شدہ پیسے دینے چاہے تو اس نے قبول نہ کئے مگر' جھگڑا کرنے کی بجائے وہ چپ سادھ کر ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ اس کی خاموشی سے تنگ آکر درویش دوم نے اپنے اصولوں کو توڑ کر ٹیکسی والے کو فالتو پیسے دے دیئے۔

تھائی لینڈ میں چند مذہبی رسمیں ایسی ہیں جو بہت دلچسپ ہیں اور لوگ ان رسومات میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔ اگر کوئی شخص نیا گھر بنائے تو اس کے لئے

ضروری ہے کہ وہ روحوں سے اپنے گھر کو پاک کرنے کے لیے گھر کے کسی کونے میں روحوں کے لیے بھی چھوٹا سا گھر تعمیر کرے۔ روحوں کے لیے فٹ یا دو فٹ کے بنے بنائے گھروندے مل جاتے ہیں جو کئی لوگ بیچنے کی خاطر فٹ پاتھوں پر لیے پھرتے ہیں۔ صرف یہ گھروندے بنانا ہی کافی نہیں بلکہ ان میں روحوں کے لئے خوراک رکھی جاتی ہے' پھول چڑھائے جاتے ہیں اور اگربتیاں جلائی جاتی ہیں۔ تھائی لوگوں کی زندگی میں نیک روحوں اور بدروحوں' دونوں کا بڑا دخل ہے۔ وہ تعویذ گنڈوں پر پورا یقین اور بھروسہ رکھتے ہیں۔ گوتم بدھ کی شبیہیں اور دس آنکھ والی دیوی کے چھوٹے چھوٹے مجسمے گلے میں لٹکانے سے ہر بلا دور ہو جاتی ہے۔ گاڑیوں کے حادثے نہیں ہوتے۔ دشمن کو کامیابی نہیں ہوتی۔ محبوب کو رام کرنا ہو تو منتیں مانی جاتی ہیں۔ کسی چڑیل نما سے پیچھا چھڑانا ہو تو منتیں مانی جاتی ہیں۔ منتیں پوری ہوں تو چڑھاوے چڑھائے جاتے ہیں۔ نہ پوری ہوں تو مزید منتیں مانی جاتی ہیں۔ اپنا کاروبار جاری رکھنے کے لئے یہ تعویذ دینے والے بھی بڑی استادیاں دکھاتے ہیں۔ تعویذوں کے ساتھ ایسی ایسی کڑی شرطیں رکھتے ہیں کہ جن کو پورا کرنا تقریباً ناممکن ہوتا ہے۔ اگر خوش قسمتی سے تکا لگ گیا تو ان کی کرامات کو کریڈٹ پہنچتا ہے اور اگر نامرادی ہو تو الزام کوئی نہ کوئی شرط ٹوٹنے پہ دھر دیا جاتا ہے۔ مثلاً ہمارے گاؤں کے ایک نوجوان عطّو ڈھڈی کو ایک الھڑ بھٹیاری سے پیار ہو گیا۔ برسات میں محبت اور ملیریا گاؤں میں شدت اختیار کر جاتے ہیں اور اکثر نوجوان ان کا شکار ہوتے ہیں۔ عطّو ڈھڈی نے مولوی شہاب الدین کا اکلوتا پاؤں پکڑ لیا۔ اکلوتا اس لئے کہ مولانا کا ایک پاؤں لاغر ہو گیا تھا اور وہ کٹھوڑی سے چلتے تھے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ ان کا پاؤں کسی عشقیہ واردات کا شکار ہو گیا تھا۔ شاید اسی لئے محبت کے مارے نوجوان ان کے عشقیہ تعویذوں پر پورا یقین رکھتے تھے۔ چالیس دن کا چلہ کٹوانے کے بعد مولانا نے عطّو ڈھڈی کو تعویذ تو دیدیئے مگر کامیابی کے لئے دو شرطیں لگا دیں۔ پہلی یہ کہ ایک تعویذ کو پانی میں گھول کر بھٹیارن کو نہار منہ پلانا تھا۔ اور دوسرے تعویذ کو سیاہ طمل میں باندھ کر محبوب کے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

دائیں زانو میں باندھنا تھا۔ کوئی چھ مہینے کی تگ و دو کے بعد پہلی شرط تو پوری ہوگئی مگر دوسری شرط کون پوری کرتا' اور جو کوئی وہ شرط پوری کرنے کے قابل ہو جاتا تو پھر اس کو تعویذ باندھنے کی کیا ضرورت تھی۔ کچھ اسی طرح کے حالات بنکاک میں دکھائی دئے۔ درویش دوم نے ایک مندر میں درویش اول کو بڑی سنجیدگی سے مشورہ دیا کہ بدھ مجسمے کے سرہانے جلتی موم بتی کا گرم موم اگر اپنے سر پر لگا لے تو یقیناً تیرا سر زرخیز ہو جائے گا۔ مگر درویش اول نے اس کی بات کا یقین نہیں کیا اور اب تک اس کا سر بنجر ہے۔

جس طرح تاج محل انسانی عظمت کا عجوبہ ہے اسی طرح دریائے کوائی کا خونی پل Bridge on the river Kwai بھی انسانی بربریت کا ایسا شاہکار ہے جس کی مثال ہیروشیما اور ناگا ساکی کے علاوہ شاید ہی کہیں ملتی ہو۔ چنانچہ ایک صبح اس پل کو دیکھنے کے لئے ہم نے ریلوے سٹیشن کی راہ اختیار کی۔ اتوار اور دوسری تعطیلات کے دنوں ٹرین صبح آٹھ بجے کے قریب روانہ ہوتی ہے اور تین گھنٹے میں ایک سو تیس میل کا سفر طے کر کے کانچ بوری کے سٹیشن پر پہنچتی ہے۔ یہ پل اس شہر کے قریب بنایا گیا ہے۔ ٹرین کا ذکر آیا تو آپ کے ذہن میں عوامی ایکسپریس کا خاکہ آیا ہوگا' جس میں سیٹ حاصل کرنے کے لئے سرخ پوش مخلوق کو دس روپے کا نذرانہ پیش کرنا پڑتا ہے۔

بنکاک کی ٹرین میں اس قسم کا ڈرامائی منظر دیکھنے میں نہیں آیا بلکہ صاف و شفاف ڈبوں میں لوگ آرام دہ سیٹوں پر بیٹھے تھے۔ اس ڈبے میں ہمارے علاوہ گورے اور جاپانی سیاح تھے جو اپنے بزرگوں کے بنائے ہوئے پل کو دیکھنے جا رہے تھے۔ ان میں ہر ایک پوری طرح کیمروں سے لیس تھا۔ جونہی کسی سٹیشن پر ٹرین رکتی پلیٹ فارم پر ہاکروں کا حملہ ہو جاتا اور ہمارے جاپانی ساتھی کیمروں سے جواباً بھرپور حملہ کر دیتے۔ ادھر لڑکیاں مسکرا مسکرا کر پھول بیچتی پھرتیں اور ادھر جاپانی دوست مسکرا مسکرا کر تصویریں اتارتے جاتے۔ ٹرین کا یہ سفر بڑا خوشگوار تھا۔ کیونکہ ہم لوگ تھائی لینڈ کے

ہرے بھرے میدانوں اور گھنے جنگلوں سے گزر رہے تھے۔

دوسری جنگ عظیم میں جاپانیوں نے اس علاقہ پر قبضہ جما لیا تھا اور اتحادیوں نے یہاں ہتھیار ڈال دیئے تھے۔ جاپانیوں نے برما کے محاذ پر جانے کے لئے ریلوے لائن بچھانے کا منصوبہ بنایا۔ موت کی ان کڑیوں کو جوڑنے کے لیے اس خونی پل کی ضرورت تھی۔ چنانچہ اس کام کیلئے اتحادی جنگی قیدیوں کو اس مقام پر لایا گیا — اس پل کی تعمیر کے دوران تقریباً نو ہزار اتحادی فوجی جاپانیوں کی بربریت کا نشانہ بنے۔ دوپہر کو ہم اس پل کے قریب پہنچے۔ جاپانیوں کے علاوہ اور بھی بہت سے ملکوں کے سیاح موجود تھے۔ چند لمحوں کے لیے تو میں اپنے آپ کو ان جاپانی سیاحوں کا قیدی تصور کرنے لگا اور ان کے کیمرے سٹین گنز کا روپ دھار گئے۔ دریائے کوائی' لہروں میں ظلم ستم کی یاد چھپائے خاموشی سے بہہ رہا تھا۔ اس کے کناروں پر پھیلے ہوئے گھنے جنگلات کے قد آور درختوں کے سائے میں بھوکے' کمزور' بیمار اور تھکے ماندہ قیدی ستانے کیلئے بیٹھے ہوں گے۔ پل کے قریب ہی قبرستان ہے جس کی ہر قبر انسانیت کے لیے ایک سوالیہ نشان تھی۔ جہاں ظالم بھی انسان اور مظلوم بھی انسان تھے۔ جہاں جابر بھی انسان اور مجبور بھی انسان تھے اور جہاں انسانیت بال کھولے نوحہ خواں تھی۔

شام کو بنکاک پہنچے تو کافی تھک چکے تھے۔ دراصل تھکاوٹ تو ایک بہانہ تھی۔ اصل وجہ تو کچھ اور ہی تھی۔ بنکاک میں تھکاوٹ دور کرنے کا تو بہت آسان طریقہ ہے غسل کے لیئے حمام جایئے جہاں مالش بھی کی جاتی ہے اور غسل بھی دیا جاتا ہے۔ یہ دونوں کام کرنے کے لیے خوبصورت تھائی لڑکیاں مامور ہیں۔ چنانچہ ہم لوگ تھکاوٹ دور کرنے کے لیے فوراً سوانا باتھ Swana Bath کے لئے چلے گئے۔

سوانا باتھ کی ابتدا قدیم روم یا یونان یا ترکیہ یا جاپان سے ہوئی اس سے ہمیں بحث نہیں' مگر اتنا ضرور بنکاک میں ہو گئی ہے۔ جس سے ملے اسی نے سوانا باتھ کا ذکر کیا۔ رہا درویش اول تو وہ اتنا پسند قسم کا سیاح تھا۔ وہ ہر تجربہ ذاتی طور پر کرنے کی آرزو لے کر گھر سے نکلا تھا اور سچی بات تو یہ ہے کہ مجھے اس غسل کے بارے میں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

سب باتیں جھوٹی لگتی تھیں۔ کیونکہ میں استنبول میں ایک بار دھوکہ کھا چکا ہوں۔ طالب علمی کے زمانے میں بھی مجھے سیاحت کے دورے پڑتے تھے۔ استنبول میں ٹرکش باتھ کا بڑا تذکرہ سنا تھا۔ چنانچہ میں بھی راجہ اندر بننے کی آرزو لے کر حمام میں داخل ہوا۔ میں نے قدم اندر رکھا ہی تھا کہ ایک ہاتھ میری جانب بڑھا۔ صنف نازک کا نہیں بلکہ ایک مرد ترک کا مضبوط اور خوفناک ہاتھ۔ اس نے مجھے کیلے کی طرح چھیل دیا۔ گردن سے دبوچ کر بڑے سے ٹب میں غوطہ دیا۔ پھر ہاتھوں میں ربڑ کے دستانے پہنے مجھے گرم سنگ مرمر کے فرش پر لٹایا اور زور زور سے مالش کرنے لگا۔ یہ مالش واقعی مالش تھی۔ میں اس اچانک حملے سے ذرا سنبھلا تو ادھر ادھر نظر دوڑائی کہ شاید کہیں کوئی خاتون نظر آئے' جو اس سزا کے بعد دکھتے جسم کو سکون پہنچا سکے۔ مگر ادھر ادھر تو لاشیں تھیں' صحت مند لاشیں' جو گرم فرش پر لیٹی پیٹ کی چربی پگھلانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ ٹرکش باتھ کے بعد چار دن بدن دکھتا رہا تھا۔ چنانچہ سوانا باتھ سے خوف میرے لئے فطری تھا۔ مگر پبلک کے پرزور اصرار پر میں اس کے لیے راضی ہو گیا۔

وہاں پہنچے تو ایک بڑے شوکیس کے ہو رہے۔ اچھی صورت تو ایک بھی نظر آجائے تو خون کی گردش تیز ہو جاتی ہے اس شوکیس میں تو دو سو جوانیاں سجی ہوئی تھیں۔ ہمارے ہاں تو خواتین کا اتنا بڑا اجتماع کہیں بھی نہیں ہوتا۔ دل سرکش گھوڑا بن گیا۔ میں تو سمجھا کہ یہ میری سٹینلیس سٹیل کی چھاتی کو توڑ کر باہر نکل جائے گا' مگر ایسا نہ ہوا۔ درویش دوم گرگٹ کی طرح رنگ بدل رہا تھا۔ درویش اول نے مجھے دھکیل کر کاؤنٹر کے قریب کر دیا۔ مینجر نے جھک کر نیم فرشی سلام کیا اور کاروباری بات شروع ہوئی۔ شیشے کے اس کمرے میں ان گنت ماہرین مالش بیٹھی تھیں۔ گاہک تو لڑکیوں کو دیکھ سکتے تھے۔ مگر لڑکیاں قصابوں کو نہیں دیکھ پاتیں۔ ہر لڑکی کے کوٹ کے ساتھ ایک نمبر لگا ہوتا ہے۔ مینجر گاہک کی پسند کے نمبر کو باہر بلوا لیتا ہے۔ اس غسل کے لئے تقریباً بیس ڈالر ادا کرنے پڑتے ہیں۔ ان حسینوں کو دیکھ کر دل نے چاہا کہ کیا

ہی اچھا ہو آخری غسل بھی مُلّا کی بجائے ان ہی کے جھرمٹ میں ہو۔ یہ بلڈنگ ہوٹل کے مانند تھی۔ ہمیں غسل کے لیے تیسری منزل پر جانا تھا۔ تینوں درویشوں کو ایک ساتھ کمرے مل گئے۔ میں نے دل کڑا کیا اور کمرے میں داخل ہو گیا۔ پورے کمرے میں قالین بچھا تھا۔ ایک طرف تخت رکھا تھا۔ ایک کرسی کے سامنے ٹب تھا۔ ایک ٹیلیویژن اور ایک ٹیلیفون کا اہتمام بھی کیا گیا تھا۔ اس غسل کی کئی منزلیں ہیں اور ہر منزل کی اپنی پیچیدگیاں ہیں۔ مگر سب پیچیدگیوں کے باوجود اس غسل کے بعد تھکاوٹ دور ہو جاتی ہے اور انسان پھر سے تازہ دم ہو جاتا ہے۔

غسل سے فارغ ہوئے تو درویش اول نے پیدل سیر کی ٹھانی۔ چنانچہ ہم انسانی جسموں کے ٹھاٹھیں مارتے سمندر میں کود گئے۔ شانوں سے شانے ٹکرانے لگے۔ یہ پہلا موقع تھا جب درویش اول اپنے ہنگر نما کندھوں کا شدت سے استعمال کر رہا تھا۔ ادھر درویش دوم موم سی گڑیوں کے جھرمٹ میں بھینسے کی طرح گھس جاتا اور سب کو تتر بتر کرتا آگے نکل جاتا۔ دونوں درویش ٹکریں مارنے میں اتنے گم ہو گئے تھے کہ انہیں کسی چیز کا ہوش ہی نہ تھا۔ مگر میں بھوک سے بے ہوش ہو رہا تھا۔ میری سب سے بڑی کمزوری بھوک ہے۔ میں نے دونوں درویشوں سے التجا کی کہ کچھ خوراک کے بارے میں بھی غور کرو۔ وہ تو بھوکی آنکھوں کو خوراک پہنچا رہے تھے میری بھوک کا کس کو احساس ہوتا۔ میں نے بھی اپنے بنیادی مطالبے کو منوانے کے لئے دھمکی دی۔ بھوک ہڑتال کرنے کی تو ضرورت نہ تھی کیونکہ میں پہلے ہی بھوکا تھا۔ اس دور میں شرافت سے زیادہ دھمکی کام آتی ہے۔ اس لئے وہ فوراً رضامند ہو گئے اور مجھے کھانا کھلانے کے لئے ایک بڑے ہی پھیچر قسم کے ریستوان کا انتخاب کیا۔ پورے بنکاک میں شاید یہی ریستوراں تھا جس میں انگریزی زبان کا قحط تھا۔ ورنہ تو ہر جگہ لوگ انگریزی سمجھتے ہیں۔ میرے دونوں ساتھیوں نے ایک میز پر قبضہ جمایا اور میں کاؤنٹر پر بیٹھی بڑی بی کو کھانے کا آرڈر دینے گیا۔ بڑی بی چینی کے بڑے سے پیالے میں چاول ڈالے مزے سے کھا رہی تھی۔ بات کرنے پر پتہ چلا کہ وہ انگریزی سے پیدل ہیں اور

میں تھائی زبان سے۔ کھانے کا آرڈر دیتے تو کیسے؟ دوسری میزوں پر بیٹھے کھانے سے گتھم گتھا ہوتے لوگوں کی پلیٹوں پر ایک نظر دوڑائی۔ کچھ سمجھ نہ آئی۔ پھر اللہ کا نام لے کر بنا سمجھے ہی کاؤنٹر پر سجی چیزوں کی طرف اشارہ کر کے آرڈر دیدیا۔ جب کھانا آیا تو ہم ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ چاول اور جھینگے کے علاوہ ہر خوراک معمہ تھی۔ پھر درویش اول نے مزید وہم ڈال دیا کہ ہوسکتا ہے اس خوراک میں مگرمچھ کا گوشت شامل ہو۔ چنانچہ چاول اور جھینگے کے علاوہ ہر پلیٹ کو ایک طرف ہٹایا اور ان کی طرف رغبت کی۔ جھینگے دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا جیسے یہ پکے نہ ہوں بلکہ پلیٹ میں آرام کر رہے ہوں اور ادھر ہم کھانے کے لیے ہاتھ بڑھائیں گے ادھر وہ پلیٹ سے بھاگ کھڑے ہونگے۔ چنانچہ مابدولت نے چاول کھانے کی کوشش کی۔ پہلے نوالے کو گلے میں دھکیلنے کے لیے پانی کا گھونٹ پیا تو معلوم ہوا جیسے ٹنکچر کا گھونٹ بھر لیا ہو۔ ان لوگوں نے جراثیم مارنے والی دوا کچھ زیادہ ہی مقدار میں ڈال رکھی تھی۔ اس بدمزہ خوراک سے جان چھڑائی اور سیدھے ہوٹل کی راہ اختیار کی۔

بنکاک اور منیلا دو ایسے شہر ہیں جنھیں نوجوانوں کے شہر کہنا چاہیے۔ دونوں جگہ آبادی کا بہت بڑا حصہ نوجوانوں پر مشتمل ہے اور ان میں اکثر تعداد طلبا اور طالبات کی ہے۔ بنکاک میں صبح' دوپہر اور شام سڑکوں پر طلبا ہی طلبا دکھائی دیتے ہیں' جو سفید قمیص یا بلاؤز' کالی نیکر یا سکرٹ ، سفید جرابوں اور سیاہ بوٹوں والی وردی پہنے ادھر ادھر آتے جاتے دکھائی دیتے ہیں ۔ طلبا کی اس بڑی تعداد کا سبب یہ ہے کہ تھائی حکومت عوام کی تعلیم پر بہت زور دیتی ہے۔ چھ سے چودہ سال کی عمر کے بچوں کے لیے تعلیم لازمی ہے اور تعلیم کا تمام خرچ حکومت کے ذمے ہے۔ اسی لیے وہاں تعلیم اور دفاع کا بجٹ برابر ہے۔ تھائی لینڈ میں ستر فی صد لوگ تعلیم یافتہ ہیں۔ تعلیم کی یہ کثرت ۱۹۱۷ کے بعد ہوئی جب چولانگ کوان Chulong Coan یونیورسٹی کی بنیاد رکھی گئی۔ اس سے پہلے تو تعلیم مندروں میں دی جاتی تھی۔ مندروں کی تعلیم کا سلسلہ اب بھی جاری ہے۔ مگر صرف دیہاتی علاقوں میں۔ اور وہاں بھی حکومت نے بہت سے پرائمری سکول کھول دیئے ہیں۔ طلبا کی اس بڑی تعداد کے باوجود ہڑتال' پتھراؤ اور آتش زنی کی کوئی ورادات نہیں دکھائی دی تو ہمیں سخت مایوسی ہوئی۔ درویش اول نے کہا "یہاں کے طلبا تو ہیں ہی مردہ دل۔ ہمارے طلبا کو دیکھو۔ مجال ہے جو ان کی مرضی کے خلاف کوئی امتحان ہوسکے۔ کلاشن کوف کے زور پر اپنے مطالبے منواتے ہیں۔ اپنی مرضی سے ٹریفک بند کرتے ہیں اور کھولتے ہیں۔ جب چاہتے ہیں بسیں جلاتے ہیں اور جب چاہتے ہیں بسیں چلاتے ہیں۔ ہوسٹل باقاعدہ چھاؤنیاں بن گئے ہیں۔ مگر ان معصوموں کو ان قدروں کا ذمہ دار ٹھہرانا ناانصافی ہے۔ نئی نسل پرانی نسل سے توجہ چاہتی ہے اور حق مانگتی ہے' تعلیم کا حق' تربیت کا حق اور روزگار کا حق.... یونیٹیں بند کرنا' آنسو گیس' گدیلے باندھے باوردی غنڈے اور جلسے منتشر کرنے والی بکتر بند گاڑیاں.... کب تک؟ طلبا قوموں کی زندگی میں ایٹم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ قوم کے معماروں پر منحصر ہے کہ اس قیمتی سرمائے کو تعمیری کاموں کے لئے استعمال کیا جائے یا تخریبی عمل کے واسطے۔

پاکستان اور انڈونیشیا میں طلبا کو صرف پولیس اور فوج کی نشانہ بازی کے لیے استعمال کیا گیا ہے اور کیا جا رہا ہے ہمارے طلبا سیاست دانوں کی باتوں میں آکر بے جگری سے خون بہاتے رہے ہیں' بہا رہے ہیں اور شاید بہاتے ہی رہیں گے۔ اس خون کا کچھ تو حساب ہوگا؟ کبھی تو حساب ہوگا؟

تھائی لینڈ میں عورت کو ہاتھی کی پچھلی ٹانگیں کہا جاتا ہے۔ اس کہاوت میں بڑی صداقت ہے۔ کیونکہ ہاتھی تمام کام اپنی پچھلی ٹانگوں کی طاقت کے بل بوتے پر کرتا ہے۔ کچھ یہی مقام تھائی لینڈ میں عورت کا ہے۔ اصل طاقت اگرچہ عورت کی ہے مگر مردوں کی مونچھیں اونچی (تھائی لینڈ میں ۹۵ فیصد لوگ کلینڈ شیو ہیں) رکھنے کے لیے وہ ہمیشہ پس پردہ رہتی ہیں' برقعے میں نہیں۔ بنکاک میں بیشتر سٹور اور دکانیں عورتیں چلاتی ہیں۔ جس دکان پر سب سے زیادہ خوبصورت لڑکیاں ہونگی اسی جگہ سب سے زیادہ رش ہوگا اور زیادہ بکری بھی۔ ہمارے ہوٹل کے نزدیک ایک جنرل سٹور پر بڑی

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

خوبصورت سیلز گرلز تھیں۔ درویش اول ہر گھنٹے کے بعد کوئی نہ کوئی بہانہ تراش کر وہاں پہنچ جاتا۔ انہیں بہانوں کے دوران اس نے کوئی آدھی درجن کنگھیاں بھی خرید لیں۔ حالانکہ اس کی زلفوں کے لیے تو ایک کنگھی بھی فضول خرچی تھی۔ عورتوں کا دخل صرف تجارت تک ہی محدود نہیں بلکہ دیہاتی علاقوں میں کھیتی باڑی کا کام بھی انہوں نے سنبھال رکھا ہے۔ تھائی لینڈ میں پچاسی فیصد لوگوں کے پاس اپنی زمینیں ہیں۔ اوسطاً" ہر شخص کے پاس چھ ایکڑ کے قریب زمین ہے۔ کھیتوں میں زیادہ تر چاول کی کاشت ہوتی ہے۔ چاول اتنے زیادہ پیدا ہوتے ہیں کہ تھائی لینڈ غیر ممالک کو چاول بھیجتا ہے۔ اسی طرح بے شمار مچھلی دریاؤں سے ملتی ہے۔ چنانچہ ملک خوراک کے معاملے میں خود کفیل ہے۔ جب عورتیں کھیتوں میں چاول کی کاشت کرتی ہیں تو مرد گھر میں بچوں کی دیکھ بھال کرتے ہیں' جوا کھیلتے ہیں' مرغے اور پالتو مچھلیاں لڑاتے ہیں۔

تھائی لینڈ کے باشندوں کو باکسنگ کا بہت شوق ہے۔ اس شوق کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ بنکاک میں ہفتہ میں تین دن باقاعدہ باکسنگ کے مقابلے ہوتے ہیں۔ اور ہر مقابلے کو دیکھنے کے لئے لوگوں کا بڑا ہجوم ہوتا ہے۔ وہ باکسنگ کے مقابلے دیکھنے اسی طرح جاتے ہیں جیسے یہاں لوگ پنجابی فلمیں دیکھنے جاتے ہیں۔ تھائی لینڈ کی باکسنگ بھی دنیا سے نرالی ہے۔ اس عجیب و غریب باکسنگ میں اگر محمد علی بھی حصہ لے تو مجھے یقین ہے کہ یہاں کے کسی معمولی سے باکسر کے ہاتھوں شکست کھا جائے۔ کیونکہ اس باکسنگ میں صرف بال کھینچنا اور تھوکنا منع ہے۔ اس کے علاوہ کبھی گدھوں کی طرح دولتیاں چلتی ہیں اور کبھی مینڈھوں کی طرح سر ٹکراتے ہیں۔ کبھی ہاتھوں سے حملہ ہوتا ہے اور کبھی پاؤں سے۔ باکسنگ کے متعلق ایک لطیفہ مشہور ہے۔کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ کسی سنگل پسلی کے آدمی نے کسی مشہور باکسر کو مقابلہ کرنے کے لئے چیلنج دے ڈالا۔ اس مقابلے کو دیکھنے کے لئے بہت سے لوگ جمع ہوئے۔ باکسنگ کے اصول کے مطابق بیلٹ (پیٹی) کے نیچے مکہ لگانا فاؤل قرار دیا جاتا ہے۔ اور جو مکہ باز بار بار فاؤل کرے اس کو شکست کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ چنانچہ جب یہ دونوں مکہ باز رنگ میں پہنچے تو کمزور مکہ باز نے اونچی آواز میں کہا۔ "بیلٹ سے نیچے مکہ مارنا فاؤل ہے"۔ اور ساتھ ہی کمر سے بیلٹ اتار کر سر پر باندھ لی۔

مجھے تھائی لینڈ کی یہ نرالی باکسنگ دیکھنے کا بہت شوق تھا۔ مگر درویش اول کو تو مار کٹائی والی فلمیں دیکھنے کو لے جانا مشکل تھا بھلا باکسنگ کے لئے وہ کب تیار ہوتا۔ میں نے درویش دوم کی طرف رجوع کیا تو اس نے بھی کوئی خاص لفٹ نہ دی۔۔۔ درویش دوم کو سوانا باتھ کا بہت شوق تھا۔ لیکن اس کی غسل کی درخواست ہماری کابینہ نے رد کردی تھی۔ میں نے کہا" اگر تم باکسنگ دیکھنے چلو تو پھر ہم بھی دوبارہ سوانا باتھ کے لئے چلے جائیں گے"۔ اس لالچ میں آکر وہ راضی ہوا تو میں نے درویش اول کے خلاف بغاوت کردی۔ درویش اول بادل ناخواستہ اس شرط پر مان گیا کہ ہم سیٹیں باکسنگ رنگ سے دور لیں گے۔

تھائی باکسنگ کی ابتدا تو اس زمانے میں ہوئی جب تھائی لینڈ اور برما کے درمیان جنگیں ہوتی تھیں۔ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ نائی کوم ٹوم نامی ایک جنگی قیدی نے برما کے بادشاہ کے سامنے باکسنگ کے مقابلے میں مشہور مکہ بازوں کو یکے بعد دیگرے شکست دی۔ بادشاہ اس قیدی سے اتنا خوش ہوا کہ اسے فوراً اس کے ساتھیوں سمیت آزاد کر کے تھائی لینڈ بھیج دیا۔

سٹیڈیم لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ ہم نے اپنی سیٹیں سنبھالیں اور بے چینی سے انتظار کرنے لگے۔ دونوں مکہ باز رنگ میں پہنچے۔ ایک نے سرخ نیکر پہن رکھی تھی اور دوسرے نے گہری نیلی۔ سب سے پہلے دونوں مکہ بازوں نے وائی کرو کیا۔ یعنی تین مرتبہ رنگ میں سجدہ کیا۔ اس کے بعد ایک دوسرے کے ارد گرد ناچ کر تین تین چکر کاٹے۔ دونوں نے اپنے بازوؤں پر کچھ متبرک چیزیں (جیسے ہمارے ہاں تعویذ ہوتے ہیں) باندھ رکھی تھیں۔ مقابلہ شروع ہوا۔ دونوں مکہ بازوں کی جیت پر باقاعدہ شرطیں لگی ہوئی تھیں۔ لوگ اپنے اپنے مکہ باز کو حوصلہ دینے کے لئے نعرے لگا رہے تھے۔ کھیل بہت دلچسپ تھا۔ جوں جوں مکوں کی رفتار بڑھتی گئی لوگوں کا جوش و

خروش بھی بڑھتا گیا۔ بہت سے لوگ ہوا میں مکے لہرا رہے تھے۔ درویش اول کے بازو میں بیٹھا ہوا ایک پستہ قد آدمی تو کچھ زیادہ ہی جوشیلا تھا۔ اس کے لہراتے ہوئے بازو اکثر درویش اول کی ہوائی حدود کی خلاف ورزی کردیتے تھے۔ درویش نے ایک آدھ مرتبہ دبی زبان میں احتجاج بھی کیا' مگر اس احتجاج پر اس وقت کون کان دھرتا تھا۔ مقابلے کے دوران ایک مکے باز نے دوسرے کے بال نوچ لئے۔ اس پر ریفری نے وسل بجائی۔ باہر بیٹھے ہوئے لوگوں نے شور و ہنگامہ کیا۔ جب گڑ بڑ زیادہ ہوئی تو درویش دوم نے درویش اول کے چمکتے ہوئے سر کو دیکھ کر کہا "اگر تم باکسنگ کرو تو کم از کم بال نچنے کی نوبت تو نہ آئے"۔ گو اب بھی یہ باکسنگ خاصی وحشیانہ تھی۔ مگر سنا ہے کہ پہلے زمانے میں تو مکے باز ہاتھوں میں کانچ کے ٹکڑے رکھ کر لڑا کرتے تھے۔ تین مقابلوں کے بعد کھیل ختم ہوگیا۔ ہم ہوٹل میں آکر جلدی سو گئے۔ کیونکہ اگلی صبح سویرے فلوٹنگ مارکیٹ دیکھنے جانا تھا۔

فلوٹنگ مارکیٹ کو دیکھنے کا منصوبہ تو اسی دن تیار کیا تھا جس دن ہم نے بنکاک میں قدم جمائے تھے۔ مگر ہر منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لئے چند دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس منصوبے کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لئے ہمارے راستے میں دو دشواریاں حائل تھیں۔ ایک تو فلوٹنگ مارکیٹ میں کاروبار کا وقت بڑا نامعقول تھا۔ سورج نکلنے تک مارکیٹ بند ہوجاتی تھی اور ہم اپنے بچپن کے وعدے پر اب تک قائم تھے کہ جب تک مسٹر سورج کی آنکھ نہیں کھلے گی اپنی آنکھیں بند رکھیں گے۔ دوسرے درویش دوم کی جبلی کاہلی ـــــ اس کی تیاری قلو پطرہ کی تیاری سے کسی صورت میں کم نہ تھی ـــــ جہاں تک درویش دوم کے شیو بنانے کا تعلق تھا وہ بالکل بکرے کی کھال اتارنے کے برابر تھا۔ اس کے خاردار بالوں کو کاٹنے کے لئے کئی بلیڈوں کی دھاریں کند ہوتیں' مگر شیو کے بعد بھی چہرے پر نور نہیں برستا تھا۔ وہی بلاٹنگ پیپر جیسا سفید چہرہ' لڑکیوں کو دیکھ کر کبھی ٹماٹر بن جاتا اور کبھی چقندر۔ شیو کے بعد غسل کا مرحلہ ہوتا تھا۔ وہ غسل خانے میں ایسی ہی دلچسپی دکھاتا جیسے گدلے پانی کے تالاب میں گینڈا۔ آخر ایک صبح ان سب دشواریوں کو ختم کرکے ہم نے دریا کا رخ کیا۔

دریائے مینام چاؤفیا کو تھائی لینڈ کے لوگ پیار سے "پانیوں کی حسین مامتا' کہتے ہیں۔ میں نے ٹیکسی ڈرائیور سے اس عقیدت مندی کا سبب پوچھا تو اس نے بتایا کہ تھائی لینڈ کے لوگوں کی بنیادی خوراک چاول ہے اور چاول کی پیداوار پر ۸۰ فیصد لوگوں کا انحصار ہے۔ چاول کی فصل کے لئے پانی کی شدید ضرورت ہوتی ہے اور اس ضرورت کو یہاں کے دریا پورا کرتے ہیں۔ چونکہ چاؤفیا یہاں کا سب سے بڑا دریا ہے اسی نسبت سے اس کو مامتا کا درجہ دیا گیا ہے۔

اس مامتا کے ایک کنارے تھون بوری اور دوسرے کنارے بنکاک آباد ہے۔ شہنشاہ تاکسن Taksin نے ۱۷۶۷ عیسوی میں دریائے چاؤفیا کے مغربی کنارے تھون بوری کا شہر آباد کیا اور اس کو اپنا دارالحکومت بنایا ـــــ یہ اس زمانے کا ذکر ہے جب برما کی فوجوں نے تھائی لینڈ کے پرانے دارالحکومت ایودھیا پر حملہ کرکے اسے تباہ کردیا تھا۔ مگر تھون بوری کی قسمت میں دارالحکومت کا شرف صرف پندرہ سال تک رہا۔ ۱۷۸۲ میں بادشاہ راما اول نے موجودہ دارالحکومت بنکاک کو دریا کے مشرقی کنارے آباد کیا۔ شہر کے تین جانب دریا تھا اور چوتھی جانب بہت وسیع فصیل تعمیر کی گئی تھی تاکہ برما کے حملہ آوروں سے شہر کو بچایا جائے۔ دونوں شہروں میں صرف دریا کا پانی جدائی کا احساس دلاتا ہے۔ نووارد کے لئے اس سے بھی کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔ کیونکہ ہم نے کئی مرتبہ دریا کے پل پار کئے اور تھون بوری میں گئے' مگر ہم نے محسوس نہ کیا کہ یہ کوئی دوسرا شہر ہے۔ حالانکہ دونوں شہر دو مختلف ضلعوں میں واقع ہیں۔

سورج نکلتے ہی سڑکوں پر زندگی کی گہما گہمی شروع ہوگئی تھی۔ مگر درویش دوم ٹیکسی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ درویش اول اپنا مووی کیمرہ سنبھالے بیٹھا تھا تاکہ جونہی کوئی دلچسپ منظر آئے اسے فوراً اپنے کیمرے میں مقید کرلے۔ ہم نے دریا

کا پرانا پل پار کیا اور تھون بوری میں پہنچ گئے۔ لوگ سائیکلوں پر اپنے اپنے دفتروں کو جارہے تھے مگر دیکھنے والے کو یہ احساس ہوتا تھا جیسے پکنک کے لئے جارہے ہوں۔ ہر شخص نے شوخ رنگوں والی شرٹیں پہن رکھی تھیں اور تقریباً ہر شخص کی سائیکل کے ہینڈل کے ساتھ ٹرانسسٹر لٹکا تھا۔ وہاں لوگوں کو موسیقی کا بہت شوق ہے۔ ریڈیو پر دن بھر میوزک چنگھاڑتا رہتا ہے۔ بنکاک میں کئی ٹیلیویژن سٹیشن ہیں۔ کسی اونچی جگہ سے شہر کو دیکھا جائے تو چھتوں پر ٹیلیویژن کے ایریل اسی طرح دکھائی دیتے ہیں جیسے پرانے لاہور کی چھتوں پر کبوتروں کے لئے چھتریاں۔ اس شوق کی انتہا تو ایک شخص نے کر رکھی تھی جس نے اپنے کشتی کے گھر میں ٹیلیویژن سیٹ رکھا ہوا تھا۔

وہاں سڑکوں پر نیلی' سبز اور سفید رنگ کی بسیں دکھائی دیتی ہیں جن کی حالت اربن ٹرانسپورٹ کی بسوں سے یقیناً بہتر ہے۔ کم از کم اپنے پیچھے دھوئیں کے بادل تو نہیں چھوڑتیں۔ درویش اول دفعتہ" چلایا۔ "ٹیکسی روکو! وہ دیکھو۔" درویش دوم نے کہا۔ "ابے کاٹھ کے الو تو نے کبھی ٹرک نہیں دیکھا"۔ "مگر اس ٹرک پر گوتم بدھ کا بہت بڑا مجسمہ رکھا ہوا تھا۔ پروہت اردگرد ساز بجا رہے تھے۔ مجسمے کے قدموں میں موم بتیاں جل رہی تھیں۔ پجاری منتیں مان رہے تھے پروہت معبود کو گلی گلی لئے پھرتے تھے تاکہ جو لوگ نذرانے دینے کے لئے مندروں تک نہیں پہنچ سکتے لارڈ بدھا کو لے کر ان کے گھروں تک نذرانہ وصول کرنے کے لئے پہنچا دیا جائے۔ درویش اول نے اپنا مووی کیمرہ سنبھالا اور تصویریں اتارنے لگا۔ یہ لارڈ بدھا کا معجزہ تھا یا درویش اول کی نااہلی کہ کیمرہ خراب ہو گیا اور کوئی تصویر نہ اتر سکی۔

دریائے چاؤفیا سے پھوٹتی ہوئی ان گنت نہروں نے بنکاک کو مشرق کا وینس بنا دیا تھا۔ یہ نہریں لوگوں کے لئے ذرائع آمدورفت بھی ہیں اور ذریعہ معاش بھی۔ ان کے کناروں پر بھی زندگی آباد ہے اور ان کی لہروں پر بھی۔ بنکاک کی مشہور زمانہ فلوٹنگ مارکیٹ بھی یہاں ایک نہر کے سینے پر تیرتی رہتی ہے۔ ہم فلوٹنگ مارکیٹ پہنچے تو اس وقت کاروبار عروج پر تھا۔ درویش دوم نے ہمارے لئے ایک لمبوتری سی کشتی کرائے پر لی اور ہم بھی اس تیرتے بازار میں گھس گئے۔ فلوٹنگ مارکیٹ ہمارے ہاں کی سبزی منڈی کی طرح ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ یہاں سب دکانیں چھوٹی چھوٹی

کشتیوں پر ہوتی ہیں۔ سودا بیچنے والی لڑکیاں گردونواح کے علاقوں میں سے کیلے ناریل' انار' سنگترے' پیاز' سبز مرچیں' کھیرے' مچھلی اور طرح طرح کے رنگ برنگے پھول کشتیوں میں لاد کر لاتی ہیں۔ یہاں گاہک موجود ہوتے ہیں جو یہ سامان خرید کر اپنی اپنی دکانوں پر لے جاتے ہیں۔ سیاحوں کے لیے خرید و فروخت سے زیادہ دلچسپ ان چھوٹی چھوٹی کشتیوں کی سیر ہوتی ہے۔ کیونکہ یہاں کے ملاح اپنی ان مختصر سے انجن والی کشتیوں کو اس ہنرمندی سے چلاتے ہیں جیسے ہمارے ہاں کے رکشا ڈرائیور سڑکوں پر جان کی بازی لگائے رہتے ہیں۔ ہماری ککڑی نما کشتی گدلے پانی کے سینے کو چیرتی بڑی لانچوں سے دامن بچاتی بڑی تیزی سے ہچکولے کھاتی جا رہی تھی کہ بارش نے آن گھیرا۔ ہماری کشتی پر چھت نہ تھی۔ ادھر بارش ہونے لگی اور ادھر درویش اول درویش دوم پر برسنے لگا کہ تم نے یہ چھت کے بغیر کشتی کیوں لی' سارا پروگرام چوپٹ کر دیا۔ ملاح نے کشتی کنارے سے لگادی' پہلے اپنی زبان میں لکڑی کے جھونپڑے والی عورت سے کچھ کہا۔ پھر ہمیں اوپر جانے کا اشارہ کیا۔ اس ہٹ میں سب چیزیں بڑی ترتیب سے رکھی تھیں۔ گھر کے باہر تار پر رنگ برنگے کپڑے سوکھ رہے تھے۔ بارش کے باوجود انہیں وہاں سے کسی نے نہ اتارا۔ شاید اس لئے کہ بارش وہاں بہت تھوڑی دیر کے لئے ہوتی ہے۔ بعد میں پھر سورج چمکنے لگتا ہے تو چوٹی سے ایڑی تک پسینہ ہی پسینہ۔ نہروں کے اردگرد ناریل اور کیلے کے پیڑوں میں گھرے ہوئے اسی طرح کے سینکڑوں گھر ہیں' جن کے سامنے ننگ دھڑنگ صحت مند بچے ندی کے گدلے پانی میں نہاتے دکھائی دیتے ہیں۔ اسی ندی کے پانی میں تھائی لڑکیاں کپڑے دھوتی دکھائی دیتی ہیں۔

بارش رکی تو کاروبار پھر شروع ہوا۔ کشتیوں میں سوار وردیاں پہنے بچے سکولوں کو جارہے تھے۔ ایک لانچ میں سوار ڈاکیہ خط تقسیم کرتا پھر رہا تھا۔ اسی گہما گہمی میں کشتی لئے جناب بدھ پروہت بھی خوراک کا نذرانہ وصول کرتا دکھائی دیا۔ درویش اول نے ایک جاذب نظر لڑکی سے گنا خریدا۔ ایک ہاتھ میں ایک چھ فٹ لمبا

www.iqbalkalmati.blogspot.com

گنا اور دل ربا مسکراہٹیں ملیں تو ہم دونوں بھی خریدار بن گئے۔ ایک کشتی میں چلتی پھرتی کافی شاپ دیکھی۔ یہ صاحب گھر گھر کافی بیچتے پھرتے تھے۔ جہاں سینکڑوں کشتیاں ہوں گی وہاں ٹریفک کا مسئلہ ضرور ہوگا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ٹریفک جمع ہو گیا۔ پھر ٹریفک پولیس کی لانچ نے اسی طرح ٹریفک سنبھالا جیسے عام سڑکوں پر سنبھالا جاتا ہے۔ اسی نہر

کے کنارے ایک جگہ تھائی لینڈ کی صنعت کاری کی اشیاء کی دکان ہے جہاں تھائی لینڈ کا ریشم بڑا سستا ملتا ہے۔ اسی طرح تھائی ریشم کی ٹائیاں' مگرمچھ کی کھال کے دستی بیگ' اعلیٰ چمڑے کے جوتے' لکڑی کی دستکاری کا سامان اور تھائی لینڈ کی مشہور "پرنس" انگوٹھیاں ایک ہی

چھت کے نیچے مل جاتی ہیں' جو دوسری جگہوں سے قدرے سستی ملتی ہیں۔ درویش دوم کو پیاری کی حد تک شاپنگ کا شوق تھا۔ اسے ہر وہ چیز پسند تھی جو سستی بھی ہو اور زیادہ بھی ملے۔ خریداری کرتے وقت وہ سبزی اور دوسری اشیا میں بہت کم فرق محسوس کرتا تھا۔ مثلاً کچھ بعید نہیں کہ وہ شاپنگ کے جنون میں سیلز گرل سے کہہ ڈالے "پلیز دو کلو ٹائیاں' پانچ کلو جوتے اور ڈیڑھ کلو اگر بتیاں تول دیں میں ابھی اڑھائی گز پیاز لے کر آتا ہوں۔" تھائی صنعت کاری کے اس سٹال میں ہم لوگ خالی ہاتھ گئے تھے۔ مگر جب باہر نکلے تو سامان سے لدے ہوئے تھے۔ اس سامان میں درویش اول اور میرا تو خالی مشورہ تھا اور درویش دوم کا سامان تھا۔ میں سامان سے لدا واپس کشتی میں سوار ہونے لگا تو میرا توازن خراب ہو گیا۔ دراصل یہ سب کچھ اس موٹے درویش دوم کے سبب ہوا۔ اس نے اپنا وزن کشتی کے اسی طرف ڈال دیا جدھر سے میں سوار ہو رہا تھا۔ پھر کیا تھا میرا آدھا جسم ندی کے غلیظ پانی میں اور آدھا کشتی میں۔ درویش دوم نے جھٹ سے سامان کے تھیلے میرے ہاتھ سے پکڑ لئے اور مجھے میرے حال پہ چھوڑ دیا۔ دوسرا درویش میری مدد کرنے کے بجائے جبڑے کھولے ہنس رہا تھا۔ جیسے کوئی بہت بڑا تماشہ ہو رہا ہو۔ بیچارے ملاح نے میری مدد کی اور میں کشتی میں سوار ہوا۔ اس وقت دونوں درویش مجھے زہر لگ رہے تھے' خاص طور پر وہ موٹا

درویش دوم۔ دل چاہتا تھا کہ اس کے موٹے پیٹ پر ایسے زور سے لات ماروں کے کچھوے کی طرح پانی میں ڈبکیاں لگاتا پھرے۔

فلوٹنگ مارکیٹ سے واپسی پر ہم دریا کے کنارے اس جگہ پہنچے جہاں شاہی کشتیوں کا بیڑا Royal State Barges ہے۔ شاہی بیڑے میں اب دو خوبصورت کشتیاں باقی ہیں۔ ایک کا نام سوپان ہونگ (سنہری مرغابی) اور دوسری کا نام انن ناگا راج (سات سر والا اژدہا) ہے۔ ان کشتیوں کے نگران نے بتایا کہ پہلے زمانے میں بادشاہ جب سلطنت کے دورے کرتے تھے تو ان کے جلوس انہی کشتیوں پر جایا کرتے تھے۔ ۱۹۲۹ میں جب آخری بار جلوس نکلا تو اس وقت شاہی بیڑے میں ۴۵ کشتیاں تھیں۔ یہ کشتیاں بالکل اسی طرح استعمال ہوتی تھیں جس طرح مغلوں کے زمانے میں ہاتھی استعمال ہوتے تھے۔ سرکاری دوروں کے علاوہ مذہبی رسوم کی ادائیگی کے موقعوں پر بھی ان کشتیوں پر جلوس نکالے جاتے تھے۔ ہر سال واٹ اروں کے مندر کے پڑہتوں کے جبے بدلنے کے روز بادشاہ ان کشتیوں کے رنگین جلوس میں آتے تھے' کیونکہ یہ مندر دریا کے کنارے پر ہے' اس لئے ان کشتیوں کا استعمال ہوتا تھا۔ نگران نے بتایا کہ ۱۹۷۲ میں بادشاہ بھومیبول گیارہ سال کے عرصے کے بعد ان کشتیوں پر سوار ہو کر جلوس کی شکل میں واٹ اروں کے مندر میں گئے۔ اس جلوس کے لئے تھائی لینڈ کی بحریہ کے تیرہ سو جوانوں نے شرکت کی۔

دریائے چاؤفیا کے مغربی کنارے شاہی محل کے مقابل واٹ اروں Temple of Dawn ہے۔ یہ بنکاک کا بہت پرانا اور بہت اہم مندر ہے۔ اس کی تعمیر اس زمانے میں ہوئی جب تھون بوری سیام کا دارالخلافہ تھا۔ گو اب تھون بوری دارالحکومت نہیں رہا اور سیام نام بدل کر تھائی لینڈ بن گیا ہے' مگر واٹ اروں کی اہمیت میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ اب بھی ہر سال صدیوں پرانی رسم پوری کی جاتی ہے اور بادشاہ ذاتی طور پر مندر میں جا کر پڑہتوں کو جبے پیش کرتے ہیں۔ ہم اپنی ننھی منی لانچ کو کنارے پر روک کر مندر دیکھنے گئے۔ سب سے پہلے مین گیٹ کے قریب دو

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بہت بڑے بت دکھائی دیئے۔ ان بتوں کی شکلیں بہت بھیانک تھیں اور دونوں نے ہاتھوں میں بڑے بڑے ڈنڈے تھامے ہوئے تھے۔ ہماری لانچ کے ملاح نے' جو اس وقت گائیڈ کے فرائض انجام دے رہا تھا' بتایا کہ یہ مندر کے چوکیدار ہیں اور یہ بدروحوں کو مندر سے دور بھگانے کے لئے ہیں۔ یہ بات سنتے ہی درویش اول کے قدم رک گئے' مگر درویش دوم نے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے تسلی دی اور کہا "تم چلے جاؤ' تمہیں کچھ نہیں کہیں گے۔" اس مندر کی خاصیت یہ ہے کہ یہاں سجاوٹ کے لئے سیپیاں اور رنگ برنگے ٹوٹے برتنوں کے ٹکڑوں کو استعمال کیا گیا ہے۔ اس مندر کا مینار ۶۷ فٹ اونچا ہے اور اس بلندی سے شہر کا بہت اچھا نظارہ ہو سکتا ہے۔ ساڑھے دس بجے تک ہم مندر کی سیر سے اکتا گئے تو واپس ہوٹل کی طرف کوچ کی۔ اب بنکاک میں ہماری آخری رات تھی اور اس رات سے نہ جانے ہم نے کیا کیا امیدیں باندھ رکھی تھیں۔ کیونکہ آج کی رات ہم مسٹر اسلم خاں کے مہمان تھے اور ہم ان کی مہمان نوازی سے پورا پورا فائدہ اٹھانا چاہتے تھے۔

درویش اول کمرے میں اس طرح گھوم رہا تھا جیسے پنجرے میں ڈارون کی تھیوری والا اور انسان سے مشابہت رکھنے والا جانور۔ آسمان پر گھٹائیں بپھری ہوئی تھیں اور وہ اس طرح بیدردی سے برس رہی تھیں جس طرح کوئی چیتی بیوی خاوند پر برس رہی ہو۔ جوں جوں بارش بڑھتی گئی توں توں ہماری نا امیدی بھی اور بھوک بھی بڑھتی گئی۔ جہاں تک بھوک کا تعلق ہے اس سے میرا بہت قریبی رابطہ ہے - رہے دوسرے درویش تو ان میں درویش اول تو آنکھوں کی خوراک پر گزارہ کرتا تھا۔ اس خوراک کی بنکاک میں کمی نہیں۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ بلڈ پریشر کی وجہ سے عام خوراک سے پرہیز کرکے صرف آنکھوں کی خوراک پر اکتفا کرتا ہے۔ حالانکہ آنکھوں کی اس رنگین خوراک سے بلڈ پریشر کی حالت سنگین تو ہو سکتی ہے اس میں کمی کی امید نہیں۔ درویش دوم کی فاقہ مستی صرف پیٹ کا دائرہ کم کرکے عشق کا دائرہ وسیع کرنے کی آرزو میں ہوتی تھی۔ مگر میں سنگل پسلی والا بندہ' خان صاحب کی اس دعوت کا صبح سے

انتظار کر رہا تھا' صرف یہی نہیں بلکہ درویشوں نے رات کے کھانے کی لذیذ کہانیاں سنا کر دوپہر کا کھانا بھی گول کر دیا تھا۔ رہا میزبان تو اس نے چھ بجے کا وقت دیا۔ اب آٹھ بج رہے تھے۔ نہ میزبان آیا اور نہ میز۔ سوا آٹھ بجے ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ درویش دوم نے بیزاری سے "ہیلو" کہا۔ دوسری جانب سے آواز سنتے ہی اس کے بلانگ پیپر نما چہرے پر زندگی کے آثار دکھائی دینے لگے۔

سیام کے قدیمی رقصوں میں دو رقص بہت مشہور ہیں ایک کھون رقص Masked Dance اور دوسرا لاکون رقص Thai Classical Dance ہے۔ آج کے پروگرام میں سب سے پہلے کھون رقص پیش کیا گیا۔ خانصاحب پہلے بھی کئی بار یہاں کے روائتی رقص دیکھ چکے تھے۔ چنانچہ انھوں نے ان کے بارے میں کچھ تفصیل بتائی۔ کھون رقص میں کردار چہروں پر ماسک پہنتے ہیں۔ اس رقص میں تین ہزار سال پرانی رامائن کی کہانیوں کی عکاسی کی جاتی ہے۔ اس رقص کی خوبی یہ ہے کہ اس میں مکالمے کے بغیر پوری کہانی کا مفہوم سمجھ میں آجاتا ہے۔ کرداروں کی پہچان ان کے کپڑوں کے رنگ سے کی جاتی ہے۔ مثلاً راما کا لباس سبز' لکشمن کا سنہرا اور ہنومان کا سفید ہوتا ہے۔ اس رقص میں لڑائی کے مناظر بھی پیش کئے جاتے ہیں اور کردار بڑی خوبصورتی سے موسیقی کی دھن کے ساتھ تلواریں لہراتے ہیں۔ یہ رقص کسی حد تک کتھا کلی رقص جیسا ہوتا ہے۔

لاکون رقص کی کہانیاں مذہبی نہیں بلکہ رومانی ہوتی ہیں۔ پچھلے زمانے میں یہ رقص شہزادیوں کے دل بہلانے کے لئے کیا جاتا تھا اور اس وقت یہ رقص صرف عورتیں کرتی تھیں۔ گو اس رقص کے ایکشن بہت سست ہوتے ہیں۔ مگر ان میں بہت گریس ہوتی ہے۔ کرداروں کے لباس بہت خوبصورت ہوتے ہیں۔ اس رقص کی کہانیوں کے کردار اپنے اپنے پارٹ ادا کرتے ہیں۔ مگر کبھی کبھی مکالمے بھی بولے جاتے ہیں۔ رقص اور خوراک اور خوراک اور رقص کا سلسلہ بہت دیر تک جاری رہا۔ ہم نے بادل ناخواستہ اس رنگین رات کو الوداع کہا اور اپنے ہوٹل چلدیئے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بارش کا زور ٹوٹتے ہی رات کا طلسم زوروں پہ ہو گیا۔ ہم واپسی پر پیٹ پانگ سے گزرے تو مشرق کی حیا کو فٹ پاتھوں پر نیم برہنہ پایا۔ مغرب کے خریدار اپنے اپنے سودے بغلوں میں دبائے لڑکھڑاتے جا رہے تھے۔

ہمارا جہاز شام کو چار بجے چیانگ مائی کے لئے اڑنا تھا۔ مگر ہم نے صبح دس بجے ہی ہوٹل سے سامان نکالا اور ایئرپورٹ کا رخ کیا۔ جلدی جانے کا سب سے پہلا سبب تو یہ تھا کہ تھائی لینڈ میں ہوٹل چھوڑنے کا وقت دن کے بارہ بجے ہے۔ اگر ہم ساڑھے بارہ بجے بھی ہوٹل چھوڑتے تو اگلے چوبیس گھنٹے کا کرایہ ادا کرنا پڑتا۔ ظاہر ہے درویش دوم جیسے کمپیوٹر دماغ کے ہوتے ہوئے اس قسم کی عیاشی کی گنجائش نہ تھی۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ ہم لوگ ایئرپورٹ کے نزدیک ٹم لینڈ دیکھنا چاہتے تھے۔ ٹم لینڈ' انگلینڈ یا نیوزی لینڈ کی طرح کا کوئی ملک نہیں بلکہ بیس ایکڑ رقبے میں ایک پارک ہے جس میں تھائی لینڈ کے مختلف علاقائی مناظر پیش کئے گئے ہیں۔ ٹم لینڈ صرف سیاحوں کی سہولت کے لئے بنایا گیا ہے۔ کیونکہ ان کے پاس اتنا وقت نہیں ہوتا کہ وہ تھائی لینڈ کے دور دراز علاقوں میں جا کر اس کی تہذیب کے مختلف پہلو دیکھیں۔ لہٰذا ٹم لینڈ دیکھنے کے بعد تھائی لینڈ کی علاقائی تہذیب کا پورا اندازہ ہو جاتا ہے۔

ٹم لینڈ پہنچے۔ درویش دوم نے تین ٹکٹ خریدے۔ ہر ٹکٹ کی قیمت ایک سو باتھ (چھ ڈالر) تھی۔ درویش دوم نے فوراً حساب لگا کر کہا کہ اس سے تو بہتر تھا ہوٹل میں رہتے' وہاں کم خرچ ہوتا۔ ٹم لینڈ میں داخل ہوتے ہی سیدھے ہاتھ دھان کا کھیت تھا جس میں ایک محترمہ نے ہل جوت رکھا تھا۔ وہاں ہل کھینچنے کے لئے بیل کی بجائے بھینس استعمال کی جاتی ہے۔ بھینس کو دیکھ کر درویش اول نے درویش دوم کو کہا کہ وہ دیکھو تمہاری نسل کی چیز پر ظلم کیا جا رہا ہے۔ تم ذرا بچ کر رہنا' کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہیں یہ لوگ یہیں رکھ لیں اور ہمیں اپنے ہمراہ بھینس لے جانی پڑے۔ کھیت کے نزدیک ہی بانسوں کا گھر تھا۔ جس کے سامنے چند مرد اکٹھے تھے اور مرغ لڑا رہے تھے۔ تھائی لینڈ میں عورتیں کھیتی باڑی کا کام کرتی

ہیں اور مرد بچوں کا خیال رکھتے ہیں' گھر کی حفاظت کرتے ہیں اور مرغ لڑاتے ہیں۔ کچھ دیر مرغوں کی جھڑپیں دیکھیں۔ نزدیک ہی ہاتھی کام پر لگا ہوا تھا۔ ہاتھی سے تھائی لینڈ میں بہت کام لیا جاتا ہے۔ یہ دیوقامت جانور زیادہ تر لکڑیاں کھینچنے کے کام آتا ہے۔ مغربی تھائی لینڈ کے چیڑ اور دیار کے جنگلات میں اب بھی ہاتھیوں سے لکڑیاں کھینچنے کا کام لیا جاتا ہے۔ ٹم لینڈ کے گائیڈ نے بتایا کہ ہاتھی تھائی لینڈ کے مشرقی شہر سیورن کے گرد و نواح کے علاقے میں پائے جاتے ہیں اور وہاں کے لوگوں کی آمدنی کا ذریعہ ہاتھیوں کی تربیت ہے۔ وہ جنگلی ہاتھیوں کو پکڑ کر انہیں تربیت دیتے ہیں اور تربیت یافتہ ہاتھیوں کو جنگل کے ٹھیکیداروں کے ہاتھ فروخت کرتے ہیں۔ گو ہاتھی کی عمر تو خاصی لمبی ہوتی ہے' مگر اس کے کام کرنے کا عرصہ ۳۰ سے ۸۰ سال کی عمر کے درمیان کا ہے۔ اس کے بعد ہاتھیوں کو پورے اعزاز کے ساتھ پنشن دے کر ریٹائر کر دیا جاتا ہے۔ ٹم لینڈ میں دستکاری' رقص اور باکسنگ وغیرہ کی بھی نمائش کی جاتی ہے اور سیاح یہ تمام چیزیں دیکھ کر تھائی لینڈ کے بارے میں بہت کچھ بہت کم وقت میں جان جاتے ہیں۔ سیاحت کے فروغ کے لئے ہمارے ملک میں بھی تو ایسی جگہ اسلام آباد اور کراچی کے نزدیک بنائی جا سکتی ہے' جہاں علاقائی رقص اور ثقافت کی جھلکیاں دکھا کر سیاحوں کے لئے دلچسپی کا سامان پیدا کیا جا سکتا ہے۔

تین گھنٹے ہم نے ایئرپورٹ پر گھوم کر گزارنے تھے۔ چنانچہ ایئرپورٹ بلڈنگ کی چھت سے نظارہ کرنے لگے۔ تھوڑے تھوڑے عرصے بعد جیٹ طیارے یا اتر رہے تھے اور یا اپنی اپنی منزلوں کو پرواز کر رہے تھے۔ رن وے کے ارد گرد پھیلی ہوئی ہری بھری گھاس میں ننگ دھڑنگ بچے اپنی بھینسوں کو چرا رہے تھے۔ وہیں کچھ فاصلے پر تھائی فضائیہ کے لڑاکا طیارے بھی بے یار و مددگار کھڑے تھے۔ اس لاوارثی میں تو ہمارے ہاں اومنی بسوں کو بھی نہیں کھڑا کیا جاتا۔ اسی عرصے میں سبز رنگوں والا پی آئی اے کا طیارہ ٹوکیو سے واپس وطن جاتے ہوئے بنکاک اترا۔ اپنے ہم وطنوں کو دیکھ کر وطن کی یاد ستانے لگی۔ مگر وطن کی یاد کو سیاحت کے شوق میں چھپا کر میں پاس کھڑے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بدھ پروہت سے باتیں کرنے لگا۔ پروہت کو جب پتہ چلا کہ ہم پاکستان سے آئے ہیں تو اس نے فوراً پوچھا کہ ہم نے لاہور کے عجائب گھر میں گوتم بدھ کا مجسمہ دیکھا ہے یا نہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ بات بن گئی' کیونکہ اتفاق سے یہ مجسمہ میں نے دیکھا ہوا تھا۔ صرف یہی نہیں میں نے پروہت کو وادی سوات میں پھیلی ہوئی بدھ عبادت گاہوں کی تفصیل بھی بتا دی۔ باتوں باتوں میں وقت کٹ گیا۔ اور درویش اول بھاگتا ہوا آیا کہ جلدی چلو اڑان کا ٹائم ہو گیا ہے۔ نیچے گیا تو پتہ چلا کہ جلدی کس بات کی تھی۔ سامان اٹھانا تھا جس کے لئے ان دونوں کو میری یاد ستا رہی تھی۔ کاؤنٹر پر کھڑی جامنی وردی والی بادامی لڑکیاں بات کرتیں تو رس گھول دیتیں۔ یہ تو زہر کو بھی ہاتھ لگا دیں تو شہد بن جائے' گو اثر پہلے سے بھی زیادہ مہلک ہو جائے گا۔ بنکاک کو آخری سلام کیا اور چیانگ مائی جانے کے لئے جہاز پر سوار ہو گئے۔

تھائی لینڈ کے شمال میں بنکاک سے سات سو کلو میٹر دور چیانگ مائی کا شہر ہے جو آبادی کے لحاظ سے تو ملک کا دوسرے نمبر کا شہر ہے' مگر اور کئی لحاظ سے بنکاک سے بازی لے گیا ہے۔ مثلاً" بنکاک کے مقابلے میں یہاں کا موسم بڑا عاشقانہ ہوتا ہے۔ شہر اور موسم دونوں' مری اور ایبٹ آباد کا ملاپ سا نظر آتے ہیں۔ گرمیوں کی شدت میں تو شہنشاہ بھومیبال بھی بنکاک کو چھوڑ کر یہاں اپنے محل میں منتقل ہو جاتا ہے۔ بنکاک کے نائٹ کلبوں کو سجانے والی کلیاں زیادہ تر اسی شہر اور علاقے کی رہنے والی ہوتی ہیں۔ اور شاید انہی کلیوں کی کشش تھی جو ان تین بھونروں کو چیانگ مائی کھینچ لائی تھی۔

ایئرپورٹ سے سوری وانگنر ہوٹل جانے کے لئے درویش دوم نے ٹیکسی کی بجائے تھک تھک (رکشا) کا انتخاب کیا۔ تھائی لینڈ کی تھک تھک اور ہمارے ہاں کے یہ موت کے اڑن کھٹولے اگرچہ قریبی رشتہ دار ہیں' مگر ڈرائیوروں میں بہت فرق ہے۔ وہاں کے ڈرائیور تو سواری کو صرف ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچاتے ہیں' مگر ہمارے ڈرائیور تو سواری کو اس جہان سے دوسرے جہان پہنچانے کی سر توڑ کوشش کرتے ہیں۔ سواری بچ جائے تو یہ اسکی قسمت۔ خون خشک کئے بغیر ہی ڈرائیور نے ہمیں ہوٹل پہنچا دیا۔

درویش اول کی تجسس پسندی کا خوش آئین پہلو یہ تھا کہ وہ ہر شہر اور مقام کے بارے میں بنیادی معلومات پہلے ہی سے حاصل کر لیتا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ معلومات فراہم کرتے وقت اپنے پسندیدہ مقامات کو ایسے ڈرامائی انداز میں پیش کرتا کہ نہ چاہتے ہوئے بھی وہاں جانے کو جی چاہتا۔ یہی حال اس نے چیانگ مائی میں کیا۔ ہوٹل میں سامان رکھنے کی دیر تھی کہ اس نے روانگی کا اعلان کر دیا۔ ست الوجود درویش دوم کو تو عام حالات میں کمرے سے نکالنا معجزے سے کم نہ تھا اسوقت تو وہ تھا ہی تھکا ہوا' بھلا اس پر روانگی کے اس اعلان کا کیا اثر ہوتا۔ چنانچہ درویش اول نے کرسی سنبھالی اور بستر پر بچھے ہوئے درویش دوم کو چیانگ مائی کے بارے میں لچھے دار قصے سنانے شروع کئے۔ اگرچہ درویش دوم کے بغیر بھی چیانگ مائی کی سیر کی جاسکتی تھی۔ اور شہر کے حسن اور صحت پر کوئی فرق نہیں پڑنا تھا مگر اس کو ساتھ نہ لے جانے سے ہم لوگوں پر بہت فرق پڑتا تھا۔ مثلاً" ہم تینوں نے سیر و سیاحت کے لئے جو خزانہ جمع کیا تھا اسکی کنجیاں درویش دوم کے پاس تھیں۔ ظاہر ہے کلید بردار کے بغیر سیر کیا خاک ہونی تھی۔

کوہ دوئی موتھپ کی بلندیوں پر سرمئی شام پھیل چکی تھی۔ افق پر پھیلے سرخ زعفرانی اور اودے رنگ سیاہی مائل ہوتے جا رہے تھے۔ انسانی درندگی پر پردہ ڈالنے کے لئے سیاہ رات اپنا دامن پھیلائے بڑھ رہی تھی۔ قدیم مندروں کے میناروں کی تکونیں رات کا دامن چاک کرنے کے لئے بھالوں کی طرح تنی ہوئی تھیں' مگر ان سب چیزوں سے بے خبر سڑکوں پر زندگی رواں دواں تھی اور اس روانی میں تینوں درویش بھی شامل ہو گئے۔ ہماری منزل شبینہ بازار تھی۔ اور بازار کی یہی کشش تھی جو درویش دوم کو کھینچ لائی۔ جمعہ بازار کی طرح یہاں ہر چیز تھوک کے بھاؤ مل رہی تھی۔ چھوٹے بڑے سینکڑوں سٹال تھے جو رنگ برنگی اشیا سے کھچا کھچ بھرے ہوئے تھے۔

وہاں خریدنے کی لاکھوں چیزیں اور دل پشوری کرنے کے لاکھوں لوازمات تھے۔ ایک ایک سیلز گرل قابل دید تھی۔ تینوں درویش ہر لڑکی کو ہر زاویئے سے اس طرح دیدے پھاڑے تاڑ رہے تھے کہ اگر وہ موم کی ہوتیں تو یقیناً پگھل جاتیں۔ خیران کو تو کچھ نہ ہوا البتہ تینوں درویش پانی پانی ہو گئے۔ درویش اول تو تھا ہی دل کا سوداگر' بھلا اسکو دنیاوی چیزوں سے کیا سروکار۔ البتہ درویش دوم نے حسب عادت کوئی سات کلو کپڑے خرید لئے۔ چیانگ مائی' تھائی لینڈ کی دستکاری کا مرکز ہے۔ یہاں خوبصورت چھتریاں لکڑی کا نمائشی سامان ریشم اور افیون کثرت سے ملتی ہے۔گاہکوں کو افیون اور کوکین بیچ کر پولیس کو اطلاع دینا بھی چیانگ مائی کے تجارتی اصولوں کا حصہ ہے۔ بہت سے ناواقف اور نووارد اس اصول کا شکار ہو جاتے ہیں۔

شبینہ بازار سے کچھ دور شاہراہ کا ہینگ دین پر ایک اور بازار ہے جسے مختلف زبانوں میں مختلف ناموں سے پکارا جاتا ہے۔ مگر قارئین کی سہولت کے لئے اس بازار کو میں بازار حسن' بازار جسم اور بازار جنس کہہ کر پکاروں گا۔ درویش اول اس بازار کا شہزادہ تھا۔ اسے اس بازار میں جا کر وہی سکون ملا جو عام بازار میں درویش دوم کو ملتا تھا۔ چنانچہ اب وہ بھی اسی فراخدلی سے سودے کر رہا تھا جو شبینہ بازار میں درویش دوم نے کئے۔ تھائی لینڈ کے جنسی کاروبار کا خام مال چیانگ مائی کے علاقے سے آتا ہے۔ اسی لئے اس بازار میں یہ را مٹیریل سستا بھی ملتا ہے اور بکثرت بھی۔

چیانگ مائی میں پہلی رات جتنی رنگین گزری تھی دن اتنا ہی ذلت و خواری میں گزرا۔ گو اس خواری میں شہر کا کوئی دخل نہ تھا' دخل تھا تو درویش دوم کا اور اسکی بچت سکیم کا۔ اس سکیم کے تحت اس نے شہر کی سیر کی خاطر ٹیکسی میں گھومنے کی بجائے دو سائیکل کرائے پر لے لئے۔ دو اس لئے کہ درویش اول کو سائیکل چلانی نہیں آتی تھی۔ لہٰذا اسکا بوجھ بھی میری سائیکل پر ہونا تھا۔ یہ سائیکل مجبوری کی سواری تو ہے سیر کی ہرگز نہیں۔ ہاں گوروں کی بات الگ ہے۔ وہ تو شوقیہ گدھے کی سواری بھی کر لیتے ہیں۔ ویسے گورا تو منہ بھی کالا کر لے تو فیشن کہلاتا ہے' مگر ہم کالوں کے لئے گورے کا فیشن بھی مجبوری ہی سمجھئے۔

ہینڈل پر شہر کا نقشہ' ڈنڈے پر درویش اول اور پیڈل پر ہمارے پاؤں۔ تھائی لینڈ میں ٹریفک سڑک کے دائیں ہاتھ چلتی ہے۔ ہمیں عادت ہے بائیں ہاتھ چلنے چلانے کی۔ سائیکل پر درویش اول کا بوجھ اور کندھوں پر حفاظت کا بوجھ۔ یہ دونوں بوجھ بس قیامت کا بوجھ تھے' اور ہم ان لوگوں میں ٹھہرے جو نہیں اٹھاتے تنکے کا بوجھ۔ ادھر درویش دوم پر اپنی جسامت کے بوجھ کے علاوہ اور کچھ بوجھ نہ تھا۔ بلکہ وہ اس سائیکل پر سیر کے لئے باقاعدہ تیاری میں تھا۔ چیانگ مائی کے شبینہ بازار سے خریدی ہوئی پھولدار' شوخ وشنگ بشرٹ۔ سر پر تنکوں کا ہیٹ اور ہم لوگوں کی کہر آلود نظروں سے بچنے کے لئے سیاہ چشمہ۔

سڑکوں پر سڑکوں کے نام تھائی زبان میں لکھے تھے اور نقشے پر انگریزی میں۔ جو سڑک نقشے پہ تھی وہ شہر میں ہمیں نہ ملے اور جو شہر میں نظر آئے وہ نقشے پہ نہ ملے۔ اور ملتی کیسے۔ درویش اول نے نقشہ تو محض دکھاوے کے لئے پھیلایا ہوا تھا۔ اصل دھیان تو اس نے راہ چلتی بیبیوں کے چال چلن پر لگا رکھا تھا۔ مجھے الو بنانے کے لئے کبھی دائیں مڑنے کو کہہ دیتا اور کبھی بائیں مڑنے کو۔ اسی گمراہی میں دن کے گیارہ بج گئے اور ہم کولھو کے بیل کی طرح وہیں گھومتے پھرے۔ حرام ہے جو کوئی تاریخی مندر یا مقام نظر سے گزرا ہو۔ ہاں اسی کش مکش میں پرانے شہر پہنچ گئے۔ جسکے چاروں طرف شہر پناہ اور حفاظتی خندق ہے۔ اس شہر پناہ اور حفاظتی خندق نے نہ کبھی باہر والوں کو اندر آنے سے روکا اور نہ اندر والوں کو باہر جانے سے۔ ہم بھی بلا روک ٹوک شہر پناہ کو پار کر گئے۔ مگر سفید ہیٹ والے سنتری بادشاہ نے وسل بجائی اور رکنے کا اشارہ کیا۔ میں تو رکنے کا بہانہ ہی ڈھونڈ رہا تھا۔ فوراً بریک لگائی۔ ویسے ہم نے دانستہ طور پر ٹریفک کی قانون شکنی ہرگز نہ کی تھی۔ مگر یہ دائیں بائیں کے ہیر پھیر میں کچھ گڑ بڑ ضرور ہو گئی تھی۔ پیچھے درویش دوم کو دیکھا تو وہ سڑک کے دوسری جانب کھڑا مسکرا رہا تھا۔ چنانچہ پلس (پولیس) مقابلے کے لئے میں نے درویش اول کو میدان

میں چھوڑ دیا۔ ہم ہیں عادی اپنی پولیس کے بھلا تھائی پولیس کو ہم کیا خاطر میں لاتے۔ درویش اول نے پولیس والے سے گرم جوشی سے ہاتھ ملایا۔ سنتری نے تھائی زبان میں الزام لگائے۔ درویش اول نے سرائیکی میں صفائی پیش کی۔ سنتری نے مصافحے والا ہاتھ اپنی جیب میں ڈالا اور ہمیں جانے کا اشارہ کر دیا۔ پلس مقابلے کے بعد اکثر قانون شکنوں کے حوصلے بلند ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ "جھاکا" کھلنے کی دیر تھی کہ ہم بھی دلیر ہو گئے اور دن بھر چیانگ مائی میں سائیکل دوڑاتے پھرے۔ ویسے بھی طول و عرض کے لحاظ سے یہ مختصر سا شہر ہے۔ مگر بدھ مندروں کی تعداد تین سو سے زیادہ ہے۔ ظاہر ہے ہمیں نہ سب مندر دیکھنے کی ضرورت تھی اور نہ ہمت۔ جو مندر ہمارے راستے میں آیا اسے دیکھ ڈالا اور جو بچ گیا اسے جانے دیا۔ بدھ مندروں کی ایک مخصوص طرز تعمیر ہوتی ہے۔ ایک گنبد نما "سٹوپا" ہوتا ہے' جس میں گوتم بدھ کی راکھ ہوتی ہے۔ پھر گوتم بدھ کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرتے ہوئے مجسمے۔ مجسموں کے سامنے نذرانے پیش کرتے عقیدتمند۔ اگربتیوں اور تازہ پھولوں کی خوشبو۔ زعفرانی لبادوں والے بدھ بھکشو۔ ہر بدھ مندر میں امن' سلامتی اور سکون بہت ملتا ہے۔ ذہنی سکون بھی اور روحانی سکون بھی۔

مگر ہمیں اسوقت جسمانی سکون کی بہت ضرورت تھی۔ کیونکہ دن بھر سائیکل چلانا اور درویش اول کے وجود کے بوجھ کو ڈھونا کوئی آسان نسخہ نہ تھا۔ لہٰذا پہلی ہی فرصت میں سائیکل واپس اور سوائا باتھ پر حملہ۔ چونکہ چیانگ مائی بنکاک کے مقابلے میں ابھی کم کمرشل ہوا ہے اس لئے یہاں ہر کام تسلی سے بھی ہوتا ہے اور خلوص سے بھی۔ مالش کرنے والی بیبی نے اس چابکدستی سے مالش کی کہ ہم گھوڑے کی طرح چاق و چوبند ہو گئے اور دن بھر کے نڈھال جسم میں کرنٹ سا آگیا۔ درویش اول کی بیٹری چارج ہوتے ہی اسکی جاپانی کھلونے والی چال پھر سے لوٹ آئی' مگر درویش دوم کی کچھوے والی چال پر صرف اتنا اثر ہوا کہ وہ ہاتھی کی طرح جھوم جھوم کر چلنے لگا۔ اور ہاتھی بھی سفید ہاتھی۔ خدا کا شکر ہے کہ چیانگ مائی کے لوگوں کو درویش دوم پر ہاتھی ہونے کا شبہ نہ ہوا' ورنہ موصوف فوراً بنکاک کے چڑیا گھر میں پہنچا دیئے جاتے۔ اگرچہ روایتی طور پر تھائی لینڈ میں سفید ہاتھی خوش بختی کی علامت ہے۔ اور پرانے زمانے میں جس بادشاہ کے پاس جتنے زیادہ سفید ہاتھی ہوتے تھے اتنا ہی وہ خوش نصیب سمجھا جاتا۔ مگر اس مہنگائی کے زمانے میں سفید ہاتھی پالنا بادشاہ کے لئے بھی ممکن نہیں۔ رہا" تھائی لینڈ میں جتنے بھی سفید ہاتھی ہیں وہ بادشاہ کی ملکیت ہیں۔ اسی لئے جونہی کسی باشندے کو سفید ہاتھی ملتا ہے وہ بادشاہ کو تحفے کے طور پر بھیج دیتا ہے۔ جسے بادشاہ چڑیا گھر کے حوالے کر دیتا ہے۔ جہاں تماشائیوں کی ٹکٹوں سے سفید ہاتھی پالے جاتے ہیں۔

لوئی کراتھونگ کا تہوار خزاں کے موسم میں چاند کی چودھویں رات میں منایا جاتا ہے۔ اس رات پورے تھائی لینڈ کے دریاؤں' نہروں' ندیوں اور جھیلوں کے کنارے تہوار منانے والوں کے ہجوم ہوتے ہیں۔ چیانگ مائی میں اس تہوار کا خاص حسن اور رنگ ہوتا ہے جسے دیکھنے کے لئے ہزاروں لوگ تھائی لینڈ کے دور دراز علاقوں سے آتے ہیں۔ یہ تہوار پانی کے دیوتاؤں کو نذرانے پیش کرنے کے لیے منایا جاتا ہے۔ چنانچہ کیلے کے پتوں سے کنول کے پھول نما کراتھونگ یعنی کشتیاں بنائی جاتی ہیں۔ جن میں عقیدت مند موم بتیاں اور اگر بتیاں جلا کر سکے ڈالتے ہیں اور پانی میں بہا دیتے ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ یہ کشتیاں اپنے ساتھ گناہ بہالے جاتی ہیں۔

چیانگ مائی میں چودھویں کی رات تھی۔ شہر کو چیرتے ہوئے دریائے پنگ کے کنارے سینکڑوں ہزاروں چاند اترے ہوئے تھے۔ فضا میں اگربتیوں کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ دریا کے سیاہ سینے پہ ٹمٹماتی بتیوں کی قطاریں ہچکولے کھاتی چلی جا رہی تھیں۔ درویش اول نے پھولوں سے سجی ایک بی بی سے ماچس مانگی۔ موم بتی جلائی اور کشتی دریا میں چھوڑ دی۔ انکی کشتی دو چار کشتیوں سے ٹکرائی .... ڈگمگائی .... اور ڈوب گئی۔ درویش دوم تو کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتا تھا۔ فوراً بولا۔ "بچو! .... ایک کشتی تو تمہارے کل رات کے گناہوں کا بوجھ ہی نہیں اٹھا سکتی .... بھلا ساری عمر کے

گناہوں کو لیکر کیسے تیرتی۔ تم کسی سٹیمر کا بندوبست کرو۔" ایسے موقعوں پہ درویش اول ہم لوگوں کو بالکل نظرانداز کر دیتا تھا۔ چنانچہ اس نے درویش دوم کو ہولے سے "شٹ اپ" کہا اور اپنے گناہوں کو بہانے کا بہانہ بنا کر پھولوں سے لدی اس گلبدن سے سریش ہو گیا۔ سال بھر کے گناہ رات بھر میں بہہ گئے .... اور اب یہ پاکدامن بیساں اگلے تہوار کی تیاری میں کشتیوں کا بوجھ بڑھانے چل پڑیں۔ درویش اول کے گناہ بہے یا بڑھے اسکا ہمیں علم نہیں' البتہ آخری خبریں آنے تک وہ کشتی رانی میں مصروف تھا۔

درویش اول اپنے گناہوں کا بوجھ ہلکا کرتے کرتے اتنا ہلکان ہوا کہ اسے بستر سے باقاعدہ گھسیٹنا پڑا۔ اس سفر میں یہ پہلا موقع تھا جو تیاری کے معاملے میں درویش اول کے ساتھ وہی کاروائی کی جا رہی تھی جو عام حالات میں درویش دوم کے ساتھ کی جاتی تھی۔ ہماری مسلسل ہنگامہ آرائی سے تنگ آکر اس نے اپنی زلفوں کو سجانے کی جنگ شروع کی۔ ایک ایک زلف دراز کو گیلا کیا جو اتنا طویل کام نہ تھا۔ کیونکہ گنتی کی چند زلفیں تھیں۔ پھر ان کا تانا بانا سا بنا اور اپنے سر کے گلوب پہ بچھا دیا۔ چند زلفوں کی ایک لٹ کو اس خوش اسلوبی سے پیشانی پر سجایا کہ چہرے اور سر کے درمیان ایک قدرتی باؤنڈری سی بن گئی۔ آخر میں زلفوں کے اس جال پر اس انداز سے سپرے کیا کہ جو زلف جہاں تھی سر سے سریش ہو گئی۔ درویش اول نے یہ سب کام اس ہنرمندی سے کیا کہ ہم اسکی قابلیت کے قائل ہو گئے۔

چیانگ مائی کے شمال میں برما' لاؤس اور تھائی لینڈ کی سرحدوں کے ملاپ سے ایک تکون سی بن جاتی ہے جو گولڈن ٹرائی اینگل کے نام سے مشہور ہے۔ یہ ایک دشوار گزار پہاڑی علاقہ ہے۔ جہاں تک ان گھنے جنگلوں اور ندی نالوں کی کثرت کے سبب وہاں تک رسائی کا تعلق ہے تقریباً ناممکن ہے۔ یہاں صدیوں سے مختلف قبائل آباد ہیں جو افیون کی کاشت پر اپنا گزر اوقات کرتے ہیں۔ وہاں صرف دو ہی فصلوں کی کاشت ہوتی آئی ہے۔ کھانے کے لئے چاول اور کیش کیلئے افیون۔ ان قبائلی کاشتکاروں کے مطابق اگر وہ کوئی اور فصل کاشت کریں تو وہ انکے لئے عذاب جان بن جاتی ہے۔ کیونکہ اس فصل کو منڈیوں تک لے جانے کے لیے انہیں دشوار گزار پگڈنڈیوں سے گزر کر جانا پڑتا ہے اور یہ کئی دن کا تکلیف دہ سفر ہوتا ہے۔ مگر اس کے مقابلے میں اگر افیون کاشت کریں تو بیوپاری گھر بیٹھے رقم دے کر ساری فصل لے جاتے ہیں۔ پہلے پہل تو افیون کی کاشت صرف اس سہولت کے لئے کی جاتی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب صرف افیون ہی تھی کوکین نہیں بنی تھی۔ جب سے افیون کوکین بن کر فیشن ایبل نشہ بن گئی ہے اور اسے امریکہ اور یورپ کے نوجوانوں نے اپنایا ہے تب سے یہ کروڑوں کا کاروبار بن گیا ہے اور اس کاروبار میں انٹرنیشنل گینگ ملوث ہو گئے ہیں۔ امریکہ میں استعمال ہونے والی ۲۰ فیصد کوکین گولڈن ٹرائی اینگل سے آتی ہے۔ ویسے اس بدنامی میں پاکستانیوں نے بھی بڑا نام پیدا کیا ہے۔ دیر' باجوڑ اور فرنٹیر کی دوسری وادیوں میں اسکی کاشت ہوتی ہے اور لنڈی کوتل کی فیکٹریوں میں افیون سے کوکین بنائی جاتی ہے۔ سرحدیں اکثر ناجائز کاروبار کو جنم دیتی ہیں۔ جس طرح گولڈن ٹرائی اینگل نے اس کاروبار میں نام کمایا اسی طرح اب گولڈن کریسنٹ یعنی افغانستان' پاکستان اور ایران نے بھی بڑا کمال دکھایا اور اب ہر پاکستانی جب دنیا میں کسی ہوائی اڈے پر اترتا ہے تو اس سے چوروں کا سا سلوک کیا جاتا ہے۔ اکثر جامہ تلاشی لی جاتی ہے اور سامان پر باقاعدہ کتے چھوڑے جاتے ہیں۔ ملک سے باہر جو رسوائی ہوتی ہے وہ تو الگ ہے اصل المیہ تو ملک کے اندر شروع ہو گیا ہے۔

نشہ کھجور کا ہو یا انگور کا' پوست کا ہو یا بھنگ کا' جو کا ہو یا کوکین کا' چند لوگوں اور چند جگہوں تک محدود تھا۔ شراب کی باقاعدہ دکانیں تھیں اور افیون کے باقاعدہ ٹھیکے تھے۔ پھر قانوناً یہ سب کچھ ختم کر دیا گیا۔ اس معرکے میں عوامی رہنما بھی شامل تھے اور علمائے دین بھی۔ اب وہ کاروبار محدود سے لامحدود ہو گیا ہے۔ وہ دبا جو سربازار ہوتی تھی اب انڈر گراؤنڈ چلی گئی ہے۔ وہ چیزیں جنہیں حاصل کرنے کے لئے چوراہوں پر جانا پڑتا ہے اب چاردیواری میں میسر ہیں۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہاں تو یہاں ذکر گولڈن ٹرائی اینگل کے قبائل کا ہو رہا تھا جن میں سے ایک میو قبیلہ چیانگ مائی کے قریب پہاڑیوں پر آباد ہے۔ جہاں پہنچنے کیلئے ہم لوگ ایک جیپ میں سوار ہوئے۔ حسب معمول درویش اول نے جیپ کی اگلی سیٹ پر قبضہ جمایا اور ہمارا سفر شروع ہوا۔ شہر سے چند میل دور شاہی محل کے پہلو سے ایک سڑک مڑتی ہے جو پہلے پکی اور پھر کچی ہو جاتی ہے۔ جیپ کی پچھلی سیٹوں پر اچھلتے ہوئے ہچکولے کھاتے کچھ دیر تک تو یہ سفر جاری رہا اور پھر کچی سڑک بھی ختم ہوگئی۔ اب ایک پہاڑی پگڈنڈی سے میو گاؤں تک جانا تھا۔ جو درویش دوم کے لئے جان لیوا کام تھا۔ ویسے بھی درویش دوم کی سیاحت کا دائرہ بیشتر پاکستانیوں کی طرح شاپنگ پلازاؤں تک ہی محدود تھا۔ اور میو گاؤں تک جا کر اس نے گویا ہماری سات پشتوں پر احسان دھر دیا ہو۔ خدا خدا کر کے اس گاؤں میں پہنچے۔ لکڑی کے بنے چھوٹے چھوٹے گھر۔ چھوٹی چھوٹی آنکھوں والے چھوٹے چھوٹے لوگ۔ میو قبیلے کے اکثر مرد شکاری ہوتے ہیں اور ہمارے فرنٹیر کی طرح وہاں بھی بندوق مرد کا زیور سمجھا جاتا ہے۔ یہ تھائی لینڈ کا واحد علاقہ ہے جہاں مردوں نے مونچھیں رکھی ہوئی تھیں۔ ہمارے پٹھانوں کی طرح یہ لوگ بھی بڑے مہمان نواز واقع ہوئے ہیں۔ عورتوں نے گہرے نیلے رنگ کے لمبے لمبے جبے پہن رکھے تھے جن پر شوخ رنگوں کی کڑھائی کا کام کیا ہوا تھا۔ کانوں میں چاندی کے بندے اور بالیاں اور گردن میں رنگ برنگے منکوں کے ہار۔ سیاحوں کی کثرت کے سبب یہاں بھی تصویر اُتارنے کے پیسے دینے پڑتے ہیں۔ میو قبیلے کے لوگ بالکل ہمارے کلاش لوگوں سے مشابہت رکھتے ہیں۔ عادات' اطوار اور لباس تقریباً یکساں ہیں' رنگ و روپ میں البتہ بنیادی فرق ضرور ہے۔ کیونکہ ہمارے کلاش بڑے خوبصورت لوگ ہیں۔ مگر اس قسم کی اقلیتوں کے مسائل ساری کائنات میں ایک جیسے ہیں' چاہے وہ امریکہ کے ریڈ انڈین ہوں یا جنوبی امریکہ کے انکاز۔ تھائی لینڈ کے میو ہوں یا پاکستان کے کلاش۔ سبھی ترقی یافتہ تہذیبوں کا شکار ہو کر انسانی چڑیا گھروں میں بدل دیئے گئے ہیں۔ ہمارے ملک کے دو اڑھائی ہزار کلاش تو مذہبی اور تہذیبی ستم کا بری طرح سے نشانہ بنے ہیں۔ یہ لوگ ریاست چترال کی تین چھوٹی سی وادیوں رمبور' بمبوریت اور بریر میں آباد ہیں اور صدیوں سے آباد ہیں۔ اسی طرح کی کچھ وادیاں افغانستان میں بھی تھیں جہاں پر یہ لوگ آباد تھے۔ افغان تو بنیادی طور پر تہذیب و تمدن کے لٹیرے ہیں' جنکی درندگی پر تاریخ نادم ہے۔ چنانچہ زور شمشیر کی افغان تہذیب نتھے کلاشوں پر حاوی آئی اور وہ وادیاں نورستان میں بدل دی گئیں۔ کچھ یہی حشر ہمارے کلاشوں کا ہو رہا ہے جو مختلف قسم کی یلغار کا شکار ہیں۔ ان وادیوں میں داخل ہونے سے پہلے ایون کا قصبہ ہے۔ اس قصبے کے لوگ بہت عیار ہیں۔ معصوم کلاش ان کی عیاری کا شکار ہیں۔ ان عیاروں نے چند بکریوں کے عوض ان کی زمینیں اور چند سکوں کے عوض انکے صدیوں پرانے اخروٹ کے درخت ہتھیا لئے ہیں۔ اب زمینوں پر بھی ان کا قبضہ ہے اور باغات پر بھی۔ اہل ایون کی عیاری' ظلم کا صرف ایک پہلو ہے۔ اصل مسئلہ تو تنگ نظر مُلّا کا اسلام ہے۔ جو ان چند لوگوں پر دائرہ حیات تنگ کرتا جا رہا ہے۔ وہ محمدؐ کا اسلام۔ سلامتی' رحم دلی' بردباری' انصاف' امن اور رواداری کا اسلام کہاں ہے؟ کیا محمدؐ کے اسلام میں اقلیتوں کے لئے کوئی گنجائش نہ تھی؟ اگر تھی تو پھر خدارا کلاشوں کو مُلّا کے تنگ نظر اسلام سے بچایئے۔ قبل اس کے کہ انکا وجود افغانستان کی طرح یہاں بھی ختم ہو جائے اور ہم لوگ تاریخ کے کٹہرے میں مجرموں کی طرح پیش ہوں۔

تھائی لینڈ کے میو قبیلوں کو نہ مُلّا کا خوف ہے اور نہ ایون کے عیاروں کا۔ ان ہنس مکھ لوگوں کے ساتھ ہماری لمبی ملاقاتیں رہیں۔ درویش اول نے تو انکے کھانے کی دعوت بھی قبول کر لی جو جیپ ڈرائیور سمیت ہم نے مل کر کھایا۔ کھانے سے فارغ ہوئے تو سیدھے چیانگ مائی کے ہوائی اڈے کی راہ اختیار کی' جہاں سے جہاز پکڑ کے بنکاک جانا تھا اور وہاں سے سیدھا سنگاپور پہنچنا تھا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

سنگاپور

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"------ جیون میں ایک بار آنا سنگاپور---- دیکھو جی دیکھو----"
درویش دوم کے بے ڈھنگے ہاتھ نے میرا منہ بند کر دیا اور درویش اول نے کہا "بابا کوئی خطا ہوگئی ہو تو بخش دو---- ہمیں کس جرم کی سزا دے رہے ہو جو بنکاک سے دماغ کھانا شروع کر رکھا ہے"۔ میں نے تلملا کر کہا--- "جو تمہارا دماغ کھائے گا اس کو تو فاقہ ہی ہو گا۔" درویش دوم نے میرے تازہ ترین زخموں پر نمک چھڑکتے ہوئے کہا۔ " تمہارا گلا کاٹنے کے قابل تو ہے گانے کے قابل ہرگز نہیں۔" مجھے مجبوراً ان بد ذوقوں کی وجہ سے اپنا سنگیت بند کرنا پڑا۔ میں نے دل بہلانے کے لئے ایئر ہوسٹس کو بلایا اور اس سے باتیں شروع کردیں ہماری گفتگو میں باتیں کم اور قہقہے زیادہ تھے۔ جب درویشوں کے بیزار چہروں پر رونق کے آثار نمودار ہونے لگے اور وہ منہ سنوار کر ایئر ہوسٹس سے کچھ بات کرنا ہی چاہتے تھے تو میں نے اسے "خدا حافظ" کہہ کر جانے دیا۔ میری اس بات سے دونوں درویش ناراض ہوگئے اور منہ بسورے ہزماسٹرز وائس His Masters Voice کا ٹریڈ مارک بن کر بیٹھ گئے۔ پھر سنگاپور تک ہمارا سفر ایسا خاموش اور باادب گزرا جیسے پورے راستے قومی ترانہ بجتا رہا ہو۔

جہاز بادلوں کے آنچل کو ہٹاتا ایئرپورٹ پر اترنے کے لئے نیچی پرواز کرنے لگا۔ میں نے دونوں درویشوں کے لوازمات کے سپیئر پارٹس' جن میں تھرماس' کیمرہ اور شیونگ کا سامان تھا' اپنے گلے کا ہار بنانے شروع کئے۔ دوسرے مسافروں نے بھی دستی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

سامان اسطرح مضبوطی سے اپنے دست راست میں تھام لیا' گویا وہ ایسا نہ کرتے تو جہاز کا عملہ اس سامان کو لے اڑتا۔ اب دونوں درویشوں نے میرے ساتھ سفارتی تعلقات بحال کرنے کی کوشش شروع کر دی۔ کیونکہ اب میری زبان درازی ان کے کام آنی تھی۔

ہوٹلوں کے بارے میں تفصیل معلوم کرنا' کسٹم والوں سے دو دو ہاتھ کرنا' ٹیکسی تک سامان اٹھانا اور پھر کرایہ طے کرنا یہ سب میرے فرائض تھے۔ سب سے پہلے پولیس کا سامنا ہوا۔ انھوں نے پاسپورٹ سے زیادہ واپسی کے ٹکٹ کو دیکھا اور ایک ہفتے کی سیاحت کے لئے ویزے کا ٹھپہ وہیں لگا دیا۔

کسٹم والوں نے صرف زبانی حساب کتاب لیا۔ ہم نے جو کہا اس پر اعتماد کیا۔ سب سے حیران کن بات یہ تھی کہ کسٹم والے مسکرا رہے تھے اور سیاحوں سے گپیں ہانک رہے تھے۔ بھلا کسٹم والوں کا کیا کام ہے جو مسکرائیں اور سیاحوں سے سمگلروں کا سا سلوک نہ کریں۔ کسٹم کے شریفانہ رویئے نے ہمارے اوپر سنگاپور کا بہت اچھا تاثر چھوڑا' مگر وہیں ایک اور دلچسپ حادثہ بھی پیش آیا۔ اس حادثے کا شکار تینوں درویش نہیں بلکہ دو ہپی تھے۔ سنگاپور کی حکومت کی طرف سے سنگاپور میں ہپیوں کا داخلہ ممنوع ہے۔ اسی جہاز سے ایک ہپی اور ایک ہپنی بھی سفر کر رہے تھے۔ انہیں پولیس نے روک لیا۔ ایئرپورٹ پر ایک ہجوم اکٹھا ہو گیا۔ ان کے داخلے کی شرط یہ رکھی گئی کہ وہ بال کٹوائیں۔ مگر ہپی تو اپنے لمبے اور غلیظ بالوں کو سیمسن کے بال سمجھتے ہیں۔ بال کٹنے سے تو ان کے اصولوں کی توہین تھی۔ بھلا وہ اپنے اصولوں پر کسی حکومت کے قانون کو کیسے چلنے دیتے۔ مگر ظالم پولیس والوں نے دو مجبور ہپیوں کے بالوں پر اپنے قانون کی قینچی چلا دی۔ ان کی سنہری اور خمدار زلفیں کٹ کر ان کے خستہ حال دامن میں آگریں۔ ہجوم کے قہقہوں میں ان مجبوروں کی سسکیاں سننے والا کوئی نہ تھا انہوں نے اپنے ویران اصولوں کی یاد کو سمیٹا۔ بے بس اور پرنم آنکھوں سے ہجوم کو دیکھا' اپنے رک سیک کندھوں پر اٹھائے اور چپ چاپ ایئرپورٹ سے باہر نکل گئے۔

ہپیوں کے بال کٹنے پر درویش اول سب سے زیادہ خوش نظر آرہا تھا اور زور زور سے قہقہے لگا رہا تھا۔ شاید اس لئے کہ اسے اپنے بال کٹنے کا کوئی خطرہ نہ تھا۔ ادھر دیکھا تو درویش دوم غائب تھا۔ درویش اول کو سامان کے پاس کھڑا کر کے اس کی تلاش شروع ہوئی۔ وہ ایک ستون کے پیچھے چھپا کھڑا تھا۔ میں نے پوچھا "یہ آنکھ مچولی کھیلنے کا کون سا وقت ہے؟" درویش دوم نے معصومیت سے کہا۔ "یار! پولیس والے بال کاٹ رہے تھے میں نے سوچا کہیں مفت میں حجامت نہ ہو جائے"۔

میں نے جل کر کہا۔ "چھوڑ یار۔ بال ہپیوں کے کٹ رہے ہیں' بھالوؤں کے نہیں۔ تمہیں کیا خطرہ۔"

ہوائی اڈہ ہر ملک کی ترقی کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ سنگاپور کے ایئرپورٹ کو دیکھ کر بخوبی اندازہ ہوجاتا ہے کہ ملک خوشحال ہے۔ قومی ہوائی کمپنی سنگاپور ایئرلائینز کے علاوہ درجنوں بین الاقوامی ہوائی کمپنیوں کے جیٹ طیارے سنگاپور کی فضا میں چنگھاڑتے رہتے ہیں۔ ایئرپورٹ بلڈنگ کے اندر ہوٹل کی معلومات کے کاؤنٹر پر بھی درجن لڑکیوں کی طرف رجوع کیا۔ اپنا بجٹ بتا کر ہوٹل کے متعلق مشورہ لیا۔ انہوں نے کنگز ہوٹل King Hotel میں ٹھہرنے کو کہا۔ ہم نے کمپیوٹر دماغ درویش کی طرف دیکھا تو وہ آنکھیں بند کئے منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑا رہا تھا۔ جب اس نے آنکھیں کھولیں تو ان میں ایک خاص قسم کی روشنی تھی۔ ہم سمجھ گئے کہ گیان ہو گیا ہے۔ کمرے بک کرائے اور ٹیکسی سٹینڈ کی طرف جانے لگے۔

ایک باوردی قلی نے آگے بڑھ کر سامان اٹھانے کی پیشکش کی تو درویش اول نے میری طرف معنی خیز نگاہوں سے دیکھتے ہوئے اسے منع کر دیا۔ گویا بات اب مجھ بے وردی قلی تک آپہنچی تھی۔ سامان اٹھانے پر تو مجھے کوئی خاص اعتراض نہ تھا مگر حسینوں کے جھرمٹ میں ایسی بے حرمتی قدرے کھل رہی تھی۔ مگر پھر سوچا کہ دانہ خاک میں مل کر گل گلزار ہوتا ہے۔ گلزار ہونے کی خاطر میں نے دونوں درویشوں کا سامان اٹھایا اور یہ دونوں حسب عادت مٹک مٹک کر چلنے لگے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ٹیکسی والے نے میٹر گھمایا تو سر چکرا گیا۔ مگر یہ تسلی کی بات تھی کہ پیسے صرف وہی ادا کرنے ہونگے جو میٹر پر ہونگے۔ یہ الگ بات ہے کہ میٹر کے ہندسے بڑھانے کے لئے ٹیکسی ڈرائیور صراط مستقیم پر چلنے کے بجائے گمراہ ہو جائے۔ میٹر کی ٹک ٹک اور دل کی دھک دھک برابر جاری تھی۔ میں نے دل کی دھڑکنوں کو بہلانے کے لئے گاڑی سے باہر نگاہیں دوڑانی شروع کر دیں۔ جہاں ہوائی اڈے کی سڑک مین روڈ پر داخل ہوتی ہے۔ اس چوک میں ایک بہت بڑا فوارہ ہے جس کے ابلتے ہوئے پانی پر برقی قمقموں کی روشنیاں عجب رنگ بکھیر رہی تھیں۔ اس وسیع اور ہموار سڑک کے دونوں جانب سبزہ زار میں درخت قطار در قطار کھڑے تھے۔ سڑک پر روشنیاں اس قدر تیز تھیں کہ کار کی روشنی کی چنداں ضرورت نہ تھی۔ مگر کاروں کی روشنیوں کا کارواں رواں دواں تھا۔ شہر کی حدود میں داخل ہوئے تو احساس ہوا کہ جیسے ایبٹ آباد پہنچ گئے ہوں۔ درختوں کے جھرمٹ میں وہی سرخ اور ڈھلان چھتوں والے مکان' وہی سڑکوں کی اونچائی اور نچائی۔ مگر سنگاپور کے کچھ حصے ہی اس طرح کا منظر پیش کرتے ہیں زیادہ تر شہر میدان میں سمندر کے کنارے واقع ہے۔ اس ٹیکسی میں میٹر کے سوا سب خاموش تھے۔ ڈرائیور نے تو چپ سادھ رکھی تھی۔ نہ بنکاک کے ڈرائیوروں کی طرح لڑکیوں کا تذکرہ نہ سونا باتھ کا ذکر۔ بس اک طویل خاموشی۔ ہم نے سنگاپور سے جو امیدیں باندھ رکھی تھیں وہ ٹوٹنے لگیں۔ شہر کے ایک چوک سے گزرے تو مسجد کے مینار دکھائی دیئے۔ نمازیوں کو دیکھا تو یاد آیا کہ ماہ رمضان ہے۔ مگر ہم لوگ تو سفر میں تھے اور سفر میں روزے معاف ہوتے ہیں۔

کنگز ہوٹل کے سامنے ٹیکسی رکی۔ میٹر کی ٹک ٹک بند ہوئی تو دل دھک دھک سے تک دھنا دھن کرنے لگا۔ ہم نے ٹیکسی سے قدم باہر رکھا ہی تھا تو تین باوردی مشٹنڈے ہم پر شکروں کی طرح جھپٹے۔ اور وہ سامان جسے میں اکیلا اٹھا لایا تھا اسے اس انداز میں اٹھایا جیسے پہاڑ اٹھا لیا ہو۔ ہوٹل کے دروازے پر سرخ قالین پر قدم جمانا تھا کہ شیشے کا دروازہ خود بخود ایسے کھل گیا جیسے کسی جادوگر نے کہہ دیا ہو

"کھل جا سم سم"۔ کاؤنٹر پر کھڑی لڑکیوں کے گچھے سے ملاقات ہوئی۔ ان میں سے ہر ایک نے ایک ایک عدد مسکراہٹ سے نوازا۔ گویا مسکراہٹوں کی نمائش ہو رہی تھی اس گچھے کا ہر دانہ بے داغ تھا۔ میں نے کمروں کی چابیاں وصول کیں اور لفٹ کے ذریعے ہوٹل کی گیارہ منزلوں میں سے سات منزلوں کو طے کیا اور اپنے کمرے میں جا پہنچے۔ یہ ہمارا معمول تھا کہ ہم ہمیشہ دو کمرے بک کراتے تھے۔ ایک کمرے میں دو درویش اور دوسرے میں ایک درویش ہوتا ہے۔ دراصل ان دونوں درویشوں میں سے ایک کا ساتھ نبھانا بھی کچھ میری ہی ذمہ داری بن گئی تھی۔ اب سنگاپور میں مجھے خراٹوں والے درویش دوم کے کمرے میں رہنا تھا۔

ہم نے جلدی جلدی اپنے گرد آلودہ چاند سے مکھڑوں کو جھاڑ پونچھ کر اس قابل کیا کہ کسی کو منہ دکھا سکیں۔ تیار ہونے کے سلسلے میں درویش اول کی ایک بات قابل تعریف تھی کہ وہ تیاری میں پانی سے زیادہ یوڈی کلون اور آفٹر شیو لوشن استعمال کرتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ہمیں کوئی خوشبو لگانے کی ضرورت ہی پیش نہ آتی تھی۔ سب سے جلدی میں تیار ہوتا تھا کیونکہ میں تو بچپن سے اسی مقولے پر سختی سے عمل کرتا رہا ہوں کہ شیروں کا منہ کس نے دھویا ہے۔

سنگاپور مشرق کا واحد شہر ہے جس کا صفائی کے لحاظ سے سوئٹزرلینڈ کے کسی بھی شہر سے مقابلہ کیا جاسکتا ہے۔ سنگاپور میں بھی بارش تو بنکاک کی طرح ہوتی ہے مگر یہاں سڑکوں پر پانی نہیں کھڑا ہوتا۔ سڑکوں کے دونوں جانب فٹ پاتھ کے نیچے نالیاں بنی ہیں جن میں پانی بہہ جاتا ہے۔ چائنا ٹاؤن پہنچے تو معلوم ہوا کہ سنگاپور کے اجلے دامن میں بھی غلاظت کے داغ موجود ہیں۔ چائنا ٹاؤن میں تمام پرانی آبادی ہے اور قدیم سنگاپور (جب یہ صرف مچھیروں کا گاؤں تھا) اسی جگہ آباد تھا۔ اب بھی اس کی گلیاں تنگ اور تاریک ہیں۔ سڑکوں پر غلاظت کے ڈھیر بھی نظر آتے ہیں اور غربت بھی۔ مگر یہ احساس شدت سے ہوتا ہے کہ مشرق کی یہ یادیں بہت جلد ترقی کے ہاتھوں شکست کھا جائیں گی۔ سنگاپور میں بہت سی جگہوں پر پرانی آبادیوں کو مسمار کر

کے نئی عمارتیں تعمیر کر دی گئی ہیں۔ اسی طرح ایک دن چائنا ٹاؤن کی چہل پہل بھی ٹاؤن پلیننگ کا شکار ہو جائے گی۔

ایک ہوٹل کے سامنے ہجوم دیکھا تو وہاں پہنچ گئے۔ گوشت تلا جا رہا تھا۔ یہ شاید سنگاپور کا بندو خاں ہو۔ تبھی تو اتنا رش تھا۔ میں نے درویش اول سے بڑے پیار اور ادب سے کہا "جلدی سے چار پانچ پلیٹ کا آرڈر دیدو"۔ درویش اول نے کہا "تمھیں معلوم ہے یہ کس چیز کا گوشت ہے؟" میں نے لا پروائی سے کہا "اس وقت تو بڑا گوشت بھی چل جائے گا"۔ درویش اول نے چلا کر کہا "ارے یہ سانپ کا گوشت ہے"۔ "سانپ کا!" میرا جسم ٹھنڈا ہونے لگا۔ بھوک غائب۔ سامنے شوکیس میں مختلف قسموں کے سانپ لٹکے ہوئے تھے۔ وہاں زندہ سانپ بھی موجود تھے تاکہ گاہکوں کے سامنے سانپ ہلاک کر کے انھیں تازہ گوشت کھلایا جاسکے۔ ایک بڑے سے چمٹے میں سانپ کو جکڑ کر اس کا گلا دبا دیا جاتا ہے۔ جب سانپ مرجائے تو اس کی گردن اور دم علیحدہ کر دی جاتی ہے کیونکہ اس میں زہر ہوتا ہے۔ پھر سانپ کا پیٹ چاک کر کے اس کی کھال اتارلی جاتی ہے اور گوشت کے ٹکڑے مچھلی کے ٹکڑوں کی طرح تل کر لوگ چٹخارے لے لے کر کھاتے ہیں۔ اس خوراک کو دیکھ کر بھوک تو ختم ہوئی سو ہوئی البتہ خوف طاری ہوگیا۔ رات بھر سانپوں کے خواب آتے رہے۔

ٹیماسک (سمندری شہر) سنگاپور کا اس زمانہ کا نام ہے جب یہ صرف مچھیروں کا گاؤں ہوتا تھا۔ اس کا موجودہ نام اسے ساٹرا کے شہزادے نیلا اتمانے دیا۔ کہتے ہیں یہ شہزادہ فتوحات کی غرض سے بحری بیڑا لے کر نکلا۔ اس جزیرے کے قریب پہنچا تو ساحل پر اسے ایک عجیب و غریب جانور دکھائی دیا۔ اس کے مشیروں نے اس جانور کا نام سنگھا یعنی شیر بتایا۔ شہزادے نیلا اتمانے اسی جگہ پر اپنے جہازوں کو لنگر انداز ہونے کا حکم دیا۔ شہر کی بنیاد رکھی اور اس کا نام سنگاپور (شیر کا شہر) تجویز ہوا۔ گو سنگاپور کے گھنے جنگلوں میں شیر کا وجود عقل تسلیم نہیں کرتی۔ نہ ہی شہزادے اور اس کے مشیروں کے علاوہ کسی نے اس جزیرے میں کوئی شیر دیکھا مگر آج تک اس شہر کو اسی نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ سنگاپور نے خاندان سری وجیا کے دور میں خوب ترقی کی' مگر ۱۳۷۷ء میں جاوا کی فوجوں نے سری وجیا خاندان کو تباہ کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی سنگاپور کی اہمیت ختم ہوگئی اور یہ جزیرہ سمندری لٹیروں کا مرکز بن گیا۔ ان بحری قزاقوں نے گرد و نواح کے سمندروں پر اپنا تسلط جما لیا تھا۔ اس طرف سے گزرنے والے تجارتی جہاز ان لٹیروں کو ٹیکس ادا کر کے ادھر سے گزرتے تھے۔ آہستہ آہستہ اس جزیرے پر سلطان حسین محمد شاہ کا قبضہ ہوگیا۔ ۱۸۱۹ میں سر ریفلز نے برطانیہ کے لئے جنوب مشرقی ایشیا میں بندرگاہ کی تلاش شروع کی تو اس کی نظر انتخاب سنگاپور پر پڑی۔ سر ریفلز نے سلطان سے معاہدہ کر کے سنگاپور اور اس کے ارد گرد ۱۰ میل تک کے جزیروں کو سرکار برطانیہ کے چنگل میں پھنسا لیا۔ اپنی جغرافیائی پوزیشن کی وجہ سے سنگاپور کی بندرگاہ آسٹریلیا سے انگلستان تک جانے والے تجارتی جہازوں کے لیے ایسا مقام تھا جہاں ان کا رکنا لازمی تھا۔ چنانچہ تھوڑے ہی عرصہ میں سنگاپور نے ملاکا اور پینانگ کی بندرگاہوں کو مات کر دیا۔ دوسری جنگ عظیم میں جاپانیوں نے سنگاپور پر قبضہ جمالیا اور اتحادیوں کے تقریباً آٹھ ہزار فوجیوں نے یہاں ہتھیار ڈال دیئے۔ جاپانیوں کی شکست کے بعد ایک بار پھر یہ جزیرہ برطانیہ کے قبضے میں چلا گیا۔ لیکن اب غلام دنیا میں آزادی کے نعرے بلند ہو رہے تھے۔ ۱۹۴۵ سے ۱۹۶۵ تک سنگاپور مختلف ادوار سے گزرا اور آزادی کی جدوجہد جاری رہی۔

۳۱ اکتوبر ۱۹۷۱ کی صبح توپوں کی گھن گرج نے درویش دوم جیسے مست بندے کو بھی چونکا دیا۔ توپوں کی آواز اور گھمبیر ہوتی گئی اتنے میں درویش اول شلوار پہنے' گلے سے ننگا' ڈبل روٹی کا سا پیٹ نکالے کمرے میں آیا۔ خوف سے اس کی قلیل زلفیں اٹینشن کھڑی تھیں۔ اس نے خوفزدہ نگاہوں سے ہماری طرف دیکھا تو ہم پہلے ہی بستر میں مورچے سنبھالے بیٹھے تھے۔

ریڈیو سنگاپور سے اس الوداعی پریڈ کا آنکھوں دیکھا حال نشر ہونے لگا تو ہمیں کچھ تسلی ہوئی۔ ۱۵۲ سال کے قبضے کے بعد برطانیہ کی فوجیں ہمیشہ کے لئے سنگاپور سے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

روانہ ہو رہی تھیں۔ برطانیہ کا آفتاب اپنی کرنیں سمیٹ کر مغرب کی جانب لوٹ رہا تھا۔ سامراجیت کے جنازے کو بڑی دھوم سے اٹھایا جا رہا تھا۔ ہم مشرق والے بھی کتنے عجیب ہیں' صدیوں تک مغرب والوں کے ستم کا شکار رہے ہیں' ان ستمگروں کو ملک سے نکالنے پر خوشی کے شادیانے بھی بجاتے ہیں مگر نہ جانے کیوں کچھ عرصہ بعد ان کے بغیر اداسیاں چھا جاتی ہیں اور مختلف بہانوں سے انہیں واپس بلا لیا جاتا ہے۔

درویش اول نے اپنے ذوق سیاحت کی تسکین کے لئے پیدل سیر کی ٹھانی۔ مگر ہم تینوں کی رفتار میں بنیادی فرق تھا۔ چنانچہ درویش دوم اپنی کچھوے جیسی چال کے سبب سب سے پیچھے ہوتا۔ درویش اول کی چال کے بارے میں تو میں پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ بالکل ایسے تھی جیسی جاپانی کھلونے کو چابی بھر کے چھوڑ دیا جائے۔ لہٰذا وہ تیز تیز قدم اٹھاتا بہت آگے نکل جاتا۔ دونوں درویشوں کے درمیان رابطہ قائم رکھنا میرا فرض تھا۔ اس لئے میں بھاگ کر کبھی درویش اول کے پاس پہنچتا اور کبھی درویش دوم کے پاس۔ یہ سلسلہ کچھ دیر جاری رہا۔ ہم خزاں کے پتوں کی طرح ادھر ادھر بھٹکتے رہے۔ سنگاپور میں پیدل چلنے والوں کے لئے ایک بہت بڑی سہولت ہے جس کا درویش اول نے بڑی شدت سے استعمال کیا۔ ہر چوک میں زیبرا کراسنگ کے ساتھ پول پر بٹن لگا ہوتا ہے۔ جب کوئی بوڑھا' بچہ یا لاغر قسم کا شخص سڑک پار کرنا چاہے تو وہ بٹن دبا دے۔ اس طرح ٹریفک کی بتی میں لال اشارہ ہو جائے گا۔ ٹریفک تھم جائے گی اور پیدل لوگ جان کی بازی لگائے بغیر ہی سڑک پار کر سکتے ہیں۔ درویش اول کے لیے عام حالات میں سڑک پار کرنا اتنا ہی مشکل تھا جتنا نپولین کی فوجوں کے لئے آبنائے برطانیہ British Channel عبور کرنا' مگر اب تو بٹن دبا کر کبھی سڑک کے اِس پار اور کبھی اُس پار۔ جب وہ سڑک پار کر رہا ہوتا تو اس کے سپاٹ چہرے پر فتح و کامرانی کے کچھ ایسے ہی تاثرات دکھائی دیتے جیسے امریکہ دریافت کرنے کے بعد کولمبس کے چہرے پر ظاہر ہوئے ہوں گے۔

سنگاپور کی سڑکوں پر گندگی' گداگر' مکھی اور دھول دکھائی نہیں دیتی۔ یہی چار

چیزیں ہیں جن کا ہماری سڑکوں کے ساتھ قریبی تعلق ہے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ ہمیں سنگاپور کی صاف' شفاف سڑکیں سونی سونی دکھائی دے رہی تھیں۔ درویش دوم نے اکتا کر کہا۔ "چلو یار ان سڑکوں پر کیا رکھا ہے۔ ٹائیگر بام گارڈن دیکھنے چلتے ہیں"۔ ہم ٹیکسی میں سوار ہوئے اور ساحل کے ساتھ ساتھ ٹائیگر بام گارڈن کا رخ کیا۔ سڑک کے بائیں جانب مالاکا بے کے نیلگوں سینے پر ہچکولے کھاتے جہاز حد نظر تک پھیلے ہوئے تھے۔ دائیں جانب سبزہ زار سے ڈھکی اور ناریل کے پیڑوں میں چھپی اونچی نیچی پہاڑیاں تھیں۔ اب ہم جدید سنگاپور سے نکل کر قدیم سنگاپور سے گزر رہے تھے۔ پہاڑی ڈھلانوں پر بنے لکڑی کے چھوٹے چھوٹے غلیظ گھروں کے سامنے مچھروں کے جال لٹک رہے تھے۔ ننگ دھڑنگ بچے دنیا سے بے خبر اپنی ہی دنیا میں کھوئے ہوئے ان غلیظ گھروں کے آنگن میں کھیل رہے تھے۔ سڑک کا ایک موڑ مڑتے ہی ٹائیگر بام گارڈن کا مین گیٹ دکھائی دیا۔

ٹائیگر بام گارڈن ایک چینی رئیس کی تخلیق ہے۔ ٹائیگر بام دراصل ایک مرہم کا نام ہے جو جوڑوں اور پٹھوں کے درد کا بہترین علاج ہے۔ یہ مرہم ایک چینی رئیس کی فیکٹریوں میں تیار ہوتا ہے۔ جس نے اس مرہم کی شہرت کے لئے یہ باغ بنوایا ہے۔ اسی نام کا ایک باغ ہانگ کانگ میں بھی میں نے دیکھا۔ مگر سنگاپور کا گارڈن بہت وسیع ہے۔ باغ کا جو تصور عام ذہن میں آتا ہے یہ باغ بالکل اس سے مختلف ہے۔ کیونکہ اس باغ میں روایتی پھلدار درخت اور پھولوں کے پودے نہیں دکھائی دیتے۔ بلکہ چٹانوں کو کاٹ کر مجسمے تراشے گئے ہیں جو مختلف کہانیوں کی عکاسی کرتے ہیں۔ ان میں بیشتر کہانیاں چینی دیومالا سے لی گئی ہیں۔ چٹانوں سے تراشے ہوئے مجسموں کو قدرتی رنگ دیئے گئے ہیں۔ مجسموں کے اردگرد کہانی کے مطابق مناظر پیش کئے گئے ہیں تاکہ دیکھنے والے کو یہی احساس ہو کہ کردار معمول کے مطابق روزمرہ کی زندگی گزار رہے ہیں۔ وہیں ایک بہت ہی دلچسپ منظر کی عکاسی کی گئی ہے جس میں دکھایا گیا ہے کہ کیسے انگریزوں نے اس علاقے پر قبضہ کیا' پھر کس طرح یہاں کے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

باشندوں کو غلام بنا کر رکھا۔ جس نے آزادی کا نعرہ لگایا اسے زنجیروں میں جکڑ دیا اور کوڑوں کی سزا دی۔ دو گھنٹے کی مسلسل سیر کے بعد ہم تھک ہار کر ہوٹل کو چل دیئے۔

سنگاپور کو ایشیائے خوبرو Mini Asia کہا جاتا ہے کیونکہ یہاں ایشیا کی مختلف نسلوں، ملکوں، مذہبوں اور زبانوں کے لوگ مل جل کر رہتے ہیں۔ اس ملاپ نے سنگاپور کو ایشیا کا شوکیس بنا دیا ہے۔ چنانچہ سال بھر کوئی نہ کوئی تہوار جاری رہتا ہے۔ تہوار چاہے کسی مذہب سے تعلق رکھتا ہو اس میں سبھی لوگ شریک ہوتے ہیں۔ کسی سیاح کو ایشیا کی تمام نسلوں کو بریک نگاہ دیکھنا ہو تو وہ سنگاپور میں شام کے وقت ایلزبتھ واک پر چلا جائے۔ اس سیرگاہ میں سکھ سردار بھی دکھائی دیں گے اور چینی بھی۔ یہ پارک سمندر کے کنارے سمندر کی سطح سے کوئی دس فٹ اونچا ہے۔ سمندر کی لہریں پارک کی پتھریلی دیواروں سے ٹکراتی رہتی ہیں اور اس کی نمکین ہوائیں ناریل کے پیڑوں پر سرگوشیاں کرتی رہتی ہیں۔ ادھر پارک میں ریلوے پلیٹ فارم کا منظر ہوتا ہے جہاں خوانچہ فروشوں کی صدائیں بچوں کا شور اور بڑوں کے قہقہے بلند ہو رہے ہوتے ہیں۔ ہم اس منظر سے اپنے آپ کو مانوس کر ہی رہے تھے کہ ایک صاحب تشریف لے آئے۔ ان کی دھوتی اور تلک اس بات کا ثبوت تھا کہ وہ ہندو ہیں۔ انھوں نے ہمیں سمندر کے کنارے ایک مقام پر لا کھڑا کیا اور کہا کہ آنکھیں بند کر کے سمندر میں تین سکے پھینک کر کوئی تمنا کیجئے! ایک مراد پوری ہو جائے گی "درویش دوم نے جھٹ کہا کہ تین سکوں سے تین مرادیں پوری ہونی چاہئیں"۔ درویش دوم کی مرادوں کا کیا ہوا' اس کی مجھے خبر نہیں۔ میں نے تو ایک ہی آرزو کی تھی وہ پوری ہوگئی۔ وہیں پر چھوٹے چھوٹے ہوٹل ہیں جہاں چٹ پٹی چیزیں ملتی ہیں۔ وہاں ایک مدراسی کے ہوٹل میں ہم نے بہاری کباب کھائے اور ناریل کا پانی پیا۔ وہاں تکے کباب قسم کی چیزیں بھی ملتی ہیں جنھیں سیاح بڑے شوق سے کھاتے ہیں۔

بنکاک کی رنگین راتوں کا ساتھ نبھانے کے بعد سنگاپور میں سرشام سو رہنا یہاں کی راتوں کے ساتھ سراسر ناانصافی تھی۔ رات کو نو بجے ہوٹل سے نیچے اترے۔

کاؤنٹر کے پیچھے سجی ہوئی محترمہ کو ایک عدد سلام اور دو عدد مسکراہٹوں سے نوازا۔ پھر بڑے رازدارانہ انداز میں پوچھا۔ "بی بی! اس وقت سیر کے لئے کونسی جگہ مناسب ہے؟" محترمہ نے مجھ سے بھی زیادہ رازدارانہ انداز میں آہستہ سے کہا۔ "روسی ٹریکٹروں کی نمائش لگی ہوئی ہے وہ دیکھ لیجئے۔" بھلا روسی ٹریکٹروں کو دیکھنے کے لئے سنگاپور آنے کی کیا ضرورت تھی۔ لڑکی نے میرے چہرے پر بیزاری کے آثار دیکھ کر کہا۔ "آپ لوگ بوگی سٹریٹ چلے جائیں"۔ "وہاں کیا ہوگا"؟ میں نے بے چینی سے پوچھا۔ "وہاں روسی ٹریکٹر نہیں ہونگے" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

رات جوان تھی اور درویش جوان تر۔ ہم شیروں کی طرح دہاڑتے ہوئے بوگی سٹریٹ پہنچے۔ وہاں کیا پہنچے کہ گویا کسی زنانہ جزیرے میں پہنچ گئے ہوں۔ ہر طرف بھڑکیلی چمکیلی لڑکیاں۔ آگے پیچھے لڑکیاں' ہزاروں من لڑکیاں' ادھر ادھر لڑکیاں' ہزاروں من لڑکیاں اوپر نیچے لڑکیاں' ہزاروں من لڑکیاں خیر ایسی بھی کوئی بات نہ تھی۔ ہمارے پیشوا درویش اول نے ہم دونوں درویشوں کی جگہ دو غنچہ دہن گلبدن درویشانیاں سنبھالیں اور بوگی سٹریٹ کے ایک بار میں مورچہ سنبھال کر بیٹھ گئے۔ درویش دوم کے سفید و سپاٹ چہرے پر ایک رنگ آرہا تھا ایک جا رہا تھا۔ جلتے بجھتے نیون سائینوں کے رنگ' اٹھتے بیٹھتے جذبات کے رنگ اور آخر میں بھی رنگ رلیاں منانے میں مشغول ہوگیا۔ میں نے بھی طوطا چشمی اور چشم پوشی کا چشمہ اتار اور اسی حمام میں کود گیا جس حمام میں سب ننگے تھے۔

کیمروں کی فلیش گنوں سے آنکھیں چندھیا رہی تھیں۔ مغربی موسیقی پر مشرقی جسم تڑپ رہے تھے۔ بار میں سجی رنگ برنگی بوتلوں میں بند جن نکل کر انسانوں کو چڑھ گئے تھے۔ انسان اپنی فطری آزادی کا بھرپور مظاہرہ کر رہے تھے۔ اس مادر پدر آزاد ماحول میں درویشوں کو دیکھا تو وہ زلفوں کی چھاؤں اور بانہوں کی قید میں تھے۔ درویش اول کو دیکھا تو رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ اسکے سر کے چٹیل میدان پر خون کا سیلاب آیا ہوا تھا۔ چکن دل درویش اول تو خون خرابے سے دور بھاگتا تھا' مگر وہ خون سے لت

www.iqbalkalmati.blogspot.com

پت سر سے بے خبر' جوان ابلتے قہقہوں میں ڈبکیاں لگا رہا تھا۔ مَیں نے گرگٹ رنگ درویش دوم کی توجہ خون آلود سر کی طرف دلائی تو اس نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ "ارے طوطا چشم .... ذرا چشمہ لگا کے دیکھو ...." خیر ہم نے بغیر چشمے کے ہی دیکھا اور بڑے غور سے دیکھا تو معلوم ہوا جسے ہم خون سمجھے تھے وہ جواں لبوں کی سرخی تھی جو شدت جذبات میں لڑکیوں نے درویش اول کے گلوب پر مختلف" میک اپ" کمپنیوں کی لپ سٹکوں کے اشتہار سجا دیئے تھے۔

کمپیوٹر دماغ درویش دوم سب سے بازی لے گیا۔ مشرق بعید میں مردوں کے جسم پر بال نہیں ہوتے۔ گویہ بات وہاں مقیم سکھوں پر صادق نہیں آتی اور درویش دوم کے سامنے بھالو بھی کلین شیوڈ ہی لگتا ہے۔ چنانچہ بالوں والا مرد وہاں قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ لہٰذا درجنوں قدردانوں نے بالوں کے اس بادشاہ کو گھیرا ہوا تھا۔ رات کا طلسم اپنے عروج پر تھا۔ سنگاپور کی بوگی سٹریٹ نے بنکاک کی پیٹ پیانگ روڈ کو بہت پیچھے چھوڑ دیا تھا .... مگر نہیں .... دونوں میں فرق ہے۔ گو فرق بہت باریک ہے اور وہ باریکی تصویروں نے ظاہر کر دی۔ فوٹو گرافر نے تصویروں کا ایک ایک سیٹ تینوں درویشوں کے حوالے کر دیا۔ ان تصویروں میں درویشوں کا لمحہ لمحہ مقید تھا۔ وہ تصویریں بوگی سٹریٹ کی اس طلسمی رات کا ثبوت بھی تھیں اور یادیں بھی۔ بلیک میل کے لئے بھی استعمال ہوسکتی تھیں اور شوبازی کے لئے بھی۔ دراصل بوگی سٹریٹ ایک قسم کا سٹیج شو ہے۔ جو ناواقفوں اور واقفوں دونوں کے لئے دلچسپی اور شغل مہیا کرتا ہے۔ وہاں پھرنے والی غنچہ دہن' گلبدن درحقیقت لڑکیاں نہیں نیوٹرل مخلوق ہوتے ہیں۔ جو اس خوش اسلوبی سے میک اپ کرتے ہیں اور چال ڈھال اور ناز و ادا دکھاتے ہیں کہ کسی قسم کے شک کی گنجائش ہی نہیں ہوتی۔ وہ شعلہ بدن' کافر ادا فقتے تصویروں میں تو اور بھی نکھر آتے ہیں - یہی تصویریں بعد میں گپ باز سیاح عشق کے میدان میں معرکے مارنے کے لئے ثبوت کے طور پر دکھاتے ہیں۔ اور کہتے ہیں۔ "ایسہ میری گرل فرینڈ ہے۔ ایئر ہوسٹس ہے۔ بس جہاز میں مل گئی .... پھر کیا تھا ... بضد ہوگئی کہ

سنگاپور کی سیر میں کراؤں گی .... وہ تو لاہور بھی آنے کو تیار تھی .... ابھی پچھلے ہفتے ہی خط آیا تھا۔ کہتی ہے کہ میں لاہور آکر تمہیں لاہور کی سیر کرانا چاہتی ہوں ...." ادھر وہ لڑکی نما ہیجڑے اپنی اس ماڈلنگ کی فیس فوٹو گرافروں کی اس رقم سے وصول کرتے ہیں جو انہیں سیاحوں کو تصویریں بیچنے پر ملتی ہے۔ چنانچہ تصویروں کے وہ تینوں سیٹ ہم نے اپنے وزیر خزانہ درویش دوم کو پیش کر دیئے۔ اس نے بلا حیل و حجت وہ رقم فوراً ادا کی اور اپنی تصویروں کا سیٹ جھٹ سے اپنی جیب میں چھپا لیا۔ تینوں درویش شرمندہ شرمندہ واپس ہوٹل پہنچے تو کاؤنٹر والی لڑکی نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ بوگی سٹریٹ پسند آئی؟ "تینوں درویش بہ یک زبان بولے۔ ہم تو روسی ٹریکٹروں کی نمائش دیکھنے گئے تھے"۔ اس چنڈال نے لفٹ بند ہوتے ہوئے ایک اور فقرہ کسا۔ "وہ روسی ٹریکٹر پسند آئے؟ .... ویسے اصل نقل کا پتہ نہیں چلتا ...." تینوں درویشوں نے قسم کھا کر وعدہ کیا کہ اس رات کا ذکر کہیں نہیں ہوگا .... چنانچہ اسکا ذکر ہم نے کہیں نہیں کیا۔ البتہ قلم کی قسم نہیں کھائی تھی اور نہ لکھنے کا وعدہ بھی نہیں کیا تھا .... ویسے اب سنا ہے کہ بوگی سٹریٹ کی وہ رونقیں بھی ختم ہوگئی ہیں اور بوگی سٹریٹ کے فقتے بھی وہاں سے غائب ہو گئے ہیں۔

درویش اول نے نہار منہ مسجد سلطان کے علاقے کی سیر کا اعلان کیا۔ شاید اس لئے کہ وہ اپنے گناہ اور ثواب کا بیلنس درست رکھنا چاہتا تھا۔ چونکہ ہم لوگ بھی اسکی تمام وارادتوں کے ساتھی تھے اس لئے وہاں جانے پر بھلا ہمیں کیا اعتراض ہوسکتا تھا۔ چنانچہ سنگاپور کا نقشہ پھیلایا۔ راستہ متعین کیا اور روانگی ڈال دی۔ پیاز نما گنبدوں والی یہ مسجد سنگاپور کی سب سے بڑی مسجد ہے۔ سنگاپور کے تین چار لاکھ مسلمان اسی مسجد کے گرد و نواح میں صدیوں سے قیام پذیر ہیں۔ پرانے زمانے میں عرب تاجر اس علاقے میں آکر آباد ہوئے تھے۔ پھر سلطان خمس نے اپنا قلعہ بھی اسی علاقے میں بنوایا جس کا سلطان گیٹ کے علاوہ کچھ نشان باقی نہیں۔ وہاں قدیم عرب تاجروں کی جو نشانیاں باقی ہیں وہ اس علاقے میں پھیلے ہوئے بازار ہیں جن میں سب

www.iqbalkalmati.blogspot.com

سے مشہور عرب سٹریٹ ہے۔ جہاں جائے نماز' تسبیح' تعویذ' اگربتیاں' عطریات' ریشمی کپڑے' باتیک اور دوسری رنگ برنگی چیزیں جو قدیم بازاروں کی جان ہوتی ہیں چھوٹی بڑی دوکانوں میں بھری رکھی ہیں۔ عرب سٹریٹ کے اردگرد دوسرے الف لیلوی بازار بھی ہیں جن میں بغداد بازار' مسقط بازار اور قندھار بازار خاص طور پر سیاحوں کے لئے کشش رکھتے ہیں۔ مگر ان سب بازاروں سے اہم بازار وہاں کا چور بازار ہے جہاں سے ہر "گواچی" ہوئی چیز مل جاتی ہے۔ مسرت نذیر یوں گلی کوچوں میں اور ٹیلیویژن پر ڈھنڈورا پیٹنے کے بجائے اگر سنگاپور کے چور بازار چلی جائے تو یقیناً اس کا "گواچا' ہوا 'لونگ' مل جائے گا۔ اکثر لوگ تو اس بازار میں کھوئی ہوئی چیزیں پالیتے ہیں۔ مگر درویش اول وہاں اپنا دل کھو آیا۔ ایک پھول بیچنے والی بیباک گلبدن نے پھولوں کا ایک گلدستہ درویش اول کو پیش کیا تو وہ گرگٹ کی طرح رنگ بدلنے لگا' پہلو بدلنے لگا' اور ارادہ بدلنے لگا۔ مگر کمپیوٹر دماغ درویش دوم نے جلدی سے لڑکی کو کچھ پیسے دیئے اور وہاں سے چلتا کیا۔ وہ سیاحوں کے جھرمٹ میں کھو گئی .... مگر درویش اول پر سکتہ سا طاری ہو گیا۔ اسکی وہ جاپانی کھلونے سی چست رفتاری اس طرح ست ہوگئی گویا کھلونے کے بیٹری سیل ختم ہو گئے ہوں۔

انجانے دیس میں بریانی کی جانی پہچانی مہک نے میری بھوک میں اضافہ اور درویش اول کی رفتار میں چستی پیدا کر دی۔ زردے کے زعفرانی چاول' کڑاہی میں مچلتے کباب اور شوربے میں تیرتی چانپیں بھوکے درویشوں کو رسوا کرنے کے لئے کافی تھیں۔ بھینی بھینی خوشبو والے کھانوں پر مکھیاں نیچی پروازیں کر کے بھن بھنا رہی تھیں۔ خوراک کی حدود میں مکھیوں کی اس آزادانہ نقل و حرکت پر مجھے رشک آرہا تھا۔ گو سنگاپور دنیا کے صاف ترین شہروں میں سے ہے مگر یہ علاقہ تو مسلمانوں کا تھا۔ اور ایمان کی صفائی والے گردونواح کی صفائی کا ذرا کم ہی خیال رکھتے ہیں۔ بسم اللہ ہوٹل کی گرد آلودہ کرسیوں پر ہم بسم اللہ کر کے بیٹھ گئے۔ غلیظ دھوتی والے بیرے نے بدبودار جھاڑن ہوا میں لہرائی تو بوسیدہ میز پر آرام کرتی غلاظت کی شہزادیوں میں ہلچل

سی مچ گئی۔ اس نے نیم اردو میں موٹے خانساماں کو کچھ کہا۔ موٹے خانساماں نے پتیلیوں میں کڑچھا گھمایا اور تھوڑی ہی دیر میں شوربے میں ڈوبتی تیرتی بوٹیاں ہمارے سامنے تھیں۔ ہماری انگلیوں نے شوربے کے اس گہرے سمندر میں بوٹیوں کی تلاش میں غوطہ زنی شروع کر دی۔ ان چھوٹے چھوٹے ہوٹلوں پر گاہکوں کی زیادہ تر تعداد کنگلے سیاحوں' سائیکل رکشہ والوں اور مچھیروں کی ہوتی ہے۔ ہمارے اردگرد مختلف شکلوں اور نسلوں کے لوگ پاکستانی کھانے کو انڈین فوڈ سمجھ کر کھا رہے تھے۔ یہاں کوکا کولا کی بجائے لسی ملتی ہے۔ فرش پر چاروں طرف ہڈیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ یہ پہلا موقع تھا جہاں کتے اور بلیاں بڑے عدل و انصاف کے ساتھ ہڈیوں کا بٹوارا کرتے دکھائی دیئے۔ کھانے کے ساتھ پانی پیا تو معلوم ہوا اس میں ادرک کا رس شامل ہے۔ اپنے پوستی صورت بیرے سے اس ڈیٹول ذائقہ پانی کی وجہ پوچھی تو اس نے بتایا کہ اگر پانی میں ادرک کا رس نہ ڈالیں تو پانی کی تاثیر سے جسم میں درد شروع ہوجاتا ہے۔

کھانا ختم بھی نہیں کیا تھا کہ درویش اول نے درد سر کی شکایت شروع کر دی۔ "یار میرا خیال ہے کہ جو پانی میں نے پیا تھا اس میں ادرک کا رس نہیں تھا۔ شاید اسی لئے میرے سر میں شدید درد شروع ہو گیا ہے" ۔ درویش دوم فوراً بولا۔ "ویسے عام لوگوں کو تو یہاں کے پانی کی تاثیر سے جسم میں درد ہوتا ہے سر میں نہیں۔ مگر چونکہ تمہارے جسم اور سر میں کوئی خاص فرق نہیں ہے اس لئے یقیناً پانی کا اثر تمہارے جسم کے بجائے سر پر ہی ہوا ہوگا .... ویسے بھی تو پانی خالی جگہ کیطرف ہی بڑھتا ہے نا ...." درویش اول کو اس طرح کی گستاخ باتیں سخت ناپسند تھیں اور خاص طور پر ہر وہ بات تو اسکو گولی کی طرح لگتی تھی جو اسکے سر اور بالوں کے بارے میں کہی جائے۔ چنانچہ اس نے ادرک کے پانی والے دو گلاس چڑھائے۔ غصہ ٹھنڈا کیا اور چائینا ٹاؤن جانے کا اعلان کر دیا۔

چست الوجود درویش اول اور ست الوجود درویش دوم کی چال اور چلن دونوں میں بنیادی فرق تھا۔ چنانچہ طریقہ سفر پر تو دونوں میں اکثر تکرار ہوتی رہتی تھی۔

مثلاً" درویش اول سیر سپاٹے کے لئے ٹیکسی وغیرہ میں گھومنے کے بجائے باپیادہ چلنے کو ترجیح دیتا تھا جبکہ درویش دوم پیدل چلنے کے قطعاً" خلاف تھا۔ مگر دونوں اپنی اپنی کمزوریوں کو چھپانے کے لئے بڑے ٹھوس دلائل پیش کرتے رہتے۔ درویش اول کا کہنا تھا کہ پیدل چلنے سے سیر بھی تسلی سے ہو جاتی ہے اور پیسے بھی بچ جاتے ہیں۔ درویش دوم کے مطابق پیدل سیر میں زیادہ خرچہ ہوتا ہے۔ کیونکہ جتنا زیادہ پیدل چلیں گے اتنی ہی زیادہ بھوک لگے گی اور جتنی زیادہ بھوک لگے گی اتنی ہی زیادہ خوراک.... اور خوراک پر خرچہ ہوگا۔ چائنا ٹاؤن جانے کے لئے ہم نے درویش اول کی رائے سے اتفاق کیا اور پیدل مارچ شروع کی۔

نارتھ برج روڈ پر چلتے چلتے ہم دریائے سنگاپور کے کنارے پہنچے۔ دریا شہر کے سینے کو چیرتا بل کھاتا سمندر تک پہنچ جاتا ہے۔ اسی دریا کے ذریعے بڑے جہازوں سے اترا ہوا سامان چھوٹی کشتیوں میں لاد کر شہر کے اندر مارکیٹ تک لایا جاتا ہے۔ دریا کے دونوں جانب گودام بنے ہیں جہاں دوسرے ملکوں سے لائی ہوئی اشیا رکھی جاتی ہیں۔ ان چھوٹی بڑی مال بردار کشتیوں کے ساتھ ساتھ کسٹم والوں کی لانچیں بھی گشت کرتی رہتی ہیں تاکہ سمگلروں کو قابو میں کیا جاسکے۔

جہاں دریا اور سمندر کا ملاپ ہوتا ہے وہاں سنگاپور کا سیمبل مرلیون کا مجسمہ نصب ہے۔ اس مجسمے کا سر شیر کا ہے اور جسم مچھلی کا۔ روایت کے مطابق شہزادہ نیلا اتما نے اسی مقام پر شیر دیکھا تھا۔ جس کی نسبت سے مچھیروں کی اس ساحلی بستی کا نام سنگاپور یعنی شیر کا شہر رکھا گیا تھا۔ چنانچہ شیر کا سر اور مچھلی کا دھڑ سنگاپور شہر کا علامتی نشان بن گیا ہے۔ ویسے یہ سنگا اور سنگھا ایک ہی چیز ہیں۔ دونوں کا مطلب شیر ہے۔ سرداروں نے شیر کو سکھ بنانے کی خاطر یا شاید سکھوں کو شیر بنانے کی خاطر سنگھا کو سنگھ بنا کر اپنے نام کے ساتھ نتھی کر لیا اور اب دنیا کا ہر سردار شیر بلکہ چیتے کے لحاظ سے ببر شیر نظر آتا ہے۔ درویش اول نے مجسمے کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "دیکھو یار یہ لوگ چھوٹی چھوٹی چیزوں کو بڑی اہمیت دیتے ہیں" ۔ "وہ کیسے؟" تھکے ہارے درویش دوم نے بے دلی سے پوچھا۔ درویش اول نے اسی فلسفیانہ انداز میں کہا۔ "بھئی دیکھو نا ان لوگوں نے اک چھوٹی سے روایت پر شیر اور مچھلی کو شہر کا علامتی نشان بنا لیا ہے.... مگر ہم لوگ .... چھوڑو یار ہم لوگ بیکار قوم ہیں...." پھر اس نے اپنا بڑا سا سر نفی میں ہلاتے ہوئے درویش دوم کی طرف دیکھا اور دیکھتے دیکھتے کہا۔ "اب یار تمہی کو دیکھو .... کس قوم کے پاس انسان نما بھالو یا بھالو نما انسان ہوگا.... مگر نہ ہم نے تمہارا مجسمہ بنایا اور نہ بھالوؤں نے...." درویش دوم کا چہرہ چقندر بن گیا' مگر اس کے پاس خاموش رہنے کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا۔

چائنا ٹاؤن پہنچنے سے پہلے فلپ سٹریٹ پر "واک ہائی چنگ یو" کا چینی مندر آیا۔ یہ سنگاپور کا سب سے قدیم چینی مندر ہے۔ جسے سمندروں کے دیوتا کے نام منسوب کیا گیا ہے۔ بحری دیوتا کے اس نیول ہیڈ کوارٹر میں سمندری سفر پر جانے والے اپنی حفاظت کی منتیں مان کر جاتے تھے اور آنے والے چڑھاوے چڑھاتے تھے۔ دراصل جنوبی ایشیا اور ایشیا میں چینی تاجروں کی یلغار کوئی نصف صدی اور صدی کے دورانیئے میں ہوئی۔ یہ لوگ جہاں جہاں گئے اور جس حال میں گئے' بڑی محنت سے کام کیا اور تجارت پر چھاگئے۔ کوئی بیس پچیس برس پہلے پاکستان میں چینیوں نے جوتے بنانے کا کاروبار شروع کیا تھا۔ اب چینی موچی تو ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتا۔ البتہ چینی ریستورانوں کی بھرمار ہے۔ کچھ عجب نہیں کہ بیس برس بعد کسی اور بزنس پر ان کا قبضہ ہو اور چینی ریستوران شیدا پہلوان چلا رہا ہو۔ ہمارے ایک چینی دوست مسٹر ہاؤ کا گلبرگ میں بہت بڑا ریستوران تھا۔ وہ خود تو بڑا پینڈو قسم کا چینی تھا مگر اس کے ریستوران میں جانا لاہور میں فیشن سا بن گیا تھا۔ ویسے بھی زندہ دلان لاہور خوش خوراکی کے علاوہ کم ہی چیزوں کی طرف دھیان دیتے ہیں۔ مسٹر ہاؤ کے ایک ہی شکل کے پیلے پیلے کوئی آدھی درجن بیٹے تھے جو آہستہ آہستہ لاہور سے غائب ہونے شروع ہوئے' مگر کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ خبر ہوئی تو اس دن جس دن مسٹر ہاؤ نے اپنا ریستوران بیچ دیا اور امریکہ جانے کے لیے رخت سفر باندھ لیا۔ مسٹر ہاؤ سے اچانک

www.iqbalkalmati.blogspot.com

روانگی کی وجہ پوچھی تو انکشاف ہوا کہ اسکے ان "دھک مکوڑے" نما بیٹوں نے کینڈا سے لیکر میکسیکو تک چینی ریستو رانوں کا جال بچھا دیا تھا اور مسٹر ہاؤ اپنے بیٹوں کے پاس بقیہ زندگی گزارنے جا رہا تھا۔ دنیا کے سبھی ملکوں اور شہروں میں مسٹر ہاؤ موجود ہیں جنہوں نے چینی کھانوں کو انٹرنیشنل کھانا بنا دیا ہے۔

ہاں تو یہاں ذکر سنگاپور کے چائنا ٹاؤن کا ہو رہا تھا' جسکے بھول بھلیاں والے بازاروں میں چھوٹی چھوٹی دکانیں رنگ برنگی چیزوں سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھیں۔ ان دکانوں میں درویش دوم کا داخلہ ممنوع تھا۔ گو اس ممانعت پر کوئی سرکاری پابندی نہیں تھی بلکہ ان کی اپنی جسامت تھی۔ کیونکہ انہوں نے ایک دکان میں 'داخلہ ڈالہ' تو کئی ایک کاغذ کی لالٹینیں' بلوری کانچ کے موم بتی سٹینڈ' خوشبودار جڑی بوٹیوں کے جار' چینی کے واز اور پھولدان تہس نہس ہوگئے۔ صرف یہی نہیں بلکہ چھت سے جھولتے پنجروں میں بند چھوٹے چھوٹے رنگ برنگ پرندوں نے پھڑ پھڑا کر اپنے آپکو زخمی کر لیا۔ گلدان پر رنگ سجاتے ایک چینی بزرگ نے گھبرا کر اپنی عینک کے دبیز شیشوں سے اوپر دیکھا اور خدا خبر اپنی آنکھوں کی ان ترچھی لکیروں میں سے کیا دیکھا کہ ان کے ہاتھ سے برش چھوٹ گیا۔ درویش دوم اپنی جسامت سمیٹ کر اس پھرتی سے اس دکان سے نکلا کہ اس کی چال پر درویش اول کی چال کا گمان ہونے لگا۔ چائنا ٹاؤن درویش دوم کو راس نہ آیا اور شاپنگ کا وہ شیدائی بد دلی سے بازار میں گھومنے لگا۔ البتہ درویش اول کے مطلب کی ہر شے وہاں موجود تھی۔ چنانچہ وہ ہر دکان کے سامنے پڑاؤ ڈال دیتا۔

اک چینی دواخانے کے سامنے تو درویش اول مجسمے کی طرح نصب ہوگیا۔ ہر اک دوا کی شیشی کو ایسی حسرت بھری نگاہ سے دیکھ رہا تھا گویا اسکا بس چلے تو سبھی دواؤں کو ایک ہی جھٹکے میں نگل جائے' تاکہ ہر قسم کی ذہنی اور جسمانی بیماریوں سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چھٹکارا پا لے۔ درویش دوم جو کچھ دیر پہلے بیزاری کا اشتہار بنا پھرتا تھا چینی دواؤں میں بھرپور دلچسپی لینے لگا۔ اور اب یہ دونوں ایک ایک شیشی کی طرف

اشارے کر کے سرگوشیوں میں تبصرے کرنے لگے۔ سچ تو یہ ہے کہ ان شیشیوں میں ہر مرض کا علاج بند تھا۔ اور بھلا وہ کون سی بیماری تھی جو ان دونوں کو نہ ہو۔ مثلاً" مردانہ کمزوری کا پوشیدہ علاج وہاں کھلے بندوں کیا جاتا ہے۔ مگر اس دوا کی طرف میری موجودگی میں دونوں نے آنکھ اٹھا کر نہ دیکھا۔ جن سنگ بھی سلاجیت کی طرح بدنام دوا ہے۔ چینی شہنشاہوں کے دور میں یہ دوا طویل عمر اور جنسی قوت کے لئے استعمال کی جاتی تھی۔ اس دوا کی حقیقت بھی کچھ ویسی ہے جیسے حکیموں کے کشتے۔ مگر جس کام کے لئے یہ استعمال کی جاتی ہے اس سے کہیں زیادہ ہاضمے کے لئے مفید ہے۔ چنگ چو یو' جڑی بوٹیوں کا تیل' جسمانی درد کے لئے مفید ہے۔ جسکی ایک ایک شیشی دونوں درویشوں نے خریدی۔ درویش دوم نے مجھے مشورہ دیتے ہوئے کہا۔ "بیوقوف! یہ بڑی کارآمد دوا ہے تم بھی ایک شیشی خرید لو" ۔ میں نے کہا "عقلمند! تم خرید لو اگر ضرورت پڑی تو میں تمہاری دوا استعمال کر لوں گا"۔ اسی طرح مگرمچھ کا گوشت دمہ کی بیماری کے لئے' ویل مچھلی کا سوپ بلڈ پریشر کے لئے' کچھوے کا سوپ کمر کے درد کے لئے اور موتیوں کا پاؤڈر کالوں کو گورا اور گوروں کو' چن ورگا' یعنی چاند جیسا بنانے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ اگرچہ درویش دوم کو اس پاؤڈر کی چنداں ضرورت نہ تھی مگر دوسری دواؤں کے ساتھ ساتھ ایک پڑیا تو اس پاؤڈر کی بھی خرید ہی لی۔ مگر دونوں درویشوں کی اصل بیماری بال تھے۔ کیونکہ ایک ' فارغ البال ' تھا اور دوسرا بالوں کے وبال سے بے حال تھا۔ چنانچہ دونوں نے چینی بابا سے اپنے اپنے امراض کی دوا لی۔ چینی بابا نے درویش اول کو اک تیل کی شیشی اور درویش دوم کو پاؤڈر کی پڑیا تھما دی۔ خدا خبر وہ کس سمندری جانور کا تیل اور کس جنگلی جڑی بوٹی کا پاؤڈر تھا۔ کیونکہ چینی حکیموں سے نہ مگرمچھ محفوظ ہیں اور نہ مینڈک۔ دونوں درویشوں نے رنگ برنگی شیشیاں اور ون پونی پڑیاں سمیٹیں اور خوشی خوشی میرے ساتھ چل دیئے۔ ان دونوں پر دوائیں خریدتے ہی اتنا خوشگوار اثر ہوا کہ درویش دوم جو اپنے بالوں کو چھپانے کے لئے گردن تک بٹن بند رکھتا تھا گرمی کا بہانہ بنا کر چھاتی تک قمیص کے بٹن کھول

لئے۔ ادھر درویش اول یوں بار بار گردن جھٹکتا گویا اپنی خمدار زلفوں کو چہرے سے ہٹا رہا ہو۔ ابھی ہم لوگ دواخانے سے چند ہی قدم آگے گئے ہونگے کہ درویش اول غائب ہو گیا۔ میں نے پریشان ہو کر درویش دوم کو بتایا تو اس نے تسلی دیکر کہا۔ "فکر کی کوئی بات نہیں ابھی آجائے گا۔" گو عام حالات میں کسی درویش کا غائب ہونا فکر کی بات تھی۔ مگر درویش دوم کی بے فکری نے مجھے شک میں ڈال دیا۔ جب درویش اول لوٹا تو اسکی قمیص کی باریک جیب میں چھپی جن سنگ کی دو شیشیاں دونوں درویشوں کی سازش کی نقاب کشائی کر رہی تھیں۔

سنگاپور کی رنگ برنگ روشنیاں رات کے سیاہ دامن میں موتیوں کی طرح چمک رہی تھیں۔ تینوں درویش سفر کے منصوبے بناتے سری مریامان مندر کی طرف بڑھ رہے تھے۔ رحیم کے درپہ جانے والے درویش رام دوارے پہنچے تو وہاں بہت بڑا ہجوم تھا۔ مندر کے بڑے دروازے کے ساتھ ہی آگ کا الاؤ لگا ہوا تھا۔ ٹیک' چیڑ' دیار اور صندل کی لکڑیوں پر شعلے لپک رہے تھے۔ اتنے میں چند پجاری آئے۔ انہوں نے سرخ رنگ کی دھوتیاں پہن رکھی تھیں اور گلے سے ننگے تھے۔ ایک پجاری نے جلتی آگ میں کچھ چھڑکا۔ جس سے شعلے اور تیز ہوگئے۔ پھر اس نے دوسرے پجاری کے جسم میں سلاخیں گھونپنی شروع کر دیں۔ اس عبادت کو دیکھ کر ہم خاصے خوفزدہ ہوئے۔ یہی سلاخیں اس کی زبان سے بھی گزاری گئیں مگر نہ تو اس کے جسم سے خون ٹپکا اور نہ ہی زبان سے چیخ نکلی۔ جب شعلوں نے انگاروں کا روپ دھارا تو ان پجاریوں نے دہکتے ہوئے انگاروں پر چلنا شروع کر دیا۔ پورے ہجوم پر خاموشی طاری تھی۔ سیاحوں کے کیمروں کی فلیش گنیں بجلی کی طرح کوند رہی تھیں۔ سنگاپور کے بارے میں یہ بات قابل تعریف ہے کہ وہاں مذہبی رسومات پر اختلافات اور جھگڑے نہیں ہوتے۔ ہندو' مسلمان' سکھ' عیسائی اور بدھ مذہب کے لوگ سب مل جل کر رہتے ہیں۔ ۱۹۴۹ میں "انٹر ریلیجیس آرگنائزیشن" کی بنیاد رکھی گئی۔ اس آرگنائزیشن کا صدر ہر سال بدلتا ہے۔ ۱۹۶۶ میں اس کا صدر مسلمان تھا۔ ۱۹۷۰ میں ایک سکھ اس

کا صدر چنا گیا تھا۔ اس طرح مذہبوں کی فلاح و بہبود اور باہمی اتفاق کے لئے یہ آرگنائزیشن بڑا مفید کام سرانجام دے رہی ہے۔ سری مریامان مندر میں سلیم سے ملاقات ہوگئی۔

سلیم لاہور کا رہنے والا تھا۔ میری اور اس کی دوستی خاصی پرانی تھی۔ ان دنوں وہ سنگاپور میں قالینوں کا کاروبار کرتا تھا۔ قالینوں کا کاروبار اس نے سنگاپور تک ہی محدود نہیں رکھا تھا بلکہ کوالالمپور میں بھی اس کی دکان تھی۔ غیر ملکی سیاحوں میں قالینوں کی بڑی مانگ تھی۔ وہ پاکستان سے قالین منگا کر ایرانی قالینوں کا نام دیکر بیچتا تھا۔ اسے دوسری صبح کوالالمپور جانا تھا۔ چنانچہ ہم سب نے جہاز سے جانے کی بجائے سلیم کے ساتھ کار میں سفر کرنے کا فیصلہ کیا تاکہ سنگاپور اور ملیشیا کے میدانی علاقوں کی سیر ہو جائے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ملیشیا

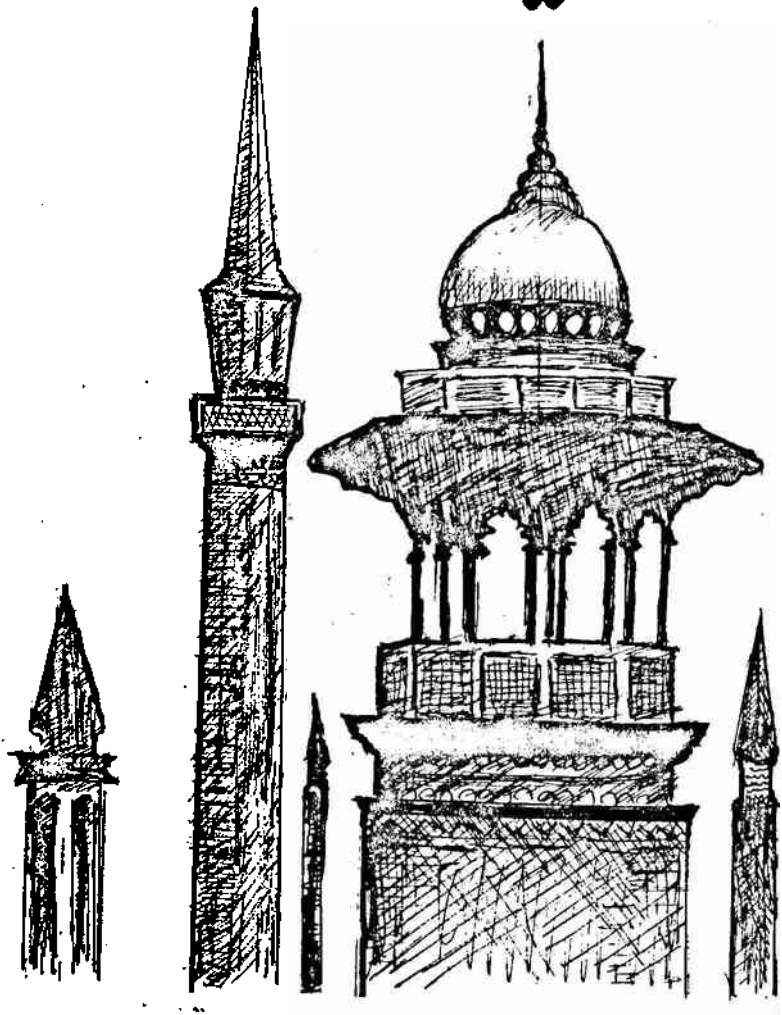

www.iqbalkalmati.blogspot.com

درویشوں نے کنگز ہوٹل کو الوداع کہا۔ سلیم کی گاڑی میں سامان لادا اور ملیشیا کی جانب کوچ کیا۔ سورج نئی نویلی دلہن کی طرح بدلیوں میں چہرہ چھپائے ہوئے تھا۔ سڑکوں پر ٹریفک رواں دواں تھی۔ سنگاپور سے باہر نکلے تو گھنے جنگلوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ جہاں تک نظر جاتی تھی ناریل کے پیڑ ہی پیڑ دکھائی دیتے تھے۔ آدھے گھنٹے بعد ہم سنگاپور کی حدود کو پار کر رہے تھے۔ جزیرے کو ملیشیا کے ساتھ ملانے کے لئے ایک کازوے Cause way بنایا گیا ہے۔ جہاں سے سڑک اور ریلوے لائن پہلو بہ پہلو گزرتی ہیں۔ کسٹم پوسٹ پر پہنچے تو درویش دوم کی شاپنگ ہمارے لئے عذاب بن گئی۔ درویش دوم نے اپنے بکسوں میں اتنا سامان ٹھونسا ہوا تھا کہ کسٹم والوں نے روک لیا اور کہا کہ اس سامان پر ڈیوٹی ادا کرو۔ ہم نے سلیم کی مدد سے احتجاج کیا کہ ہم تو صرف سیاحت کے لئے جا رہے ہیں۔ تجارت کے لئے نہیں۔ چند دنوں کے بعد ہم جکارتا چلے جائیں گے۔ مگر ہماری صفائی اور وکالت کا ان پر کچھ اثر نہ ہوا۔ پھر درویش اول نے کسٹم والوں کو بتایا کہ وہ ملیشیا کے شہزادوں کا مہمان ہے اور ثبوت کے طور پر ایجسن کالج کی ایک تصویر دکھائی جس میں شہزادہ عمر ٹنکو اور شہزادہ سلیمان ٹینکو درویش اول کے ساتھ کھڑے تھے۔ اس تصویر کا کسٹم والوں پر کچھ اثر ہوا اور انھوں نے ہم سے کچھ رقم وہاں جمع کروائی۔ ساتھ ہی ایک رسید دی جس کے ذریعے ملک چھوڑتے وقت ہم ایئرپورٹ سے اپنی جمع کی ہوئی رقم واپس لے سکتے تھے۔ جس

دوران کسٹم والوں سے یہ جھگڑا چل رہا تھا درویش دوم اس بے نیازی سے ایک جانب کھڑا تھا گویا اس جھگڑے سے اس کا کوئی سروکار ہی نہ ہو۔

کسٹم والوں سے جان خلاصی ہوئی تو گردو نواح کے نظاروں کی طرف متوجہ ہوئے۔ سب سے پہلے ناریل کا جوس پینے کی سوجھی۔ ناریل بیچنے والے نے سڑک کے کنارے ڈھیر لگا رکھا تھا۔ اسے چار ناریل دینے کو کہا۔ اس نے جلادوں والا بڑا سا چھرا ہوا میں لہرایا۔ ناریل کا اوپر والا حصہ کٹ کر علیحدہ ہو گیا۔ تو ناریل اور سٹرا ہمارے حوالے کیا۔ ہم اسی طرح ناریل کا جوس پینے لگے جیسے کوکا کولا پی رہے ہوں۔ ٹھنڈا میٹھا جوس پینے کے بعد کسٹم والوں کی تلخی ختم ہو گئی۔

جوہور بورو Johore Bahru ملیشیا کے جنوبی صوبے کا دارالحکومت ہے۔ شہر سبزے کے سمندر میں گھرا ہوا ہے۔ سڑک کے دونوں جانب ربڑ کے جنگلات اور اناس کے باغات پھیلے ہوئے ہیں۔ ایک لمحے کے لئے سڑک پر گاڑی روکیں تو درجنوں لڑکیاں اناس لئے آپ پر جھپٹ پڑیں گی۔ اناس کو چھیلنے کی بجائے اوپر سے کاٹ دیا جاتا ہے' پھر تیز دھار والے چاقو سے گودے کے ٹکڑے کر دیئے جاتے ہیں۔ ہر اناس کے ساتھ گودا کھانے کے لئے کسی درخت کا لمبا سا کانٹا بھی ملتا ہے ہم نے چار اناس خریدے اور چلدیئے۔ چونکہ سلیم گاڑی چلا رہا تھا اس لئے اس کے حصے کا اناس بھی درویش دوم ہی چٹ کر گیا۔

جوہور بورو سنگاپور سے صرف سولہ میل کے فاصلے پر ہے' مگر وہاں تک پہنچنے میں ہمیں کئی گھنٹے لگے۔ کیونکہ کسٹم والوں نے ہمارا حشر کر دیا تھا۔ جوہور بورو میں سلطان کا محل دیکھا جو مورش طرز تعمیر کا نادر نمونہ ہے۔ یہاں کی مسجد سیاحوں کے لئے اپنے اونچے میناروں کے سبب بڑی کشش رکھتی ہے۔ یہاں ایک چڑیا گھر بھی ہے جسے دیکھنے کے لئے درویش اول بضد تھا۔ مگر درویش دوم کے پوشیدہ خطرات کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم نے چڑیا گھر کا پروگرام منسوخ کیا اور کوالالپور کی طرف روانگی اختیار کی۔

جس کارواں کا راہبر صراط مستقیم پر نہ چل سکتا ہو اس کارواں کا منزل سے بھٹک جانا اور راستے سے بہک جانا کوئی عجب بات نہیں۔ ملیشیا کے سفر میں درویشوں کے اس ننھے سے کارواں کا راہبر سلیم تھا۔ اور جناب سلیم کی ناک کا زاویہ نوے کی بجائے ۱۲۰ ڈگری پر تھا۔ کیونکہ موصوف نے جوش جوانی میں انارکلی میں شاپنگ کرتی کسی الھڑ مٹیار کو چھیڑ دیا تھا۔ بی بی نے جوش مروت میں شاپنگ بیگ گھمایا جو سیدھا سلیم کی ناک پہ لگا اور سیدھی ناک سیدھی نہ رہ سکی۔ چنانچہ جب وہ آسٹریلین طوطے کی چونچ نما ناک کی سیدھ میں چلتا تو دائیں ہاتھ کی جانب جھکاؤ اس کے لئے قدرتی امر تھا۔ پیدل چلتے ہوئے سڑک کے دائیں ہاتھ ہو جائیں تو کوئی مضائقہ نہیں۔ مگر جہاں ٹریفک بائیں ہاتھ ہو وہاں گاڑی سڑک کے دائیں ہاتھ چلانا موت سے بے تکلف ہونے والی بات تھی۔ اور موت سے بے تکلف ہونے کا فی الحال ہمارا کوئی موڈ نہ تھا۔ اس سفر میں سلیم کی ناک نے ہمارا ناک میں دم کر دیا تھا۔ دراصل اس کی ناک سے تین جانیں وابستہ تھیں۔ دیگر صورت میں ٹیڑھی کے بجائے اگر اس کی ناک سرے سے نہ ہوتی تو ہماری صحت پر کیا اثر پڑتا۔ لہٰذا درویش اول نے 'کو پائلٹ' کے فرائض انجام دیئے اور حضرت سلیم کو بار بار سڑک کے بائیں جانب گاڑی چلانے کی یاد دہانی کراتا رہا۔

درویش دوم راستے کے خطروں سے بے نیاز اردگرد پھیلے ہوئے ناریل' پپیتے اور اناس کے باغات میں کھویا ہوا تھا۔ درویش دوم کی جسامت تو ایسی تھی کہ وہ خوراک کے معاملے میں خود کفیل تھا۔ مگر آج میرے بجائے اسے بھوک ستا رہی تھی۔ چند میل سفر کے بعد گاڑی رکواتا اور پھل خریدنے شروع کر دیتا۔ پھل خریدتے وقت وہ پھلوں سے زیادہ پھل بیچنے والیوں کی صورت اور خدوخال کا خاصہ خیال رکھتا۔۔۔۔۔

جب کوئی پھل والی چھری چلا رہی ہوتی تو درویش دوم اس انداز سے اسے دیکھتا گویا چھری اناس پر نہیں درویش دوم پر چل رہی ہو۔

کوالالپور کی مسجدوں کے سرسبز مناروں اور گنبدوں نے دور سے استقبال کیا۔ شہر میں پہنچے تو ٹریفک سے بھری کشادہ سڑکیں اور آسمان کو چھوتی

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہوئی جدید عمارتیں نظروں کے سامنے پھیل گئیں تینوں درویش کار کی کھڑکیوں سے گردنیں نکالے اس بے چینی سے ادھر ادھر دیکھ رہے تھے جیسے زندگی میں پہلی مرتبہ انسانی آبادی میں آئے ہوں۔ ادھر جناب سلیم اپنی ناک کی سیدھ میں جا رہے تھے لیکن ابھی تک ان کے کارپیٹ پیلس کا دور دور تک نام و نشان نہ تھا۔ آخر ماؤنٹ بیٹن روڈ پر پہنچے۔ جی ہاں یہ سڑک اسی ماؤنٹ بیٹن کے نام پر ہے جو ہندوستان کی تقسیم کے وقت وائسرائے تھا۔

کوالالمپور بہرحال کراچی نہیں تھا۔ وہاں اس کے نام پر سڑک ہونا ہمارے لئے تعجب کا باعث نہ بن سکی۔ مگر جس چیز سے ہمیں تعجب ہوا وہ کارپیٹ پیلس تھا۔ غسل خانہ نما اس جگہ کو پیلس کہنا کچھ ایسا ہی تھا جیسے فٹ پاتھ پر دہی بڑے بیچنے والا اپنی ریڑھی پر پرل کانٹینٹل کا چاندنی لانچ لکھ لے۔

سلیم طوطے کے کارپیٹ پیلس کو دیکھنے کے بعد اسکے گھر کی وسعتوں کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا تھا۔ پھر اس نے دبے لفظوں میں ہوٹل گرینڈ پیسیفک کی تعریفیں کر کے وہاں قیام کی طرف اشارہ بھی کر دیا تھا۔ مگر درویش دوم پیسے بچانے کی خاطر اسکے کسی اشارے کو خاطر میں نہیں لا رہا تھا۔ چونکہ قیام اور طعام کے تمامتر اختیارات ہمارے وزیر خزانہ درویش دوم کے ہاتھ میں تھے اس لئے میرے جیسے بار بردار درویش کو بولنے کا حق تو ویسے ہی نہ تھا۔ البتہ درویش اول ایسے موقعوں پر اپنا فیصلہ دے سکتا تھا۔ جو اس نے دیا اور سلیم طوطے کو ہوٹل گرینڈ پیسیفک جانے کو کہا۔ سلیم نے پہلی مرتبہ اپنی ناک کی کیمپس کا سہارا لئے بغیر گاڑی چلائی اور ایک ہی جھٹکے میں ہمیں ہوٹل کے سامنے لا کر کھڑا کر دیا۔ ست الوجود درویش دوم اپنا وجود گاڑی سے پوری طرح نکال بھی نہ پایا تھا کہ سلیم "خدا حافظ!" کہتا ہوا گھنے ٹریفک میں غائب ہو گیا۔ اس کا یوں غائب ہونا بھی کوئی عجب بات نہ تھی۔ کیونکہ پاکستانی غیر ملکوں میں جاتے ہیں تو باجماعت جاتے ہیں اور مع اہل و عیال جاتے ہیں اور وہاں مقیم دوستوں' رشتہ داروں' محلے والوں' دوستوں کے دوستوں' رشتہ داروں کے اہل محلہ اور اہل محلہ

کے رشتہ داروں کو کمبل ہو جاتے ہیں۔ اور وہ مجبور میزبان اپنے ملک میں بدنامی کے خوف سے خدا خبر کتنی تکلیفوں کے باوجود اس ٹڈی دل کی خدمت کرتے ہیں۔ چونکہ بنیادی طور پر ہم ایک ناشکر گزار قوم ہیں۔ اسی لئے کسی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ہماری زبانیں پتھر ہو جاتی ہیں۔ پاکستان میں گرمی کی چھٹیاں غیر ملکوں میں مقیم پاکستانیوں کے لئے بڑی بھاری ثابت ہوتی ہیں۔

درویش اول کارگزاری کا بادشاہ تھا۔ ہوٹل گرینڈ پیسیفک میں قدم رکھتے ہی اس نے با آواز بلند ہوٹل کے مینجر سے ملاقات کا مطالبہ کیا۔ ہوٹلوں اور ریستورانوں کے ملازمین لاؤڈ سپیکر نما گاہکوں سے اکثر گھبرا جاتے ہیں۔ چنانچہ ان کا مطالبہ فوراً پورا کر دیا گیا اور ملاقات کے لیے مینجر کے دفتر تک پہنچانے کے لیے اک 'چھمک چھلو' ان کے ہمراہ ہوگئی۔ ایسی چٹ پٹی راہبر کو دیکھ کر ڈپٹی میر کارواں یعنی درویش دوم کی رال بھی ٹپکی اور وہ بھی مینجر سے ملاقات کرنے چل دیا۔ لابی میں باقی رہ گیا میں جو کارواں کے بکھرے سامان کا محافظ بنا بیٹھا تھا۔

ہوٹل کا مینجر کوئی تھری پیس سوٹ والا روایتی مینجر نہ تھا بلکہ ایک گڑیا نما چینی لڑکی تھی۔ مس ٹونگ چینی ضرور تھی مگر نہ چینی سی تھی اور نہ چینی کی تھی۔ وہ خالص کاروباری خاتون تھی۔ شاید اسی لئے درویش دوم دوڑتا ہوا واپس لابی میں آیا اور اس کاروباری میچ میں حصہ لینے کے لئے مجھے بلا کر لے گیا۔ دراصل درویش اول نے مس ٹونگ سے اک جھوٹی سچی کاروباری رام کہانی چھیڑ رکھی تھی اور اس کہانی کو سچا ثابت کرنے کے لئے میری چرب زبانی کی ضرورت تھی۔ اس کہانی کے مطابق ہم تینوں پی۔ آئی۔ اے کے شعبہ مارکیٹنگ کے بہت بڑے افسر تھے۔ سچ صرف اتنا تھا کہ ہم شعبہ مارکیٹنگ کے محض افسر تھے۔ جھوٹ یہ تھا کہ بڑے افسر تھے بلکہ بہت بڑے افسر تھے جو کوالالمپور میں ہوٹلوں کا سروے کرنے آئے تھے تاکہ پاکستانی سیاحوں کو وہاں بھیجا جاسکے۔ اس بات میں بھی پوری صداقت نہ تھی۔ کیونکہ ہم صرف اپنی سیاحت کے لئے آئے تھے کوئی سروے وغیرہ کرنے نہیں۔ اس سارے ڈرامے کا صرف ایک ہی

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

مقصد تھا کہ کاروباری لاج میں آکر مینیجر اقامت کے لئے ہمیں مفت کمرے دے دے۔ اور اس مقصد میں ہم کامیاب بھی ہو گئے۔ ہمیں اس ہوٹل کا ایک 'سوٹ' الاٹ کر دیا گیا' جس میں ایک ڈبل بیڈ روم' ایک ڈرائینگ روم' ایک چھوٹا سا باورچی خانہ اور ایک بڑا سا غسل خانہ تھا۔ بیڈ روم کے بستروں پر تو درویش اول اور درویش دوم نے قبضہ جمالیا۔ البتہ ڈرائینگ روم کا صوفہ میرے حصے میں آیا اور اس پر بھی میں اس وقت تک دراز نہیں ہو سکتا تھا جب تک دونوں درویش ڈرائینگ روم میں موجود تھے۔ خیر سونے کا مسئلہ تو رات کا تھا اور ابھی شام ہی ہوئی تھی۔ چنانچہ (ایونگ ان کے۔ ایل) یعنی کوالالپور میں شام گزارنے کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔

کہتے ہیں گنجا کیا دھوئے گا اور کیا نچوڑے گا۔ گو یہ مثال درویش اول پر لاگو نہ تھی مگر پھر بھی وہ پانی سے پرہیز ہی کرتا تھا اور اسکی تیاری میں نلکے کا پانی کم اور پیرس سے آیا بوتلوں میں بند خوشبودار پانی زیادہ استعمال ہوتا تھا۔ جو اس نے خوب استعمال کیا اور بن ٹھن کر ہوٹل کی لابی میں جا پہنچا۔ درویش دوم کو تو پانی سے اتنی ہی رغبت تھی جتنی ایک مست ہاتھی کو گدلے پانی سے ہوتی ہے۔ چنانچہ اسکو غسل خانے سے نکالنا آسان کام نہ تھا۔ کہیں شام ڈھلے وہ غسل خانے سے نکلا تو میں نے غسل کی تیاری شروع کی۔ پانی جیسی خدا کی نعمت کو غسل جیسی چیز پر ضائع کرنے کا میں بالکل قائل نہیں ہوں۔ بس غسل خانے میں آنا جانا ہی کافی ہے۔ اور یقین جانئے میں دونوں درویشوں سے زیادہ اجلا لگ رہا تھا۔ غسل خانے کی بھاپ سے گدلے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھ کر تو مجھے یہی اندازہ ہوا۔

جب تک ہم دونوں ہوٹل کی لابی میں پہنچے درویش اول اونچی ہواؤں میں تھا۔ چنانچہ اس نے دور ہی سے بلند آواز میں نعرہ لگایا اور ہم اسکی بھدی اور کرخت آواز کی طرف کھنچتے چلے گئے۔ وہاں ایک سکھ ساقی شراب کے بھنڈارے کے بٹوارے پر مامور تھا۔ سکھ شرابی تو ہوتے ہیں ساقی نہیں' اور وہ بھی چھ فٹ لمبا تڑنگا ساقی۔ میں نے سردار جی سے مصافحہ کرنے کے لئے ہاتھ بڑھایا تو اس نے میرے ہاتھ میں "پٹیالہ" تھما دیا۔ سکھوں کا پٹیالہ سے گہرا رشتہ ہے۔ چاہے پٹیالہ پنجاب والا ہو یا شراب والا۔ درویش دوم دوا تو ہر قسم کی پی جاتا تھا مگر دارو کسی قسم کا بھی نہیں پیتا تھا۔ چنانچہ سردار جی نے اسے لیچی کے پانی اور لیچیوں سے بھرا گلاس پیش کیا۔ یہ وہاں کا روح افزا جیسا من پسند مشروب ہے۔

گفتگو شروع ہوئی تو ہمارے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ رونگٹے تو میرے کھڑے ہوئے درویش دوم کا تو رونگٹوں کا ایک جنگل سا کھڑا ہو گیا۔ کیونکہ جب تک ہم دونوں تیاری میں مصروف تھے۔ درویش اول نے سکھ ساقی کو یہ گولی فٹ کر دی تھی کہ ہم تینوں کرکٹر تھے اور پی۔ آئی۔ اے کی ٹیم میں کھیلتے تھے۔ ہمارے حلیئے کے ایمپائر تو ضرور دکھائی دیتے ہیں مگر کرکٹر ہرگز نہیں۔ ہاں حنیف برادران کی اور بات تھی۔ سردار جی کرکٹ کا شیدائی تھا اور ہم تینوں کا کرکٹ سے صرف اتنا ہی واسطہ تھا کہ یہ کھیل پاکستان میں کھیلا جاتا ہے اور ہم پاکستانی تھے۔ البتہ جس بات نے اس جھوٹ پر پردہ ڈالے رکھا وہ پاکستانی کرکٹرز سے ہماری واقفیت تھی۔ کیونکہ سبھی نامور کھلاڑی پی۔ آئی۔ اے میں میرے ساتھ کام کرتے تھے۔ ان میں حنیف محمد' پرویز سجاد' آصف اقبال' آصف مسعود' سلیم الطاف' شفقت رانا' طلعت علی وغیرہ جیسے لوگ شامل تھے اور ان لوگوں کی کہانیاں سنا سنا کر ہم سردار جی کی تسلی بھی کرتے رہے۔ اور' پٹیالے' بھی چلتے رہے۔

رات نو بجے سردار جی کی ڈیوٹی ختم ہوئی تو وہ ساقی سے ہمارا ساتھی بن گیا۔ ساتھی بھی ایسا کہ گویا کمبل ہو گیا۔ وہ بضد تھا کہ رُک کے۔ ایل میں سیر وہ کرائے گا۔ کیونکہ یہ اسکی عزت کا معاملہ تھا۔ آخر ہم لوگ اسکی زبان بولتے تھے۔ اگر 'اساں' تمہاری خدمت نہ کی تو پنجاب کی ناک کٹ جائے گی۔ سردار پوری ایمانداری سے یہ دعویٰ کر رہا تھا۔ کیونکہ پنجابی زبان تو اگر طوطا بھی بول دے تو سکھ اسے چُوری کھلا دیتے ہیں۔ ہم تو پھر انسان تھے' جیسے بھی تھے۔ چنانچہ پنجاب کی ناک بچانے کی خاطر ہم سولی پر چڑھ گئے۔ کیونکہ اس حال میں سردار جی کی گاڑی میں سوار ہونا سولی پر

چڑھنے سے کم نہ تھا۔ درویش اول نے سرحد کے درویش دوم کو سردار جی کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر دھکیل دیا۔ پھر مجھ سرائیکی سپیکنگ درویش سوم کو گاڑی کی پچھلی سیٹ پر اس جانب بیٹھنے کو کہا جدھر سے مخالف سمت کی ٹریفک گزرتی تھی۔ اور آخر میں خود سوار ہوا۔ سردار جی سیٹوں کے اس بٹوارے سے بے خبر 'کلی' دبائے چلے جا رہے تھے۔ اور ہم لوگ ہر خطرے سے بے خبر اس کلب کے بارے میں خیالی قلعے بنا رہے تھے جہاں سردار جی اڑاتے ہوئے ہمیں لے جا رہے تھے۔ کیسی کیسی شاہراہیں' چوک اور گلیاں پلک جھپکتے ہی گزر گئیں اور ہمارے فلائینگ ٹائیگر نے سیلنگور کلب کے سامنے گاڑی جا کھڑی کی۔ اس کلب میں ہر سو اندھیرا ہی اندھیرا دکھائی دے رہا تھا۔ نہ کلبوں کے روایتی جگ مگ کرتے نیون سائین تھے اور نہ للچانے' رال ٹپکانے والے پوسٹر۔ بس لمبا اندھیرا اور طویل خاموشی۔ یہ کوئی برطانوی طرز تعمیر کی خوبصورت اور بڑی سی عمارت تھی' جس میں سردار جی کی راہنمائی میں ہم چلے جا رہے تھے۔ ایک ہال میں داخل ہوئے تو اس کلب کا راز کھل گیا۔ یہ وہ کلب نہیں تھا جسکے لالچ میں ہم پنجاب کی ناک بچانے سردار کی گاڑی میں بیٹھے تھے۔ بلکہ یہ وہ کلب تھا جسکی ہمیں پہلے سے خبر ہوتی تو اپنی ناک بچانے کے لیے بھی سردار جی کی گاڑی میں ہرگز نہ بیٹھتے۔ درویش اول کے جھوٹ کی سزا ہم سب کو مل رہی تھی۔ دراصل یہ ایک سپورٹس کلب تھا۔ جس میں کھلاڑیوں کی قد آدم تصویریں آویزاں تھیں۔ چونکہ رات کے کھیل سپورٹس کلبوں کی بجائے نائٹ کلبوں میں ہوتے ہیں' اس لئے اس کلب میں خاموشی اور سناٹا تھا۔ ہال سے نکل کر بار میں پہنچے تو وہاں بھی ایک سردار جی موجود تھے۔ رات دس بجے تو دنیا کے سبھی سردار جی 'کٹ' ہو چکے ہوتے ہیں۔ چنانچہ وہ بھی ہمارے ساتھی سردار جی کی طرح کئی 'پٹیالے' پار کر چکے تھے۔ سردار جی نے مصافحہ بعد میں کیا اور ڈیڑھ فٹ لمبی دارو کی شیشی پہلے میز پر ٹکا دی۔ اتنا تو مینڈک پانی نہیں پیتے جتنا سردار جی دارو پیتے ہیں۔ دوسرے سردار جی پہلے سردار جی کی طرح کرکٹ کے شیدائی بھی تھے اور اس کلب کے سیکرٹری بھی تھے۔ چنانچہ کرکٹ کی

دھجیاں اڑنے لگیں۔

دھوتی باندھے بنیان پہنے قصور کا بنیا وہاں کا خانساماں تھا۔ جس نے آلو کی بھجیا' ماش کی دال اور چپاتی سے ہماری خاطر کی۔ اور ہر گرم چپاتی دینے کے بعد یہی فقرہ دہرایا۔ "جناب آپ لہور سے آئے ہیں آپکے لئے جان بھی حاضر ہے چپاتی کیا چیز ہے" درویش دوم نے 'پٹیالوں' کی کسر چپاتیوں پر نکال دی' یہاں تک کہ قصور کے بنیئے کی لہور سے محبت سرد پڑ گئی اور اس نے وہ فقرہ دہرانا بند کر دیا۔ کرکٹ کو دفن کرتے کرتے رات ڈھل چکی تھی۔ روانگی کا اعلان ہونے سے پہلے بنیئے نے مولی کے جوس کا ایک ایک گلاس سب کو دیا۔ آدھی رات کو مولی کا پانی پینے کا ہمیں تو کوئی جواز نظر نہ آیا ۔ مگر سردار جی نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ 'پو جی پو' پینے والوں کے لئے مولی کا پانی بڑا اکسیر ہوتا ہے۔ صبح تک ہر شے کو بھسم کر دیگا"۔ اور واقعی مولی کے رس نے ہر شے کو بھسم کر دیا اور ہم سب تازہ دم ہو کر اٹھے۔

کوالالپور میں بڑی کمینی قسم کی گرمی پڑتی ہے۔ سورج سوا نیزے پر ہوتا ہے اور بادل پون نیزے پر۔ بادل اور بجلی بھوکی بلیوں کی طرح متواتر لڑتے رہتے ہیں۔ بجلی کی کڑک اور بادل کی گرج سے دل دہل دہل جاتے ہیں۔ ہوا میں نمی اس قدر ہوتی ہے کہ نہانے کی چنداں ضرورت نہیں رہتی۔ جو لباس پہنیں تولیہ سا بن کر رہ جاتا ہے۔ درویش اول نے اس گرمی کا مقابلہ کرنے کے لئے اپنا ڈیرہ غازی خان کا روایتی لباس پہن لیا' خوبصورت کڑھائی والا سفید کرتا اور شلوار' پاؤں میں سلما ستارے والا چمکدار کھسہ اور گرمی سے بچاؤ کی خاطر سر پر رومال اوڑھ لیا۔ اگر کمی تھی تو عربوں کے مخصوص "فین بیلٹ" کی' جو اکثر عرب سر پر اوڑھے رومال کے اردگرد کس لیتے ہیں تاکہ رومال اڑ نہ سکے۔ جونہی ہم ہوٹل کی لابی سے باہر نکلے ٹیکسی ڈرائیوروں نے ہمارے گرد گھیرا ڈال دیا اور ہر ڈرائیور "یا شیخ .... یا شیخ" کہہ کر اپنی ٹیکسی کی طرف کھینچنے لگا۔

ٹیکسی ڈرائیوروں کی اس آؤ بھگت کا راز تب کھلا جب ہم ایک ٹیکسی میں سوار

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہو کر غار بطو کی سیر کو نکلے۔ ٹیکسی ڈرائیور نے بڑے احترام کے ساتھ درویش اول سے گزارش کی کہ یا شیخ میں نے آپ کو پہچان لیا ہے۔ آپ پچھلے سال بھی یہاں سے نرسیں رکروٹ کرنے آئے تھے۔ نادان ٹیکسی ڈرائیور لباس سے دھوکہ کھا گیا۔ قبل اس کے درویش اول حقیقت بیان کرتا' درویش دوم کی عیاری جاگ اٹھی اور اس نے فوراً ڈرائیور کو تسلی دیتے ہوئے کہا کہ اس سال جتنی نرسیں بھرتی کریں گے ہر نرس پر تمہیں بیس ڈالر انعام ملے گا۔ بس ہمارے قیام کے دوران تم ہمیں شہر کی سیر کراؤ اور اچھی اچھی نرسوں کو ہمارے ہوٹل میں لے آؤ۔ ٹیکسی ڈرائیور تو اس بات پر تقریباً نیم پاگل سا ہو گیا اور شیخ صاحب یعنی درویش اول کو خوش رکھنے کے لئے جان تک قربان کرنے کو تیار ہو گیا۔ پٹرول کے پیسے نے جہاں ان گنت گھروں کو آباد کیا ہے وہاں اتنے ہی گھروں کو برباد اور بے آبرو بھی کر دیا ہے۔ اپنے ملک میں بھی ایسے ہزارہا قصبے ہیں جہاں ان گنت خاندان اس ستم کا شکار ہوئے ہیں۔ پنجاب اور فرنٹیر میں تو سینکڑوں گاؤں ایسے ہیں جہاں بچوں اور بوڑھوں کے علاوہ کوئی مرد باقی نہیں رہا۔ بس عورتیں ہی عورتیں دکھائی دیتی ہیں۔ ویسے تو پٹرول کی سرزمین میں عورتوں کی بھی بڑی مانگ ہے اور پاکستان کے دو شہروں یعنی لاہور اور کراچی نے اس مانگ کو پورا کرنے کی کوشش بھی کی ہے۔ اس کوشش میں لاہور کا شاہی محلہ اور کراچی کا ایک مخصوص طبقہ جسے فیشن ایبل طبقہ کہتے ہیں شامل ہیں۔ مگر سرکاری سرپرستی کی غیر موجودگی میں یہ کاروبار دیرپا ثابت نہ ہوا اور ہمارے معزز بھائیوں کو یہ را میٹیریل حاصل کرنے کے لئے مشرق بعید کا رخ کرنا پڑا۔ ہمارا ٹیکسی ڈرائیور یوریشین نسل کا پڑھا لکھا نوجوان تھا۔ یوریشین نسل کے لوگ جزیرہ فجی' آسٹریلیا' سنگاپور اور ملیشیا میں ملتے ہیں۔ ان لوگوں کا آبائی وطن تو جنوبی ہندوستان ہے مگر مختلف نسلوں اور مذہبوں کے پیوند نے اک نئی نسل کو جنم دیا جو یوریشین نسل کہلاتی ہے۔ ہمارا ڈرائیور بہت اچھی انگریزی جانتا تھا۔ چنانچہ وہ ڈرائیور کے علاوہ ہمارا گائیڈ بھی بن گیا۔ ادھر درویش اول نے چپ سادھ لی۔ جب کبھی بات کرتا تو اردو میں بات کرتا' جس کا ترجمہ درویش

دوم کر دیتا۔ اس طرح معصوم ڈرائیور پر شیخ صاحب کا رعب اور بڑھ جاتا۔

غار باطو ۱۸۷۸ء میں دریافت ہوئی۔ لائم سٹون کے سفید اور پیلے پتھروں والی گھنے جنگل میں گھری پہاڑی پر ۲۷۲ سیڑھیاں چڑھ کر غار تک پہنچیں تو بھگوان سبرا مینیم کا مندر ہے۔ روم کے ہسپانوی زینوں کی طرح ان سیڑھیوں تک چڑھتے چڑھتے بھگوان تک پہنچنے کا پروگرام تو ویسے ہی بن جاتا ہے۔ بھاری بھرکم درویش دوم کو تو اس کے اس جھوٹ کی سزا فوراً ہی مل گئی تھی جو اس نے معصوم ٹیکسی ڈرائیور سے رچایا تھا۔ غار باطو کے اندر پجاریوں سے کہیں زیادہ چمگادڑیں تھیں جو غار کی چھت سے لٹکی ہوئی تھیں۔ غار کے اندر جگہ جگہ سے پانی برستا رہتا ہے۔ ہمارے گائیڈ نے بتایا کہ غار میں سفید رنگ کے سانپ بھی بکثرت پائے جاتے ہیں جو شام ڈھلے اپنی پناہ گاہوں سے نکل کر زینوں تک پہنچ جاتے ہیں۔ سانپ سفید ہوں یا کالے آخر سانپ ہوتے ہیں۔ سانپوں کا نام سنتے ہی میں تو فوراً وہاں سے کھسک لیا۔ کیونکہ کوئی سر پھرا سانپ اگر شام سے پہلے ہی سیر کی ٹھان لے تو ہم اسکا کیا بگاڑ سکتے تھے۔ ادھر درویش دوم غار کے دہانے پر سیڑھی سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ اور اس طرح بیٹھا تھا جیسے صدیوں سے وہیں بیٹھا ہوا ہو اور ہمیشہ یہیں بیٹھا رہے گا۔ البتہ درویش اول مندر پر چڑھاوے چڑھانے والی پجارنوں کے سبب اس طرح ساکن کھڑا تھا گویا ہنومان کا مجسمہ ہو۔ ہنومان کے اصلی پوتے شاخ شاخ قلابازیاں لگاتے پھرتے تھے۔ مجھے نہ تو ہنومان سے دلچسپی تھی اور نہ پجارنوں سے۔ چنانچہ میں نے تو واپسی کا سفر اختیار کیا۔ ابھی میں آدھے راستے میں تھا کہ دونوں درویش زینوں کے ساتھ چلتی ریل کار میں سوار ہاتھ ہلاتے ہوئے گزر گئے۔ غار تک اوپر جانے کے لئے تو ریل کار میں جانا سمجھ میں آتا ہے بھلا اوپر سے نیچے آنے میں ریل کار کی سواری کا کیا مقصد تھا۔ ماسوا اسکے کہ ریل کار نوجوان پجارنوں سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔

غار باطو اگرچہ کوالالمپور سے صرف ۱۳ کلو میٹر کے فاصلہ پر واقع ہے مگر یہاں بھی سیاحوں کی سہولت کے لئے درجنوں کھانے پینے کی جگہیں اور شاپنگ کے لئے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

دکانیں موجود ہیں۔ وہیں باتیک کی فیکٹریاں بھی ہیں۔ جہاں سیاحوں کی دلچسپی کے لئے پہلے باتیک کی رنگائی اور چھپائی کا کام دکھایا جاتا ہے اور بعد میں شاپنگ کا شوق پورا کرنے کے لئے شو روم میں لے جایا جاتا ہے۔ باتیک بھی سندھی اجرک کی طرح کا کپڑا ہوتا ہے جسکی بناوٹ کی ابتدا تو انڈونیشیا میں ہوئی مگر اب ملیشیا والوں نے بھی اس کپڑے کی چھپائی میں بڑا کمال حاصل کر لیا ہے۔ پہلے کپڑے پر موم سے ڈیزائین بنائے جاتے ہیں۔ پھر کپڑے کو رنگ میں ڈال دیا جاتا ہے۔ جہاں موم لگا ہوتا ہے صرف وہاں رنگ نہیں چڑھتا باقی کپڑا رنگ جاتا ہے۔ اس کے بعد کپڑے کو گرم پانی میں ڈال کر موم اتار لیا جاتا ہے۔ یہی عمل کئی مرتبہ دہرایا جاتا ہے اور کپڑے پر مختلف رنگوں کے مختلف ڈیزائین بنادیئے جاتے ہیں۔ صدیوں پہلے جب انڈونیشیا والوں نے باتیک کی چھپائی کا کام شروع کیا تو اس وقت مختلف پھولوں اور درختوں کی کھال سے رنگ حاصل کیا جاتا تھا۔ مگر اب وہاں بھی کیمیادی رنگوں سے باتیک تیار کی جاتی ہے۔

غار باتو سے واپسی پر ڈرائیور ہمیں کوہ انناس Bukitnanas لے گیا۔ دراصل وہاں جانے کے لئے درویش دوم نے اصرار کیا تھا۔ کیونکہ وہ انناس سے بہت رغبت رکھتا تھا۔ کسی زمانے میں اس پہاڑی پر انناس کے باغات ہوا کرتے تھے اور اسی نسبت سے اسکا نام بھی کوہ انناس مشہور ہوا۔ مگر اب وہاں ایک خوبصورت پارک ہے۔ کیبل کار یعنی برقی جھولے ہیں اور شہر کے خوبصورت نظارے ہیں۔ نہیں ہیں تو انناس کے باغات۔ چنانچہ درویش دوم نے فورا وہاں سے کوچ کا اعلان کر دیا۔

درویش اول گناہ و ثواب کی بیلنس شیٹ کے توازن کا بہت خیال رکھتا تھا۔ کبھی گناہ کرنے کے بعد اس پر ثواب کا غلاف چڑھا لیتا اور کبھی گناہ کرنے سے پہلے۔ چونکہ نرسوں کو رکروٹ تو رات کے وقت کرنا تھا' اس لئے اس نے دن کے وقت بہت ہی معصوم قسم کی سیاحت کی طرف دھیان رکھا۔ چنانچہ کوہ انناس کے بعد سیدھے "نیشنل ماسک" قومی مسجد گئے۔ یہ مسجد مشرق بعید کی خوبصورت ترین مسجد ہے۔ فیصل مسجد اسلام آباد اور نیشنل مسجد کوالالمپور یقینا دنیا کی خوبصورت ترین جدید مسجدیں ہیں۔ یہ مسجد پانچ سال کی مدت میں ۱۹۶۵ میں مکمل ہوئی اور اسکی تعمیر میں ملیشیا کے تمام مذاہب نے حصہ لیا۔ درحقیقت یہ مسجد وہاں کی مذہبی ہم آہنگی کا نشان ہے۔ مسجد کا مرکزی گنبد ۱۸ نکڑوں والے ستارے کی مانند بنایا گیا ہے' جو ملیشیا کی تیرہ ریاستوں اور اسلام کے پانچ بنیادی اصولوں کی ترجمانی کرتا ہے۔ نوکدار بھالے کی مانند ۷۲ میٹر اونچا ایک مینار ہے' جسکے اندر باقاعدہ لفٹ لگی ہوئی ہے۔ یہ مینار موذن کے لئے کم اور سیاحوں کے لیے زیادہ استعمال ہوتا ہے۔ درحقیقت ایمان والوں کو تو ان کے فرض کی یاد دہانی کے لئے بلند و بالا میناروں اور لاوڈ سپیکروں کی چنداں ضرورت نہیں ہوتی۔ اور خاص طور پر موجودہ دور میں جب انسان گھڑی کی سوئیوں میں جکڑا ہوا ہے۔ درویش اول لفٹ میں ہرگز سوار نہیں ہوتا۔ درویش دوم کو مفت کی کسی قسم کی لفٹ بھی ملے تو گریز نہیں کرتا۔ درویش سوم کچھ سائیکل کے پیڈل نما تھا' جو آگے بھی گھوم جاتا تھا اور پیچھے بھی۔ مینار پر جانے کے لئے باقاعدہ بحث ہوئی۔ ہمارے گائیڈ نے پُر زور اپیل کی کہ مسجد کے مینار سے شہر کے بڑے خوبصورت نظارے ہوتے ہیں۔ اگر آپ لوگ مینار پر نہ گئے تو "کے۔ ایل" کی سیر ادھوری رہ جائے گی۔ چونکہ درویش اول درویش نہیں اب شیخ تھا اور شیخ بھی شیخ چلی نما شیخ نہیں بلکہ باقاعدہ عرب شیخ۔ چنانچہ وہ بھی بلا حیل و حجت لفٹ میں سوار ہو گیا۔ اس لفٹ میں کچھ ملیشین طالب علم بھی سوار تھے۔ کم بخت ڈرائیور نے شو مارنے کے لئے ہمارے شیخ صاحب کے بارے میں ان کو بتایا۔ طلبہ میں سے ایک نوجوان قاہرہ کی الازہر یونیورسٹی کا طالب علم تھا۔ ملیشیا کے طلبہ اور طالبات کی ایک بھاری تعداد اسلامی تعلیم اور عربی سیکھنے کے لئے قاہرہ جایا کرتی ہے۔ اس نوجوان نے درویش اول پر عربی زبان کا بھرپور حملہ کیا۔ ہم میں سے کوئی بھی اس اچانک حملے کے لئے تیار نہ تھا۔ میں تو اتنا بوکھلا گیا کہ اگر لفٹ میں کوئی کھڑکی ہوتی تو یقینا باہر کود جاتا' اور اگر باہر کودنے کی خود میں ہمت نہ ہوتی تو درویش دوم کو تو باہر ضرور دھکیل دیتا جس نے یہ جھوٹ بول کر ہمیں مشکل میں

پھنسایا تھا۔ خدا کا شکر کہ مسجد کے اس مینار پر جوتے پہن کر جانے کی اجازت نہیں ورنہ خدا جانے کس کا جوتا کس کے سر پر ہوتا۔ مگر قربان جائیں درویش اول کی ذہانت کے۔ دراصل جب سے وہ درویش سے شیخ بنا تھا۔ اس نے چپ سادھ لی تھی۔ اگر کبھی کوئی بات کرتا بھی تو درویش دوم کے ذریعے۔ اب وہی کاروائی ہماری جان بخشی کے کام آئی۔ طویل خاموشی کے بعد درویش اول نے ایک چٹ پر کچھ لکھ کر درویش دوم کے حوالے کیا۔ درویش دوم نے طالب علم کو انگریزی میں کہا کہ شیخ صاحب دوران سفر کسی اجنبی سے ہم کلام نہیں ہوتے۔ اگر تمہیں سکالر شپ کی ضرورت ہے تو شیخ صاحب اسکا بندوبست کر دیں گے۔ تم کل دوپہر کو ان کے ہوٹل میں حاضری دینا۔ اس سخاوت کا اتنا شدید اثر ہوا کہ تمام طلبہ پورے وقت تقریباً" رکوع کے پوز میں سرجھکائے کھڑے رہے اور کسی نے شیخ صاحب کی جانب آنکھ تک اٹھا کر نہ دیکھا۔ نیشنل ماسک کے قریب ہی "کے۔ ایل" کا ریلوے سٹیشن ہے جو مورش طرز تعمیر کے سبب قابل دید عمارت ہے۔ خدا خبر برطانوی حکومت کو کیا سوجھی کہ انہوں نے "کے۔ ایل" میں مورش طرز تعمیر کی تین عمارتیں بنا ڈالیں۔ فیڈرل سیکرٹریٹ، جنرل پوسٹ آفس اور ریلوے سٹیشن۔ ان عمارتوں کو دیکھ کر "کے۔ ایل" پر کسی الف لیلوی شہر کا گمان ہوتا ہے۔ دوپہر ڈھلے سیر ختم ہوئی تو ہم نے ہوٹل کا رخ کیا۔ کیونکہ شام کو نرسوں کے انٹرویوز بھی لینے تھے، جس کے لئے آرام کی سخت ضرورت تھی۔

کوالا لمپور کے معنی ہیں گدلے دریا کا دہانہ۔ ۱۸۵۹ء میں جب دو چینی تاجروں نے شہر کی بنیاد رکھی تو اسوقت یہاں دریائے گوم باک اور دریائے کلانگ کے سنگم پر مچھیروں کی ایک چھوٹی سی بستی موجود تھی۔ کوالالمپور کے قریب ٹن کی کانیں دریافت ہوتے ہی یہاں کی اہمیت اور آبادی میں اضافہ ہونا شروع ہوگیا۔ اور صرف ایک سو سال کے عرصے میں مچھیروں کی یہ بستی مشرق بعید کے خوبصورت دارالحکومتوں میں شمار ہونے لگی۔

لیک گارڈنز" "کے۔ ایل" یعنی کوالالمپور کی خوبصورت ترین سیرگاہ ہے جو وسیع علاقے میں پھیلی ہوئی ہے۔ یہاں مصنوعی جھیل، پارلیمنٹ بلڈنگ، شاہی محل، نیشنل مونیومنٹ اور عجائب گھر ہے۔ اس سیرگاہ میں ہر مزاج اور ہر شوق کی تسکین کا بندوبست ہے۔ مگر جس شوق میں ہم نے ملیشیا کے ہر عمر کے لوگوں کو الجھا ہوا پایا وہ پتنگ بازی ہے۔ یہ پتنگ بازی ایک ایسا کھیل ہے جو دنیا کے ہر ملک میں جانا اور پہچانا جاتا ہے۔ البتہ اس کھیل کو کہیں تو دیوانگی کی حد تک اپنایا جاتا ہے اور کہیں صرف کھیل تک۔ مثلاً" زندہ دلان لاہور کی زندہ دلی گو صرف پتنگ بازی ہی تک محدود ہو کر رہ گئی ہے، مگر ان کی زندہ دلی نے اس کھیل کو ایک خوبصورت تہوار بنا دیا ہے۔ اگرچہ لاہور کے بسنت کا رنگ اور سماں تو دنیا کے کسی ملک میں نہیں ملتا، البتہ پتنگ سازی میں برازیل، جاپان اور ملیشیا بڑی مہارت رکھتے ہیں اور وہاں بنائے گئے پتنگ ڈیزائین، سائز اور مٹیریل کے لحاظ سے یہاں کے پتنگوں سے بہت بہتر ہوتے ہیں۔ ملیشیا کے پتنگ باز بھی لاہوری پتنگ بازوں کی طرح پیچ ڈالنے کے تو ماہر ہیں، البتہ "بو" ہونے یعنی گڈی کٹنے پر بھنگڑا نہیں ڈال سکتے، ڈھول نہیں پیٹ سکتے" "او بکری" کے نعرے نہیں لگا سکتے، کٹی پتنگ والوں کو ذلیل کرنے کے لئے مخصوص آوازیں نہیں نکال سکتے، کلاشنکوف بھی نہیں چلاسکتے اور گڈی لوٹنے کے لئے چھتوں سے بھی نہیں گرتے۔ شاید اپنی ان سب باتوں کے سبب لاہور والے زندہ دلان لاہور کہلاتے ہیں اور "کے۔ ایل" والے زندہ دلان "کے۔ ایل" نہیں کہلاتے صرف پتنگ باز کہلاتے ہیں۔

پتنگ بازی کی طرح کا ایک اور کھیل بھی ہے جو دنیا بھر میں صدیوں سے کھیلا جاتا ہے اور بہت مقبول ہے۔ یہ کھیل کھلے میدانوں کے بجائے تنگ گلیوں اور بند کمروں میں کھیلا جاتا ہے اور اس کے کھلاڑی یہ کھیل تماشائیوں سے آنکھ بچا کر کھیلتے ہیں۔ ہندوستان اور پاکستان میں یہ کھیل دنیا کے تمام ممالک سے بالکل مختلف ہے۔ کیونکہ یہاں کی ہیرا منڈیوں میں رقص و موسیقی کو اولیت دی جاتی ہے جنس کو نہیں، جبکہ دوسرے ممالک میں صرف جنسی کھیل ہی کھیلے جاتے ہیں۔ "کے۔ ایل" کا وہ بازار بھول بھلیاں والا بازار ہے۔ ٹیڑھی ترچھی تنگ و تاریک گلیاں جہاں پیشہ ور خواتین

اور خواتین کے لباس میں پیشہ ور لڑکے ہر ذوق و شوق کی تسکین کے لئے موجود ہوتے ہیں۔ جس گھر میں کھیل جاری ہوتا ہے اسکے سامنے لال بتی جلا دی جاتی ہے۔ شاید اسی لئے اس بازار کو ریڈ لائیٹ ایریا بھی کہتے ہیں۔

شام ڈھل چکی تھی۔ نرسوں کے انٹرویوز کا وقت قریب تھا۔ تینوں درویش کمرے میں بھوکے شیروں کی طرح ٹہل رہے تھے۔ دوپہر کے آرام نے درویش اول کی بیٹری چارج کر دی تھی۔ چنانچہ اسکی جاپانی کھلونے سی چال میں بلا کی پھرتی آگئی تھی۔ جب تک دوسرے درویش کمرے کا ایک چکر کاٹتے درویش اول دو چکر لگا لیتا۔ دروازے پر دستک ہوئی تو ست الوجود درویش دوم چیتے کی طرح دروازے کی طرف لپکا اور دروازہ کھول دیا۔ دروازہ کھلتے ہی تینوں درویشوں پر اوس سی پڑ گئی' کیونکہ سامنے نرسوں سے ملانے والا یوریشین ڈرائیور نہیں بلکہ سلیم طوطا مع اپنی ٹیڑھی ناک کے کھڑا تھا۔ سلیم طوطے کی یوں ناگہانی آمد درویشوں کے لئے ناگہانی موت سے کم نہ تھی۔ کیونکہ نرسوں کے اس کھیل میں سلیم طوطے کی ناک اگر تیر بھی ہوتی تو اسکا ساتھ ہمیں گوارا نہ تھا۔ وہ تو تھا ہی ٹیڑھی ناک والا اور ٹیڑھی ناک والے بڑے خطرناک ہوتے ہیں۔ بھلا اسے ہم کیونکر اپنے ہمراہ لے جاتے۔ ویسے تو ہم پاکستانی ہر عیب کرتے ہیں اور کھلے بندوں' ڈنکے کی چوٹ کرتے ہیں' ہر ملک میں عیب کرتے ہیں اور ہر طرح سے عیب کرتے ہیں' البتہ دوسرے ہم وطنوں سے اپنے عیبوں کو چھپانا لازمی ہے کہ یہی دوغلا پن ہمارا قومی تشخص ہے۔ درویش اول نے مجھے اپنے پاس بلا کر میرے کان میں سرگوشی کی۔ میرا رنگ ہلدی ہو گیا اور میں نے زبردست احتجاج کیا۔ اس نے پھر سرگوشی کی۔ بھئی سلیم طوطے کو تم جانتے ہو اور لاہور سے جانتے ہو۔ ہمارا بھلا اس سے کیا واسطہ۔ تم اپنے لاہور کے رشتے نبھاؤ اور ہماری جان چھوڑو۔

مجھے اس نے دوبارہ احتجاج کرنے کا موقع ہی نہیں دیا اور درویش دوم کو اپنے ہمراہ لے کر نرسوں کے انٹرویوز کے لیے نکل گیا۔ وہاں رہ گئے ہم' سلیم طوطا اور اسکی ٹیڑھی ناک۔ میرا بار بار جی چاہا کہ سلیم طوطا کی ناک پر ایک گھونسہ رسید کروں' مگر ایسا کرنے سے اسکی ناک سیدھی ہونے کا خطرہ تھا اور یہ احسان میں اس پر کرنا نہیں چاہتا تھا۔

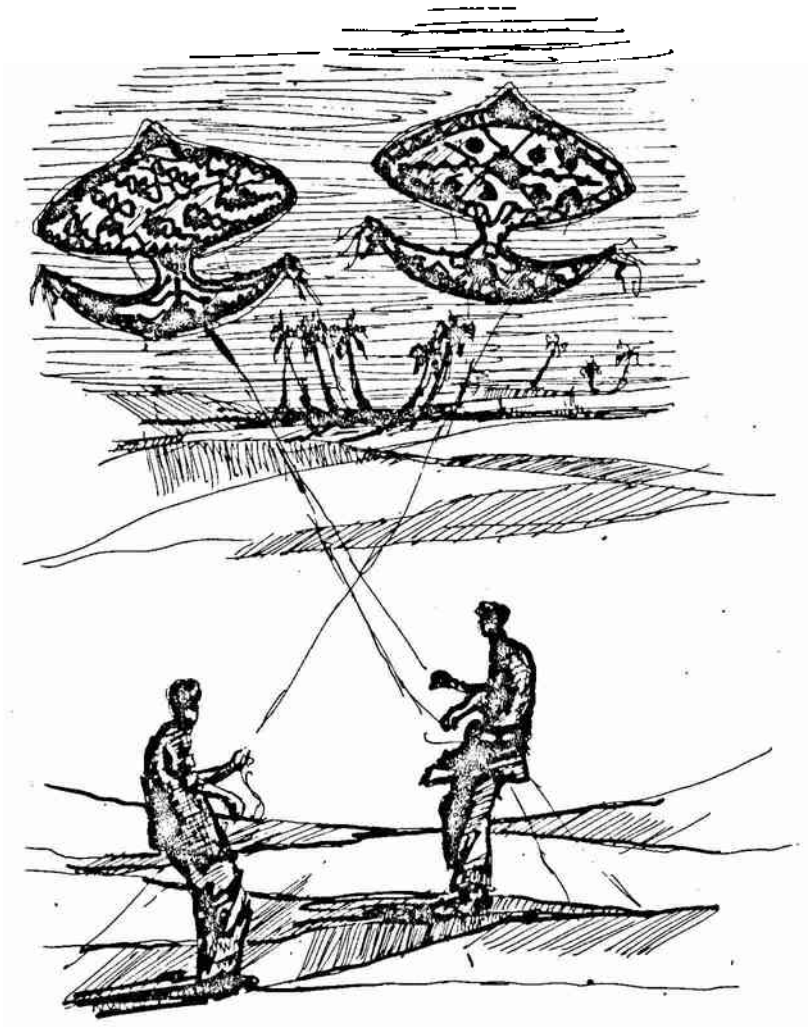

www.iqbalkalmati.blogspot.com

انڈونیشا

www.iqbalkalmati.blogspot.com

صبح کی پہلی کرن سے پہلے ہمارا طیارہ انڈونیشیا کی پر سکون فضاؤں میں چنگھاڑ رہا تھا۔ درویش دوم خواب خرگوش سے بیدار ہوا اور حسب معمول سیدھا ٹائیلٹ کی طرف چل دیا۔ وہاں مختلف سائزوں' عمروں اور نسلوں کے لوگوں کی پہلے ہی بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ ادھر سرخ منی سکرٹوں میں نیم ڈھکی تانبے سی رنگت والی فضائی میزبانیں لچک لچک کر مسافروں کے سامنے ناشتے کی ٹرے رکھ رہی تھیں۔ جیسے ہی وہ قریب پہنچتیں درویش اول کبوتر کی طرح آنکھیں بند کر لیتا' نگران کے مڑتے ہی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر تاڑتا اور بھانپتا۔ شاید اسی طرح وہ اپنی بھوک میں اضافہ کر رہا تھا۔ نیچے نیلگوں سمندر کے سینے پر سینکڑوں چھوٹے چھوٹے جزیرے پھیلے ہوئے تھے۔ سلطنت انڈونیشیا میں اسی طرح کے ساڑھے تیرہ ہزار جزیرے ہیں جن میں کوئی چھ ہزار جزیرے تو ایسے ہیں جہاں پرندوں اور درندوں کے علاوہ کوئی آبادی نہیں۔ بتیس سو میل لمبائی اور بارہ سو میل چوڑائی میں پھیلے ہوئے جزیروں کی اس سلطنت کا جکارتہ سے رابطہ قائم کرنے کے لئے ایک مضبوط بحریہ کی ضرورت ہے۔ اسی لئے انڈونیشیا کی بحریہ جنوب مشرقی ایشیا کی مضبوط ترین بحریہ سمجھی جاتی ہے۔

ملائیشیا میں ہماری آخری رات بڑی تلخ تھی۔ اور وہی تلخی دوران سفر بھی اپنی تلخی دکھا رہی تھی۔ درحقیقت مجھے نرسوں سے ملاقات کی محرومی کا بیحد دکھ تھا۔ جسکا میں کھلے بندوں اعتراف بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ دونوں درویشوں پر سلیم

www.iqbalkalmati.blogspot.com

طوطے کی بے عزتی کا الزام دھرا اور ان سے سفارتی تعلقات توڑ لئے اور اعلان کر دیا کہ آیندہ میں ان کا سامان ہرگز ہرگز نہیں اٹھاؤں گا۔ حقیقت یہ ہے کہ غیر معمولی شاپنگ سے ان کے سامان کا وزن بڑھتا جا رہا تھا اور روز بروز کے فاقوں سے میرا وزن گھٹتا جا رہا تھا۔ لہٰذا ایک ہی جھٹکے میں مَیں نے دونوں درویشوں سے اپنا بدلہ لے لیا۔ تاہم وہ بھی کوئی کچی گولیاں نہیں کھیلے تھے۔ درویش اول نے فوراً" جوابی حملہ کیا اور دھمکی دیدی کہ یہاں اگر تم ہمارا یہ سامان نہیں اٹھاؤ گے تو تمہارا پاسپورٹ ہم اپنے بریف کیس میں نہیں رکھیں گے۔ بھلا مَیں اس گیدڑ بھبکی میں کب آنے والا تھا۔ مَیں نے فوراً اپنا پاسپورٹ واپس لے لیا۔ اور ویسے بھی کمینگی کے تو ہم تسلیم شدہ بادشاہ ہیں۔ چاہیں تو پوری کائنات سے آنکھیں پھیرلیں، مگر درویش اول بلوچ تھا اور بلوچوں کی یاری دوستی کے بارے میں کسی شاعر کا قول ہے۔

سسی نوں ماں متاں دیوے چھڈ بلوچ دی یاری
اگلی رات قیام جنہاں دا تے پچھلی رات تیاری

درویش اول کی اس خصلت کے علاوہ بھی ہماری ایک مجبوری تھی۔ وہ مجبوری ہرگز یہ نہ تھی کہ اگر ان درویشوں سے بات چیت نہ کی تو کھانا ہضم نہ ہوگا۔ بلکہ مجبوری یہ تھی کہ ان سے صلح نہ ہوئی تو کھانا ملے گا ہی نہیں، کیونکہ سفر خرچ کی جو جمع پونجی تھی وہ تو سفر شروع ہوتے ہی کمپیوٹر دماغ درویش دوم کے حوالے کر دی گئی تھی۔ پھر کھانا ٹھہرا ہماری کمزوری، جس سے یہ دونوں گھر کے بھیدی بخوبی واقف تھے۔ چنانچہ میں فوراً" امن کی فاختہ بن گیا اور جس طرح بیچاری امن کی فاختہ دنیا میں ذلیل ہو رہی ہے اسی طرح ذلیل ہوتا رہا، جب تک دونوں درویشوں نے یہ تسلی نہ کرلی کہ میں ان سے نرسوں کے بارے میں قطعاً" کچھ سوال ووال نہ کروں گا اور سامان اٹھانے سے کبھی انکار نہ کروں گا۔ سفارتی تعلقات بحال ہوتے ہی میرا پاسپورٹ درویش اول کے بریف کیس میں تھا اور دونوں درویشوں کا سامان میرے کندھوں پر۔ درویش دوم نے مجھے ہمت و حوصلہ دینے کی خاطر یہ بھی سنا دیا کہ اچھا ہوا مَیں انکے ہمراہ نہ تھا

کیونکہ نرسیں بالکل بیکار تھیں۔ نرسیں لاکھ بیکار ہوں سلیم طوطے سے تو یقیناً بہتر ہونگی اتنا تو مَیں بھی جانتا تھا۔

ہمارا طیارہ جکارتہ کے حلیم انٹرنیشنل ایئرپورٹ پر اترا، لیکن طیارہ اترتے ہی مسافروں میں بھگدڑ سی مچ گئی۔ اگر ان کا بس چلتا تو وہ دروازہ کھلنے کا بھی انتظار نہ کرتے بلکہ کھڑکی ہی سے باہر چھلانگیں لگانا شروع کر دیتے۔ چونکہ جہاز جہاز ہوتا ہے بس نہیں ہوتی حتیٰ کہ ایئربس بھی جب جہاز بنتی ہے تو اس کی کھڑکیاں بھی تا قیامت بند ہونے کے لئے بنائی جاتی ہیں۔ اسی لئے بیچارے مسافروں کو مجبوراً" دروازہ کھلنے تک جہاز ہی میں رکنا پڑا۔ دنیا کے تمام ایئرپورٹوں کے لوازمات تقریباً" یکساں ہی ہوتے ہیں، جسکی ہمیں خوب پریکٹس ہو چکی تھی۔ چنانچہ بلا حیل و حجت ہم بھی ایئرپورٹ کے باہر آگئے۔ دونوں درویشوں سے نئی نویلی صلح کے سبب میں اتنا تابعدار ہو گیا تھا کہ ان کا سامان تو سامان خود انہیں اٹھانے پر آمادہ تھا۔ حالانکہ درویش دوم کو اٹھانے سے تو کرین کی کمر میں بھی بل پڑ جانے کا خدشہ تھا۔ ایئرپورٹ سے شہر جانے کے لئے بلیو برڈ ٹیکسی سروس کی نئی نویلی اور چمکیلی ٹیکسیاں سینکڑوں کی تعداد میں قطار اندر قطار کھڑی تھیں۔ مگر درویش دوم نے شہر میں وارد ہونے کے لئے بس میں سفر کرنے کا فیصلہ سنایا اور گیٹ سے باہر بس سٹاپ کی جانب چل دیا۔ مَیں بھی نہار منہ سامان گھسیٹتا ہوا درویشوں کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔ اس بس پر سوار ہونا اور وہ بھی سامان سمیت، کسی سرکش گھوڑے کو قابو میں لانے سے کم نہ تھا۔ تاہم ہم سوار ہوئے اور بحمداللہ سامان سمیت سوار ہوئے۔ اگرچہ شہر تک کا سفر مرغا بن کر ہی کرنا پڑا اور ظاہر ہے کہ اس پوزیشن میں ہمیں اپنے ہمسفروں کے جسموں کے علاوہ اور کچھ دکھائی نہ دے رہا تھا۔ رنگ برنگ کے باتیک سے جھانکتے ہوئے تانبے جیسے جسموں کو جھانکتے جھانکتے ہمارا سفر کٹ گیا اور ہم مردیکا چوک Merdeka Square میں اتر گئے۔

جکارتہ کے معنی ہیں شہر فتح، اور اس شہر نے غلامی اور آزادی، ظلم و تشدد، کشت و خون اور فتح و شکست کے کئی ادوار دیکھے ہیں۔ ۱۵۲۷ء میں پرتگالیوں نے حملہ

کیا تو اہل جاوا نے حملہ آوروں کو شکست فاش دی اور اس شہر کا نام شہر فتح یعنی جایاکارتہ رکھا گیا۔ ہر سال ۲۲ جون کو اس فتح کی یاد میں اس شہر فتح میں جشن منائے جاتے ہیں۔ ۱۵۹۶ء میں ہالینڈ کے چار تجارتی جہاز آئے اور یہاں سے گرم مصالحے یورپ لے گئے۔ اس تجارت سے اتنا منافع ہوا کہ ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنی ہمنام برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی کی طرح مکاری اور عیاری کو بروئے کار لاتے ہوئے دریائے کیلیونگ کے دہانے پر تھوڑے سی جگہ حاصل کر لی اور اسکا نام باتاویا Batavia رکھا۔ تھوڑی ہی عرصے میں اس جگہ ایک مضبوط قلعہ تعمیر کیا اور پھر اگلی تین صدیوں تک انڈونیشیا کے گرم مصالحوں کی انمول دولت پر شیش ناگ کی طرح پھن پھیلا کر بیٹھ گئے۔ انڈونیشیا کے مرد آہن صدر سکارنو کی ان تھک جدوجہد بالاخر کامیاب ہوئی اور انڈونیشیا دسمبر ۱۹۴۹ء میں آزاد ہو گیا۔ اور جایا کارتہ' جکارتہ بن کر انڈونیشیا کا دارالحکومت قرار پایا۔ گو جکارتہ کو دیکھنے کے لئے ایک ہفتہ درکار ہے' مگر ہمارے پاس تو پورا انڈونیشیا دیکھنے کے لئے ہفتہ تھا۔ چنانچہ درویشوں کی کابینہ کا ہوٹل کے کمرے میں ہنگامی اجلاس برپا ہوا جس میں فیصلہ کیا گیا کہ جکارتہ میں دو دن اور ایک رات گزاری جائے گی۔ ویسے آپس کی بات ہے درویش دوم کی یہ منطق میری سمجھ میں تو نہ آئی کہ آخر کس حساب سے دو دن اور ایک رات جکارتہ میں گزارے جائیں۔ جبکہ رات اور دن تو برابر ہوتے ہیں۔ لیکن درویش دوم آخر کمپیوٹر دماغ آدمی تھا۔ اس نے تو ایک ایک لمحے کا حساب کر رکھا تھا۔ ہوٹلوں سے چیک آؤٹ کا وقت دوپہر کے بارہ بجے ہوتا ہے جسکے بعد دوسرے دن کا کرایہ دینا پڑ جاتا ہے۔ چنانچہ اس نے کہا کہ "آج دن بھر سیر کرتے ہیں۔ رات ہوٹل میں گزاریں گے۔ کل بارہ بجے سے پہلے کمروں سے سامان نکال کر ہوٹل کے سٹور میں جمع کرا دیں گے۔ پھر دن بھر سیر کریں گے۔ شام کو ٹرین پر بیٹھ کر جوگ جکارتہ کی طرف سفر اختیار کریں گے۔ رات ٹرین میں گزرے گی تو دوسری رات کے ہوٹل کا کرایہ بھی بچ جائے گا اور منزل تک بھی پہنچ جائیں گے۔" یہ سب باتیں درویش دوم نے اس روانی کے ساتھ ہمیں بتائیں کہ ہم دونوں ہکا بکا رہ گئے۔ چنانچہ اس کی نصیحت پر عمل کرتے ہوئے سب سے پہلے جوگ جکارتہ جانے کے لیے ٹرین کا ٹکٹ بک کروایا۔ وہاں ٹرینیں اچھی بھی ہیں اور سستی بھی۔

وقت کم اور مقابلہ سخت ہو تو شہر کی سیر کا ایک آسان نسخہ بھی ہے۔ گو وہ نسخہ پیدل سیر کے مقابلے میں ارزاں تو نہیں ہوتا مگر دربدر دھکے کھانے کی بہ نسبت یقینی ضرور ہوتا ہے۔ چنانچہ ہم لوگ سٹیشن سے سیدھے یونیورسل ٹورز کے دفتر پہنچے۔ انڈونیشیا میں ایسی بہت سی ٹورز کمپنیاں ہیں جو سیاحوں کو باقاعدہ تربیت یافتہ گائیڈوں کے ذریعے سیر کراتی ہیں۔ انڈونیشیا ہی کیا۔ پاکستان اور بنگلہ دیش کے علاوہ جنوب مشرق اور مشرقی ایشیا کے سبھی ممالک سیاحت پر بہت توجہ دیتے ہیں۔ کیونکہ سیاحت دنیا کی واحد انڈسٹری ہے جسکے پھیلاؤ سے محبتیں بڑھتی ہیں گھٹتی نہیں۔ دنیا کی ہر تجارت کو کوٹہ سسٹم کے ذریعے کنٹرول کیا جاتا ہے اور ہر ملک دوسرے ملک کو ایک مقررہ حد سے زیادہ نہ مال بھیج سکتا ہے اور نہ منگوا سکتا ہے۔ مگر سیاحوں کی آمد رفت پر ایسی کوئی پابندی نہیں۔ پھر یہ انڈسٹری ترقی پذیر ممالک کے لئے تو بڑی ہی کار آمد ہے۔ کیونکہ سیاحت اور سیاحوں کی آمدنی کے کئی طبقے حصے دار بن جاتے ہیں۔ مثلاً" سیاح کی آمد پر سب سے پہلے ملک کی ایئرلائین کماتی ہے۔ ایئرپورٹ کا پورٹر کماتا ہے۔ ایئرپورٹ سے شہر لانے والے ٹیکسی یا رکشا ڈرائیور کماتے ہیں۔ ہوٹل والے کماتے ہیں۔ ریستوران والے کماتے ہیں۔ ٹور کمپنی والے کماتے ہیں۔ سیر گاہوں پر سوونیرز بیچنے والے کماتے ہیں اور یوں سیاحت سے آمدنی کا یہ سلسلہ نہ صرف ایک طبقے اور ایک شہر تک محدود ہوتا ہے بلکہ ہر طبقے اور ہر شہر میں بہت سے افراد کے لئے روزی کا ذریعہ بنتا ہے۔ دنیا کی کسی اور انڈسٹری سے اتنے لوگ مستفید نہیں ہوتے۔ زر مبادلہ کمانے کا بھی سیاحت سے بہتر' آسان اور موثر نسخہ کوئی اور نہیں ہے۔ گو ہماری حکومتوں کے پاس زر مبادلہ کمانے کا ایک نسخہ کیمیا ہے اور وہ ہے کاسہ

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

گداگری' کہ جب ضرورت لاحق ہوتی ہے۔ (اور ضرورت اکثر لاحق ہوتی ہے) تو عمرہ کرنے کے بہانے بھیک مانگنے چلے گئے۔ مین پاور جو اپنے ملک کی مضبوطی کا باعث بنتی' اس کو صحرا کی آگ میں جھونک دیا اور ان کا خون پسینہ بیچ کر جو کچھ زر مبادلہ کما لیا کما لیا۔ یا ایک اور بھی شرمناک کام یہ کیا کہ اپنے ملک کے کچھ حصے ٹھیکے پر چڑھا دیئے۔ چولستان کا علاقہ ہر سال عربوں کو ٹھیکے پر دیدیا جاتا ہے۔ چولستان میں پاکستانی تو کیا چولستانی بھی بمشکل داخل ہوسکتے ہیں۔ کیونکہ سردیوں کے موسم میں وہ علاقہ صرف عربوں کے لئے مخصوص کر دیا جاتا ہے۔ ہماری حکومت جو سال بھر اخباروں اور ٹیلیویژن پر جنگلی جانوروں کے تحفظ کے اشتہارات دیتی رہتی ہے اور پاکستانیوں کے لئے ان جانوروں کا شکار اخلاقاً" اور قانوناً" ممنوع ہے عربوں کے لئے وہ سب کھلے عام معاف ہے کیونکہ پاکستان کا قانون پاکستان میں بھی عربوں پر لاگو نہیں ہوتا بلکہ عربوں پر تو غالباً" کوئی اور بھی قانون لاگو نہیں ہوتا۔ یہاں تک کہ چولستان کے غریب لوگوں کے تین چار سال کی عمر کے بچے کرائے پر لے لئے جاتے ہیں۔ ان بچوں کو جنگلی اونٹنیوں پر باندھا جاتا ہے۔ بچے کوڑے کی ضرب اور درد کے کرب سے جتنی چیخ پکار کرتے ہیں اونٹنیاں اتنی ہی تیز بھاگتی ہیں اور ہمارے محسن عربوں کا دل بہلاتی ہیں۔ اس ریس میں کوڑے کھانے والے بچے اکثر اونٹنیوں سے گر کر ان کے پاؤں تلے کچلے اور روندے جاتے ہیں۔ لیکن چونکہ دانہ خاک میں مل کر گل و گلزار ہوتا ہے اس لئے جب یہی بچے جوان ہو کر احتجاج کی زبان بنتے ہیں تو عربوں سے زرمبادلہ وصول کرنے والے ہمارے اپنے ملک کے حکمراں بھی ان پر کوڑے برساتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ ایک دن ہمارے ملک میں بھی کوئی روشن دماغ حکمران سیاحت کے انمول خزانے کی طرف دھیان دیگا۔ اسے ایک صنعت کے طور پر آگے بڑھائے گا نیز اسے نوکر شاہی کی دستبرد سے محفوظ رکھے گا کہ ترقی پذیر ملکوں میں جب تک نوکر شاہی کا بدنام زمانہ نظام قائم ہے اس وقت تک یہ ترقی پذیر ہی رہیں گے اور نوکرشاہی شہنشاہی عروج پائے گی اور کرسی صدارت تک پہنچ جائے گی۔ سوچ

کی حد تک تو درویش اول بھی نوکر شاہی کے طبقے سے تعلق رکھتا تھا۔ چنانچہ جب تک ہم یونیورسل ٹورز کے دفتر میں داخل ہوئے اس نے ہوٹل گرینڈ میسینک کوالالمپور والا ڈراما دہرانے کا فیصلہ کیا اور سیدھا مینجر کے کمرے میں جا گھسا۔ چند لمحوں بعد ہم دونوں بھی وہاں بلا لئے گئے۔ درویش اول نے انڈونیشیا میں پاکستانی سیاحوں کو لانے والی کمانی چھیڑ رکھی تھی اور اس ضمن میں وہ یونیورسل ٹورز کے مینجر سے سینکڑوں قسم کے سوالات پوچھے جا رہا تھا۔ اور وہ بیچارہ میز پر نقشے پھیلائے درویش اول کو ہر قسم کی معلومات فراہم کر رہا تھا۔ کوئی آدھ گھنٹے کی بک بک کے بعد درویش اول نے مطالبہ کیا "ہم جکارتہ کی سیر گاہوں کو ذاتی طور پر دیکھنا چاہیں گے تاکہ سیاحت کے فروغ کے لئے بہتر سروے تیار کر سکیں۔" مینجر تو اس سعادت پر پاگل سا ہو گیا۔ فوراً" ایک گائیڈ کو پابند کیا۔ گاڑی حوالے کی۔ رات کو کھانے پر مدعو کیا اور ہمیں سیر پر روانہ کر دیا۔

درویش اول کی سیر تو گائیڈ سے ملاقات ہی پر پوری ہوگئی۔ کیونکہ وہ تانبے سی رنگت والی لڑکی گائیڈ کم اور کسی مندر کی دیوی زیادہ لگتی تھی۔ اگر ہم دونوں ساتھ نہ ہوتے تو یقیناً درویش اول نمیوں کوچوں کی خاک چھاننے کی بجائے اس دیوی کے چرنوں میں بیٹھ جاتا۔ یا یوں کہیے کہ اس کے گوڈے گٹوں میں بیٹھ جاتا اور اس وقت تک اس کا پیچھا نہ چھوڑتا جب تک گو ہر مراد نہ پاتا۔ ایسا نامراد دل پھینک سیاح تو اس گائیڈ نے بھی غالباً" کبھی نہ دیکھا ہوگا۔

گاڑی ٹریفک کے گھنے جنگل کو چیرتی ہوئی سمندر کنارے بسے باتاویا کے علاقے میں پہنچی۔ اس علاقے میں ہر طرح کی گہما گہمی ہے جو قدیم شہروں کی روایت سے مختص ہے۔ درویش اول کی بھوک پیاس تو گائیڈ کی قربت سے ختم ہو گئی تھی۔ مگر مجھے بھوک نے تقریباً" نڈھال کر دیا تھا۔ میں نے درویش دوم کے موٹے پیٹ پر کہنی ماری اور ایک ایسے ریستوران کی طرف اشارہ کیا جہاں تازہ مچھلیاں تلی جا رہی تھیں۔ اس

ریستوران کی مچھلیاں یقیناً لذیذ ہونگی' کیونکہ سمندر کنارے تک لگی سینکڑوں میز کرسیوں پر گاہک مورچے سنبھالے بیٹھے تھے۔ درویش دوم میری درخواست پر غور فرما ہی رہا تھا کہ گائیڈ نے بھی اس ریستوران کی تعریف کر دی۔ پھر کیا تھا درویش اول نے فوراً" گاڑی روکنے کا حکم دیا اور ہم بھی دوسرے گاہکوں کے جھرمٹ میں کرسیاں سنبھال کر بیٹھ گئے۔ درویش اول گائیڈ کے ہمراہ ریستوران کے اندر اپنی پسند کی مچھلیوں کا آرڈر دینے چلا گیا۔ ویسے کھانے کا آرڈر تو ویٹر بھی لے رہے تھے۔ مگر اسے تو ہم دونوں سے نجات حاصل کرنے کا بہانہ چاہئے تھا جو اسے مل گیا۔ اتنے طویل انتظار کے بعد اتنا قلیل کھانا دیکھ کر مجھے غصہ تو آیا مگر میں مچھلی سے کانٹے نکالنے میں الجھ گیا اور درویش اول گائیڈ کو کانٹا ڈالنے میں الجھا رہا۔

جکارتہ کے جنوب میں شہر سے کوئی دس کلو میٹر کے فاصلے پر ایک مصنوعی سیر گاہ بنائی گئی ہے جسے تامان منی انڈونیشیا انداہ یعنی مختصر انڈونیشیا کہا جاتا ہے۔ یہ ملک کے ۲۷ صوبوں کی شوونڈو ہے۔ ایک مصنوعی جھیل میں انڈونیشیا کے اہم جزیروں کا نقشہ پیش کیا گیا ہے جس سے اس وسیع سلطنت کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔ پارک کے ایک کونے میں ساتھ ساتھ بنی ہوئی پانچ عبادت گاہیں تعمیر کی گئی ہیں جو انڈونیشیا کے مختلف مذاہب کی یکجہتی کی مظہر ہیں۔ ان عبادت گاہوں میں ایک مسجد' ایک ہندو مندر' ایک بدھ مندر اور عیسائیت کے دونوں فرقوں یعنی رومن کیتھولک اور پروٹسٹنٹ کے کلیسا واقع ہیں۔ ہماری گائیڈ بھی کچھ مذہبوں اور نسلوں کی مرکب سی لگ رہی تھی۔ کیونکہ اسکے نقش ونگار پر تو کئی نسلوں کی چھاپ تھی۔ چمکیلے سیاہ بال اور بڑی بڑی آنکھیں کچھ ہندوستانی پاکستانی جھلکی دکھاتی تھیں۔ تانبے سی رنگت انڈونیشی تھی۔ چپٹی سی ناک سے چینی ہونے کا گماں ہوتا تھا۔ دراز قامتی یورپ سے چرائی ہوئی لگتی تھی۔ اور چال چلن .... خیر چھوڑئے اس سے ہم کو کیا لینا دینا۔ وہ درویش اول کا مسئلہ تھا۔ ہاں البتہ ایک اور مسئلہ اس گائیڈ نے ضرور حل کر دیا۔ اور وہ ہوشیار پور کے ان لوگوں کے بارے میں تھا جو تقریباً" سو برس پہلے ہندوستان کے ضلع ہوشیار پور سے نکل کر انڈونیشیا میں جا کر آباد ہوگئے تھے۔ یہ لوگ ہاتھ دیکھ کر قسمت کا حال بتاتے تھے اور مختلف ٹونوں ٹوٹکوں سے قسمتیں بناتے بگاڑتے تھے۔ کیونکہ انڈونیشیا کے لوگوں پر ہندو مت کی توہم پرستی کا گہرا اثر ہے اس لئے ان لوگوں کا کاروبار خوب چمکا اور دوسروں کی قسمتوں کا حال بتانے والے اپنی قسمت بنا گئے۔ ان کی موجودہ نسل بڑے بڑے عہدے اور کاروبار سنبھالے ہوئے ہے۔ ان میں سے جناب عبدالرحمن اسلم تو اتنا کامیاب ہوا کہ صدر سکارنو کا دست راست بن گیا اور اسی جھٹکے میں انڈونیشیا کا امیر ترین آدمی بھی بن گیا۔ خیر یہ محنت اور قسمت کے کھیل ہیں۔ گائیڈ کی اس انفارمیشن سے درویش اول بہت خوش دکھائی دے رہا تھا۔ اور مجھے یقین تھا کہ وہ انڈونیشیا کے سفر میں ضرور کہیں نہ کہیں ہاتھ دیکھ کر قسمت کا حال بتانے کا ڈھونگ رچائے گا۔

ہم لوٹ کر مردیکا چوک میں پہنچ گئے جہاں جکارتہ کا نیشنل مونیومنٹ' استقلال مسجد اور رومن کیتھولک چرچ ہے۔ یہ تینوں جکارتہ کے لینڈ مارک سمجھے جاتے ہیں۔ سفید گنبدوں والی مسجد جنوبی ایشیا کی سب سے بڑی مسجد ہے۔ شکر ہے گائیڈ نے دنیا کی سب سے بڑی مسجد نہ کہہ دی' کیونکہ ہم پاکستانی بیحد جذباتی قوم واقع ہوئے ہیں۔ ہماری ہر شے دنیا سے انوکھی ہوتی ہے۔ ہم ڈیم بنائیں تو وہ دنیا کا سب سے بڑا ڈیم ہوتا ہے۔ ہم مسجد تعمیر کریں تو وہ دنیا کی سب سے بڑی مسجد ہوتی ہے۔ ہم سڑک بنائیں تو وہ سپرہائی وے کہلاتی ہے۔ ہمارے لیڈر دنیا کے عظیم لیڈر ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ ہمارے جرنیل بھی صرف جرنیل نہیں ہوتے بلکہ فیلڈ مارشل ہوتے ہیں۔ خیر وہ سمجھدار لڑکی تھی۔ بڑے چھوٹے کے اس جھگڑے میں الجھے بغیر ہی ہمیں نیشنل مونیومنٹ کی نچلی منزل پر لے گئی۔ وہاں انڈونیشیا کی تاریخ بتائی گئی ہے۔ جدوجہد آزادی کے سمبل Symbol پیش کئے گئے ہیں۔ اور صدر سکارنو کی آواز میں آزادی کا اعلان سنایا جاتا ہے۔ مونیومنٹ کے ۱۳۰ میٹر بلند مینار پر جانے کے لئے ۷ لفٹیں لگائی گئی ہیں اور مینار کی بلندی سے جکارتہ شہر کے خوب نظارے ہوتے ہیں۔ مگر مینار پر جانے کے لئے باقاعدہ پرمٹ لینا پڑتا ہے' جسے حاصل کرنے کے لئے پیشگی

اطلاع ضروری ہے۔ لیکن ہماری گائیڈ بڑے ہی کام کی شے تھی۔ اس نے کچھ جاپانی سیاحوں کا پرمٹ اپنے پاس رکھا ہوا تھا۔ چنانچہ اس نے وہی پرمٹ گارڈ کو دکھایا اور ہمیں لفٹ میں دھکیل دیا۔ خدا خبر کس کس نسل کے لوگ اس جاپانی پرمٹ پر سیر کرچکے ہونگے۔ دراصل پرمٹ کی ضرورت بھی درویش اول جیسے لوگوں کی وجہ سے محسوس کی گئی ہوگی۔ کیونکہ اس بلندی سے خودکشی کے چانسز کافی روشن ہیں اور حکومت نہیں چاہتی کہ ایک قومی یادگار پر ناکام لوگ اپنے خون کی بھینٹ چڑھائیں۔

یونیورسل ٹورز کے مینجر نے ہورائیزن ہوٹل کے اوپن ایئر ریستوران میں کھانے کا اہتمام کیا۔ درویش اول گائیڈ سے اور گائیڈ درویش سے نتھی تھے۔ ادھر بزنس کا ضرورت مند مینجر ہم دونوں سے جکارتہ میں پاکستانی سیاحوں کی متوقع آمد اور انتظامات کے بارے میں اپنی رام کہانی چھیڑے ہوئے تھا۔ جھوٹے سے جھوٹا انسان بھی جھوٹ بول بول کر اکتا جاتا ہے۔ پھر ہم تو صرف درویش اول کے جھوٹ کی لاج رکھ رہے تھے۔ آخر کب تک؟ "مگر خدا کا شکر ہے کہ ویٹر کی آمد سے ہماری جان خلاصی ہوئی' جس نے خالص انڈونیشی پکوان ہماری میز پر سجا دیئے۔ سب سے پہلے 'گادو۔ گادو' سلاد چکھی' جو مونگ پھلی کے مرکب سے بنائی جاتی ہے۔ اس کے بعد 'رینداگ' Rendang اور اُپُور ایّام Oporayam پر ہاتھ صاف اور دانت تیز کئے۔ مرغی اور بڑے گوشت کا یہ کھانا ہمیں تو کچھ عجیب سا لگا' کیونکہ دونوں ہی ناریل کے دودھ میں تیار کئے گئے تھے۔ مجبوراً" تعریف کرنی پڑی جو ہم نے بہرحال دل کھول کرکی۔ اور اس تعریف کی سزا یہ ملی کہ مینجر صاحب نے اسی کھانے سے ہماری پلیٹیں دوبارہ پُر کردیں۔ خدا خدا کر کے کھانے سے جان چھڑائی اور منہ کا ذائقہ بدلنے کے لئے میٹھے پر منہ مارا۔'چندول' Chendol وہاں کا خاص میٹھا ہے۔ مگر عجیب میٹھا ہے' کیونکہ نہ میٹھا ہے نہ پھیکا ہے۔ وہی ناریل کا دودھ جو مرغی میں شامل تھا میٹھے میں بھی موجود تھا۔ البتہ اس ریستوران کا پتلی تماشہ بہت پسند آیا۔'ویانگ کولت' Wayangkulit انڈونیشیا کا قدیم پتلی تماشہ ہے۔ جس میں پتلیوں کے بجائے کپڑے پر انکا سایہ دکھایا جاتا ہے۔ یہ پتلی تماشہ عام پتلی تماشے کی مانند نہیں ہوتا بلکہ مذہبی رسوم کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ ان کا یقین ہے کہ تماشے کے دوران مرے ہوئے لوگوں کی روح پتلیوں میں آجاتی ہے۔ اسی لئے تماشہ شروع کرنے سے پہلے اگر بتی کی قسم کی کوئی خوشبو سلگائی جاتی ہے۔ پھر پتلی تماشہ کرنے والا پتلیوں کو کیلے کے درخت کے تنے پر سجا دیتا ہے۔ درخت کا تنا زمین کا تصور پیش کرتا ہے۔ اچھی روحوں کی نمائندہ پتلیاں تماشہ دکھانے والے کے دائیں ہاتھ اور برائی کی نمائندہ بائیں ہاتھ پر ہوتی ہیں۔ گویا یہ خیر و شر کی علامت ہیں۔ پرانے زمانے میں تو ناریل کے تیل کا دیا جلا کر اسی کی روشنی سے پتلیوں کا سایہ سکرین پر ڈالا جاتا تھا۔ مگر اب برقی قمقمے سے وہی کام لیا جانے لگا ہے۔ امید ہے کہ ایک دن ناریل کے دودھ کا بھی کوئی نہ کوئی بدل ضرور دریافت ہو جائے گا اور انڈونیشیا کے کھانوں کا ذائقہ کچھ نہ کچھ مختلف بن سکے گا۔ "دالانگ' Dalang یعنی پتلی تماشہ کرنے والا تن تنہا ہی سارا ڈراما لگاتا ہے۔ کہانی بھی وہ خود ہی سناتا ہے اور پتلیوں سے ایکشن بھی خود ہی کرواتا ہے۔ سازندے ساتھ ساتھ بیک گراؤنڈ میوزک دیتے جاتے ہیں۔

بھلائی (خیر) اور برائی (شر) کی اس جنگ میں فتح ہمیشہ بھلائی (خیر) کی ہوتی ہے۔ کم از کم فلمی کہانیوں' ڈراموں اور پتلی تماشوں کی حد تک تو فتح ہمیشہ خیر کی ہوتی ہے۔ حقیقت میں کیا ہوتا ہے۔ یہ ہم سب جانتے ہیں۔ کھانا بھی ختم ہوا پتلی تماشہ بھی تمام ہوا' مگر درویش اول کا تماشہ ابھی جاری تھا۔ اور اسکی سرشت میں بیٹھی بدی کا عمل بھی۔ مگر دونوں درویشوں کے احتجاج پر مجبوراً" درویش اول کو کچھ حاصل وصول کئے بغیر ہی ہوٹل کو لوٹنا پڑا۔ کیونکہ دوسرے ہی روز ایک طویل سفر درپیش تھا اور وہ سفر شروع کرنے سے پہلے طویل آرام کی بھی ضرورت تھی۔

گھنے جنگلوں' سبزہ زاروں' پہاڑیوں' ناریل اور پپیتے کے باغوں میں سے گزرتے ہوئے ہم صبح کے آٹھ بجے جگ جکارتہ پہنچے۔ یہاں ہمارا چوبیس گھنٹے ٹھہرنے کا پروگرام تھا۔ جگ جکارتہ کو جوجہ بھی کہتے ہیں۔ یہاں ایک مشہور یونیورسٹی ہے جہاں ہزاروں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

طالب علم زیر تعلیم ہیں۔ اس شہر کو طالب علموں کا شہر کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ وہاں ہوٹل میں کمرہ لینے گئے تو جگہ نہ تھی۔ ہم نے اصرار کیا تو مینیجر آگیا۔ اس نے کہا کہ آپ کو اس وقت تو ایک کمرہ مل سکتا ہے مگر رات کو وہ کمرہ خالی کرنا ہوگا۔ ہم نے اس منطق کا سبب پوچھا' تو اس نے کہا کے دراصل یہاں کے ہر ہوٹل میں جنوبی سمندروں کی دیوی" ناحائی لارو کدائی" کے لئے کمرہ بک ہوتا ہے۔ جہاں دیوی رات گزارتی ہے۔ رات بھر ایرکنڈیشنڈ کمرے میں دیوی کیا کرتی ہے ؟ ان تنہا لمبی راتوں میں دیوی کا کوئی ساتھی بھی ہوتا ہے یا نہیں ؟ یہ ایسی باتیں تھیں جن کا ہوٹل کے مینیجر کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔

دن کے وقت دیوی کے کمرے میں سامان رکھنا تو کوئی بڑی بات نہ تھی۔ البتہ لمبی سیاہ رات میں دیوی کا ساتھ ہو تو کوئی بات بھی ہے۔

جوجہ میں انڈونیشی سلطانوں کے عالیشان محلات ہیں۔ ہندوؤں کے پرشکوہ مندر ہیں۔ جہاں دن رات کوئی نہ کوئی مذہبی تہوار جاری رہتا ہے۔ ان دنوں لابوہان کا تہوار منایا جا رہا تھا۔ اس تہوار میں ہر سال آتش فشاں پہاڑوں کو نذرانے پیش کئے جاتے ہیں تاکہ وہ سال بھر اپنے آتشیں مادے کو اپنے اندر سموئے رکھیں۔ صدر سوکارنو کے دور میں جب کمیونسٹوں کا انقلاب دبایا گیا تو اس علاقے میں ایک ہی مقام پر پانچ ہزار لوگوں کو قتل کیا گیا تھا۔ ہوٹل میں کمرہ نہ ملنے کے سبب ہم نے سورا باجا کی طرف سفر شروع کر دیا۔ راستے میں دونوں جانب چاولوں کے کھیت تھے۔ انڈونیشیا میں ایک سال کے اندر چاول کی دو فصلیں کاٹی جاتی ہیں۔

گو سورا باجا پہنچنے تک ہم لوگ بہت تھک چکے تھے مگر فوراً" ہی بس میں سوار ہوئے اور جزیرہ بالی کی طرف سفر شروع کیا۔ یہ جزیرہ وہاں سے دو سو میل دور تھا اور ہم لوگوں کو دن کے اُجالے میں ہی جاوا کے جنوبی شہر بانیوانگی Banyuwangi پہنچنا تھا۔ رات ڈھلے اس گھنے جنگلوں والے راستے سے گزرتے ہوئے جنگلی جانوروں اور انسانی درندوں (راہزنوں) کے حملے کا خطرہ ہوتا ہے۔ راہزنوں کا نام سن کر دروش

اول تمام راستے "جل تو جلال تو" پڑھتا گیا۔ رات گیلی مانک میں بسر کی۔ صبح جزیرہ بالی میں پہنچنا تھا۔

شاپنگ کا بوجھ درویش دوم کے لئے گناہوں کا بوجھ بن گیا' جس سے نجات مشکل تھی۔ ہوائی سفر کی بات الگ ہے' مگر جہاں ٹرینوں اور بسوں کا سفر ہو وہاں یا تو وہ اپنا بھاری بھرکم جسم سنبھالتا اور یا شاپنگ کی شامت اعمال۔ چنانچہ اس نے بھی اپنا وزنی ووٹ درویش اول کے حق میں دیا اور ان دونوں نے فیصلہ کیا کہ آئندہ ابن بطوطہ بننے کی ضرورت نہیں' صرف ہوائی جہاز سے سفر ہوگا۔ مگر جزیرہ بالی کے دارالحکومت ڈینپسر Denpasar تک تو بس میں سفر کرنا تھا۔ لہٰذا جوں ہی سورج نے آنکھ کھولی درویشوں نے گلی مانک Gilimanuk کی بندرگاہ کا رخ کیا۔ آگے آگے درویش اور پیچھے پیچھے ننگ دھڑنگ بچوں کا ہجوم تھا۔ ایک ایک سوٹ کیس کو چار چار بچے چیونٹوں کی طرح چمٹے ہوئے تھے۔ کئی کام چور تو صرف لہو لگا کر شہیدوں میں شامل ہو رہے تھے تاکہ کرایہ وصول کرتے وقت برابر کے حقدار بن سکیں۔

فیری میں سوار ہوئے تو ننھے منے قلیوں کے ہجوم نے سکوں سے بھری مٹھیاں ہلا ہلا کر ہمیں الوداع کہا اور باریک باریک آوازوں میں "سلامت جلان سلامت جلان" (سفر بخیر) کے نعرے بلند ہوئے۔ ایسی پر خلوص الوداع تو کبھی نصیب نہ ہوئی تھی۔ ادھر نئی نویلی کشتی کے ملاح نے اپنی شکستہ انگریزی کی اصلاح کرنے کا نادر موقع جانا۔ اور آبنائے بالی Bali Strait کے بارے میں ایک صدیوں پرانا قصہ بیان کرنا شروع کیا۔ طوطے کی طرح رٹے ہوئے فقروں سے اندازہ ہوتا تھا کہ سیاحوں کو الو بنانے کیلئے وہ یہ کہانیاں اکثر سناتا ہو گا۔ حالانکہ ہمیں بنانے کے لیے کہانی سنانے کی ضرورت بھی نہ تھی۔ اس نے رازدارانہ انداز میں بتانا شروع کیا کہ ایک دفعہ جاوا کے بادشاہ نے اپنے باغی بیٹے کو ملک بدر کر کے اس علاقے میں سزا کے طور پر بھیج دیا۔ اس کے ہمراہ سات ساتھی اور سات دن کا راشن بھی مہیا کر دیا۔ اس زمانے میں جزیرہ بالی اور جاوا خشکی کے راستے آپس میں ملے ہوئے تھے۔شہزادے نے اس مقام (ملاح نے

ایک اونچی سی چٹان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا) پر سات دن کا چلہ کاٹا۔ ساتویں رات سمندروں کی دیوی نے اس کی فریاد سن لی۔ اس علاقے میں بہت بڑا طوفان آیا۔ اس چٹان کے علاوہ تمام علاقہ زیر آب آگیا۔ صبح جب طوفان کا زور تھما تو جاوا اور بالی کے درمیان خشکی کا راستہ ختم ہوچکا تھا۔ ملاح کی کہانی ختم ہوئی تو ہمارا سفر بھی ختم ہو گیا اور ہم جزیرہ بالی کے ساحلی قصبے گلی مانک میں اتر گئے۔ کچھ اسی سائز کے ساتھی ہمارا انتظار بھی کر رہے تھے' جیسے ساتھیوں نے ہمیں الوداع کہی تھی اور رخصت کیا تھا۔ فیری کا تھمنا تھا کہ اس تنگ دھڑنگ فوج ظفر موج نے ہلہ بول دیا۔ اور چند ہی لمحوں میں ہمیں ڈنپسر جانے والی بس میں دھکیل دیا۔ بس کے ارد گرد بنی ہوئی تصویروں سے اندازہ ہوتا تھا کہ بس کا ڈرائیور بڑا رنگین مزاج ہے۔ بس کے اندر اور باہر کچھ ایسی ہی تصویریں بنی تھیں جیسے ہمارے ہاں رکشوں اور ٹرکوں پر بنی ہوتی ہیں۔ ادھر ادھر کچھ فقرے بھی لکھے تھے جنہیں میں پڑھ تو نہ سکتا تھا مگر ان تصویروں کو دیکھ کر ان تحریروں کا اندازہ لگایا تو کچھ ایسا لگا: اچھا دوست پھر ملیں گے' خیر نال جاتے خیر نال آ' ہارن دو راستہ لو' وغیرہ۔ بس میں سیٹوں پر دو دو مسافر ساتھ بیٹھے تھے چنانچہ ایک طرف درویش دوم کے ساتھ میں بیٹھ گیا۔ میں نے تو صرف گزارا ہی کیا بیٹھا نہیں۔ کیونکہ درویش دوم نے پوری سیٹ پر اپنا خوبصورت جسم پھیلایا ہوا تھا۔ درویش اول کے ساتھ ایک خاتون تھیں اور ان خاتون کے ساتھ ایک خوبصورت سا بچہ تھا۔ جب روتا تو باآواز بلند روتا اور لگاتار روتا۔ خوشی کا مظاہرہ بھی کھلے بندوں کرتا' کبھی بال نوچتا کبھی کپڑے پھاڑتا اور کبھی ہاتھ پاؤں فری سٹائل میں لہراتا۔ اس منے مجاہد کی کارستانیاں صرف ماں کی گود تک ہی محدود نہ تھیں بلکہ درویش اول کی حدود کی خلاف ورزی بھی کرتا۔ جہاں تک بال نوچنے کا تعلق ہے درویش اول محفوظ تھا۔ البتہ اس کے کپڑوں پر بار بار حملہ ہوتا۔ ان حملوں میں مجاہد کی ماں ہی نہیں بلکہ بس میں بیٹھے ہوئے دوسرے مسافر بھی اس کو داد دے رہے تھے۔ مسافروں کے دراز جبڑوں کو دیکھ کر مجبوراً درویش اول کو بھی مسکرانا پڑتا۔ مگر اس کے دل پر جو بیت رہی تھی وہ ہم ہی

جانتے ہیں۔

سڑک کے دائیں جانب ساحل سے ٹکراتی بحرانڈونیشیا کی لہریں اور بائیں جانب ہوا میں جھومتے ناریل کے پیڑ۔ پیڑوں کے پیچھے چاولوں کے کھیت اور کھیتوں کے پیچھے سرسبز پہاڑیاں۔ پہاڑیاں' کھیت' پیڑ' پیڑوں کے جھرمٹ میں چھوٹے چھوٹے گاؤں' بانس اور لکڑی کے گھر' انسانوں کے گھر' بھگوانوں کے گھر' دیوتاؤں اور دیویوں کے گھر' مندر اور مندر کی بچارنیں۔ ان بچارنوں کا ذکر تو بعد میں ہوگا ابھی تو سرمئی گھٹاؤں نے موسم میں نشہ بکھیر دیا تھا۔ آسمان سے گرتی بوندوں نے جسموں میں آگ سلگا دی تھی۔ ان سلگتے انگاروں کو بجھانے کے لئے جوان جسموں نے کپڑوں کو خیرباد کہا۔ سرمئی گھٹائیں سیاہ زلفوں پر برسنے لگیں۔ سیاہ زلفیں سنہری جسموں پر بکھرنے لگیں۔ بارش میں بھیگتی جوانیاں شوخیاں کرتی دھان کے کھیتوں اور کیلے کے باغوں میں اوجھل ہوگئیں۔ ناریل کے پیڑ مستی میں جھوم رہے تھے۔ ہماری بس منزل کی طرف رواں دواں تھی۔

بس ایک چھوٹے سے قصبے میں رکی۔ سڑک کے دونوں جانب بانس اور ناریل کے پتوں سے بنی چھوٹی چھوٹی دکانیں تھیں۔ ان دکانوں پر دکاندار عورتیں اور زیادہ تر گاہک بھی عورتیں ہی تھیں۔ بالی میں روز مرہ کی زندگی میں خواتین کچھ ایسی کثیر تعداد میں دکھائی دیتی ہیں کہ وہاں کا ہر بازار مینا بازار معلوم ہوتا ہے۔ ادھر بس پر خوانچہ فروشوں نے باقاعدہ اور مسافروں نے بے قاعدہ حملہ کر دیا۔ اس منزل کے مسافر اترنے بھی نہ پائے تھے کہ دوسرے مسافر بس میں رونق افروز ہو گئے۔ ان نوواردوں کی کہنیوں سے آنکھ اور ناک کو محفوظ رکھنا بڑی ہنرمندی کی بات ہے۔ مسافروں نے بس کے اندر کچھ سکون کا مظاہرہ کیا تو خوانچہ فروشوں نے اپنی کرخت آوازوں سے آسمان سر پر اٹھا لیا۔ ان نوخیز تاجروں کے قد اتنے چھوٹے تھے کہ بس میں بیٹھے ہوئے یا تو ان کی آوازیں سنائی دیتیں یا ایک ہاتھ میں خوانچہ اور دوسرا پھیلا ہوا ہاتھ دکھائی دیتا۔ تاکہ گاہک خوانچے سے سامان اٹھائے تو تاجر کا پھیلا ہوا خالی ہاتھ بھی بھر دے۔

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

کئی ہاتھ خوانچوں کے بغیر بھی پھیلے ہوئے تھے۔ ان کے پاس بیچنے کے لئے ان کی غربت اور افلاس کے سوا کچھ نہیں تھا۔

ڈینپسر جانے والی شاہراہ صرف سڑک کا کام ہی نہیں دیتی بلکہ اس پر سے مذہبی جلوس بھی گزرتے ہیں۔ جب کوئی فوت ہو جائے تو اس کا جنازہ بھی وہیں سے گزرتا ہے۔ جب گاؤں میں کوئی کھیل دکھانے والا آئے تو سڑک کو تھیٹر کی جگہ استعمال کیا جاتا ہے اور شام کو سڑک چوپال بن جاتی ہے اور اس پر لوگ بیٹھ کر گپیں ہانکتے ہیں۔ صرف انسان ہی نہیں بلکہ حیوان بھی سڑک سے پورا پورا فائدہ اٹھاتے ہیں۔ مثلاً" گائیں بڑی شان بے نیازی کے ساتھ سڑک پر مٹرگشت کرتی دکھائی دیتی ہیں جب تک ان کا موڈ ہو وہ سڑک پر بلا تکلف گھوم سکتی ہیں۔ ان کا جسم اور مزاج تو ہمارے ہاں کی بڑے گھرانوں کی بیگمات جیسا ہوتا ہے۔

دوپہر ڈھلے ہماری بس ڈینپسر شہر میں سوسی کے اڈے میں رکی۔ جہاں کے حالات ہمارے ملک کے بس کے اڈوں سے کچھ زیادہ مختلف نہ تھے۔ وہی شور شرابا اور وہی غلاظت۔ سواریوں کی بھیڑ اور کنڈکٹروں کی کھینچا تانی۔ بس سے اترنے والے ہی تھے کہ درویش اول کے معصوم صفر نے الوداعی حملہ کیا' جو بھرپور بھی تھا اور کامیاب بھی۔ درویش اول کی کنگھی اسکی جیب سے نکل کر معصوم مسافر کی مٹھی میں تھی اور ننھے منھے بچے کی مٹھی بڑی مضبوط ہوتی ہے۔ درویش اول نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے اپنی کنگھی چھیننے کی کوشش کی تو اس عیار بچے نے مٹھی تو بند ہی رکھی مگر جبڑے کھول لئے اور اس زور سے دھاڑا کہ سب مسافر چونک گئے اور بیچارہ درویش اول کھسیانا سا ہو کر بس سے اتر گیا۔ درویش دوم نے اسکے زخموں پر نمک چھڑکنے کی خاطر اپنی کرخت آواز میں گنگنانا شروع کیا۔"ننھے منے بچے تیری مٹھی میں کیا ہے....."

درویش اول نے جو پہلی ٹیکسی دیکھی اسی میں اچک کر بیٹھ گیا۔ وہ کوئی بیس سال پرانے ماڈل کی گاڑی تھی۔ ڈرائیور نے گاڑی سٹارٹ کرنے کے لئے ہینڈل گھمایا۔ سن رسیدہ انجن نے کچھ دیر گریہ و زاری کی پھر ہچکی لے کر خاموش ہو گیا۔

ڈرائیور نے بونٹ اٹھا کر اپنے ہاتھ منہ کالے کئے اور پھر ٹیکسی میں بیٹھ کر مجھے ہینڈل گھمانے کا اشارہ کیا۔ میں نے کچھ ہچکچاہٹ کی تو درویش اول نے کہا "یار وقت ضائع نہ کرو۔ بہت تھکے ہوئے ہیں۔" چنانچہ میں ہینڈل گھمانے لگا اور گھما گھما کر ہلکان ہو گیا۔ خدا خدا کر کے بڑی بی کی رگوں میں پٹرول نے جو دورہ شروع کیا تو اس کا پورا انجر پنجر ہلنے لگا۔ ہم اسی طرح ہلتے ہلاتے "ساحل سنور' کی جانب سفر کرنے لگے۔

کوئی چھ صدی پہلے انڈونیشیا ایک ہندو ریاست تھی۔ پھر گجراتی تاجروں کے ذریعے اسلام انڈونیشیا میں پہنچا تو وہاں کے لوگوں نے اسے قبول کیا۔ اسلام اس شدت اور تیزی سے مقبول ہوا کہ وہاں کے ہندو راجاؤں کا اثر ختم ہوتے ہوتے جزیرہ بالی میں سمٹ کر رہ گیا۔ مسلمانوں نے بھی اس جزیرہ کے باسیوں کو ان کے حال پہ چھوڑ دیا۔ جزیرے میں ہندو مذہب پروان چڑھتا رہا اور مذہب کی سرپرستی میں فنون لطیفہ' جن میں رقص و موسیقی' مجسمہ سازی اور آرٹ بھی شامل ہیں پروان چڑھتے رہے۔ یہاں تک کہ پورا جزیرہ ایک خوبصورت عجائب گھر کی صورت اختیار کر گیا۔ وہاں کا ہندو مذہب بھی خوبصورت رسم و رواج کا اچھوتا اور حسین نمونہ بن گیا۔ ۱۵۹۷ء عیسوی میں ڈچ ملاح جزیرہ میں پہنچے اور یہ دیکھ کر دنگ رہ گئے کہ علاقے میں بڑی دلکشی ہے۔ جہاز کے کپتان نے واپسی کے لیے جب جہاز کے لنگر اٹھائے تو آدھے ملاحوں نے جزیرہ چھوڑنے سے انکار کر دیا۔ جہاز کے کپتان نے وہاں کے راجہ سے مدد کی درخواست کی۔ راجہ نے اپنے محل میں ملاحوں کی شاندار دعوت کی۔ ملاحوں کو محل تک لانے کے لئے راجہ کی خاص بگھی استعمال کی گئی جسکو سفید بھینسے کھینچتے تھے۔ پھر یورپی مہمانوں کی میزبانی پر راجہ کی دو سو بیویاں مامور تھیں' ماسوائے منظور نظر بیوی کے۔ راجہ کی قربت سے محروم دو سو بیویوں نے ڈچ مہمانوں کی بھرپور میزبانی کی۔ جس کے نتیجے میں ملاح راجہ کی بات نہ ٹال سکے اور اپنے کپتان کے ہمراہ وطن لوٹ گئے۔ مگر جزیرہ بالی کی محبت کے نقوش اپنے دلوں سے نہ مٹا سکے اور ۱۸۴۶ء میں جب وہ یہاں دوبارہ لوٹ کر آئے تو یہاں سے کبھی نہ جانے کے لئے لوٹ کے آئے۔

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

ڈینپسر اگرچہ کوئی ایک لاکھ کی آبادی کا شہر ہے' مگر شور و شرابا اس قدر زیادہ اور ٹریفک اس قدر گھنا ہوتا ہے کہ وہاں رات کروٹ بدل بدل کر ہی گزارنی پڑتی ہے۔ اسی لئے ہم نے ساحل سمندر میں قیام کا فیصلہ کیا تھا۔ مگر بہت سے دوسرے فیصلوں کی طرح اس فیصلے میں بھی میری مرضی شامل نہ تھی۔ کیونکہ ہم تو جہاں چاہیں اور جب چاہیں سو سکتے ہیں۔ اصل مسئلہ تو درویش اول کا تھا۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ ساحل پر سیاحوں کے ہجوم ہونگے اور ہجوم بھی رنگ برنگے۔ بھلا وہ ان رنگینیوں سے دور کیونکر رہ سکتا تھا۔ چنانچہ ہم نے ایک بنگلہ کرائے پر لیا۔ جو ہوٹل کے مقابلے میں نہایت ارزاں بھی تھا اور آرام دہ بھی۔ البتہ وہاں ہوٹل والی کھانے پینے کی سہولتیں فراہم نہیں ہوتیں۔ صرف ناشتے کا بندوبست ہوتا ہے۔ اور کم بخت ناشتے کے انتظار میں ابھی اٹھارہ گھنٹے حائل تھے۔ پھر ناریل کے جنگل میں گھرا ہوا یہ بنگلہ بھی کچھ بھوت بنگلہ نما زیادہ تھا۔ جہاں دن دہاڑے بھی رات کا سا سماں تھا۔ سامان اٹھا کر اندر پہنچے تو درویش اول نے مجھے علیحدہ کمرہ الاٹ کیا اور وہ دونوں ایک ہی کمرے میں قیام پذیر ہوئے۔ پورے سفر میں یہ پہلا موقع تھا کہ مجھے الگ کمرہ دیا گیا۔ حالانکہ یہی پہلا موقع تھا کہ مجھے خراٹوں والے درویش دوم کے کمرے میں سونے پر بھی اعتراض نہ تھا۔ کیونکہ اسکے خراٹوں سے تو بھوت بھی پناہ مانگتے ہونگے۔ گو ویسے تو ہم ماشاء اللہ بڑے ہی بہادر واقع ہوئے ہیں۔ شیر' چیتوں سے اکثر مڈھ بھیڑ ہوجاتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ پنجرے کے اندر بند ہوتے ہیں اور ہم پنجرے کے باہر۔ کیونکہ جب سے ہوش سنبھالا ہے ہم نے تو اپنے ملک میں یہی کچھ دیکھا ہے کہ جو ووٹ سے آتے ہیں وہ سنگین سنبھال لیتے ہیں اور جو سنگین سے آتے ہیں وہ جمہوریت کا نعرہ لگا دیتے ہیں۔ مگر بولنے کم بخت دونوں نہیں دیتے۔ شاید اسی لیے ہمیں حکمرانوں اور بھوتوں سے بہت خوف محسوس ہوتا ہے۔ کیونکہ دونوں ضرب لگاتے ہیں مگر دکھائی نہیں دیتے۔ ویسے جس کمرے میں مجھے ٹھونسا جا رہا تھا اس میں تو شیر کا بچہ بھی آنکھیں بند کر کے ہی سوتا۔ کیونکہ وہ کمرہ یقیناً بھوتوں کی آرام گاہ تھا۔ بھتنی کی آرام گاہ بھی ہوتا تو الگ

بات تھی۔ کیونکہ ہمارے ملک کے اکثر زن مرید قسم کے مرد حضرات بھتنیوں کے ساتھ تو پوری پوری عمر گزار دیتے ہیں۔

خیر بھوتوں سے ملاقات تو رات کی بات تھی ابھی تو دوپہر ہی ڈھلی تھی اور مجھے دونوں درویشوں کے ہمراہ ساحل پہ جانا تھا۔ جہاں دھوپ میں جسم جلاتے (ٹین کرتے) گوری جل پریوں کو دیکھنے کا اشتیاق تھا۔

ہم اپنے بھوت بنگلے سے نکل کر سیدھے ساحل پر پہنچے۔ حد نظر تک پھیلی ہوئی سنہری ریت اور نیلگوں سمندر۔ ریت پر لوٹتے جواں بدنوں کے نشان۔ اور ان نشانوں کو چھونے کے لئے سمندر کا مدوجزر یعنی مسلسل آنا اور مایوس ہو کر لوٹ جانا۔ ناریل کے پیڑوں کا جھومنا اور پتوں کی سرگوشی۔ ہر سو خاموشی ہی خاموشی۔ پھر شور اٹھا.... ہم چونکے.... اور دیکھا .... کچھ نوجوان ساحل کی جانب لپکے .... ان کے پاس پتنگیں تھیں۔ بڑی بڑی پتنگیں .... کوئی چالیس فٹ لمبی اور بیس فٹ چوڑی' جنہیں چھ چھ نوجوانوں نے اٹھا رکھا تھا۔ پھر ایسی پتنگوں کو اڑانے کے لئے "بڑے کی رسی' کی طرح ڈور بھی تو دراز چاہیئے۔ جو ان نوجوانوں کے پاس تھی۔ بلکہ کئی نوجوانوں کی ٹولیوں نے فیملی سائز پتنگیں اور شیطان کی آنت سی ڈوریں اٹھا رکھی تھیں۔ بالی میں بعد از نماز ظہر ساحلوں پر سنہری جسموں کی جگہ بسنت رنگ سج جاتے ہیں۔ کیونکہ پتنگ رنگ کے سامنے دنیا کے سب رنگ ماند پڑ جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ درویش اول جیسا رنگین مزاج درویش بھی سنہری جسموں کو بھول کر پتنگوں کے رنگوں میں مست ہو گیا۔ اور پتنگ بازی میں اسقدر کھو گیا کہ بلا خوف و خطر سمندر میں گھس گیا۔ حالانکہ پانی سے اس کے ایسے ہی تعلقات تھے جیسے گنجے کے تعلقات استرے سے ہوتے ہیں۔ اس پتنگ بازی میں شرکت کے لئے بالی میں ہر عمر اور ہر نسل کے لوگ آتے ہیں۔ نوجوان صرف پتنگ اڑاتے ہیں اور باقی لوگ شرطیں لگاتے ہیں۔ جو جیت جائیں وہ جشن مناتے ہیں اور جو ہار جائیں وہ غم مٹاتے ہیں۔ مگر دونوں کاموں کو پورا کرنے کے لئے شراب بھی چاہیئے اور شباب بھی' جسکی اس جزیرے میں کوئی کمی نہیں۔ جب آسمان

سرخی مائل ہوا' سمندر پر سیاہی چھانے لگی تو سب لوگوں نے ساحلوں پر بسی رنگیں بستیوں کا رخ کیا۔ جہاں بوتلوں میں بند بھوت پیمانوں میں سمانے لگے۔ مغربی موسیقی پر تھرکتے ہوئے مشرقی جسم' بو تیک لبادوں سے باہر آنے لگے۔ ساحلوں کی راتیں بڑی آزاد ہوتی ہیں' جہاں قوموں اور نسلوں کا امتیاز ختم ہوجاتا ہے صرف چہرے پہچانے جاتے ہیں اور جسم تولے جاتے ہیں۔ جسموں کے تول میں تو یقیناً درویش دوم اور درویش اول پوری کائنات سے بھاری تھے۔ چنانچہ ہم بھی ایسے ڈسکو میں گھس گئے جہاں انسانیت کے نقاب ہٹا کر انسان اپنی ابدی درندگی پر اترے ہوئے تھے۔ دھیمی روشنی نے سب عیب و گناہ اپنے دامن میں چھپا رکھے تھے تاکہ لوگ رنگ رلیاں منا سکیں۔ ہم اس رنگ کے سنگ سجنے ہی لگے کہ درویش دوم نے میرے کان میں سرگوشی کی جس سے میں سیاہ پوش ہو گیا۔ دراصل مجھ سے مشورہ کئے بغیر ہی دونوں درویشوں نے ایک پتنگ باز پر شرط لگائی اور قسمت کے یہ دھنی وہ شرط ہار گئے۔ جس کی کو پورا کرنے کے لئے ان دونوں نے خوراک پر راشن لگا دیا اور میں شام ڈھلے ہی صبح کے ناشتے کا انتظار کرنے لگا۔

میرا کمرہ اس بھوت بنگلے کے بالکل عقب میں تھا۔ جسکا دروازہ ایک ویران برآمدے میں کھلتا تھا اور کھڑکی ناریل کے جنگل میں۔ اس سے بہتر بھوتوں کی قیامت گاہ (یعنی اقامت گاہ) بھلا اور کیا ہو سکتی تھی؟ چنانچہ جب ڈسکو سے نکلے تو میں بھوتوں سے ملاقات کے لئے بالکل تیار تھا۔ مگر وہاں پہنچے تو رنگ ہی کچھ اور تھا۔ ہماری غیر موجودگی میں دو آسٹریلین سیاح لڑکیاں میرے سامنے کے کمرے میں ٹھہرا دی گئی تھیں۔ جو ویران برآمدے میں کرسیاں جمائے اور محفل سجائے بیٹھی تھیں۔ ایسی دلربا پڑوسنیں ہوں تو بھوتوں سے بھلا کون ڈرتا ہے؟ مگر ہم نے انکو بھوتوں سے باقاعدہ ڈرایا۔ بھوتنیوں کے قصے سنائے اور چڑیلوں کی دہشت طاری کی۔ ہم نے اپنے معصوم انداز میں سب قصے ایسے مستند انداز میں سنائے گویا چڑیلیں ہماری فرسٹ کزن ہوں۔ پھر کیا تھا بالی کی سیاہ رات تھی اور آسٹریلین لڑکیوں کا ساتھ تھا۔ ناریل کا پتا جھومتا تو وہ سہم جاتیں۔ کتا بھونکتا تو وہ سمٹ جاتیں اور ہم انکو تسلی دینے کے لئے ان سے لپٹ جاتے اور وہ آپس میں لپٹ جاتیں۔ رات بھر ناریل بھی جھومتے رہے۔ کتے بھی بھونکتے رہے۔ خوف بھی طاری رہا اور ہم بھی۔۔۔۔۔

صبح ناشتے کی میز پر درویش اول نے زیر لب مسکراتے ہوئے پوچھا۔ "کہو میاں رات تو آرام سے گزری؟ ۔۔۔ بھوت۔ چڑیلوں نے تو نہیں تنگ کیا؟" "بھوت تو نہیں البتہ دو چڑیلیں ساری رات چمٹی رہی تھیں" ۔۔۔ میں نے ناشتہ جاری رکھتے ہوئے کہا ۔۔۔ "ہو سکتا ہے وہ اب ناشتہ کرنے بھی آئیں؟" جس پر درویش دوم نے زور دار قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ "یار تم پر تو واقعی چڑیلوں کا سایہ ہو گیا ہے ۔۔۔ اس کو اتارنے کے لئے تو تمہیں سرخ مرچوں کی دھونی دینی پڑے گی" ۔۔۔

درویش دوم ابھی فقرہ مکمل بھی نہ کر پایا تھا کہ وہ چنچل چڑیلیں ناشتہ کرنے واقعی پہنچ گئیں۔ جنہیں دیکھ کر دونوں درویش نیم پاگل سے ہو گئے۔ گویا دونوں پر چڑیلوں کا اثر ہو گیا ہو۔ اور اب میں نے کہا "تم دونوں ٹھیک ہوتے ہو یا چڑیلوں کا سایہ اتارنے کے لئے سرخ مرچوں کی دھونی دینی پڑے گی؟"۔ وہ دونوں ویسے تو ٹھیک ہو گئے مگر جزیرہ بالی کی سیر کا منصوبہ کینسل کر کے ان آسٹریلین درویشنوں کے ساتھ ساحل پر دن گزارنے کو تیار ہو گئے۔ جن کے ساتھ رات گزر سکتی ہے بھلا ان کے ساتھ دن گزارنے میں کیا مشکل تھی۔ چنانچہ ساحل پہ دن گزارنے کی تیاری شروع کی' جس میں ایک بہت بڑی دشواری تھی۔ ساحل اور سمندر پر دن گزارنے کا ایک مخصوص لباس ہوتا ہے۔ گو اس لباس میں کپڑے کا استعمال تو کم ہی ہوتا ہے البتہ خرچہ زیادہ ہوتا ہے۔ اور وہ لباس ہم تینوں کے پاس تھا نہیں۔ مگر ساحل پر جانا بھی لازمی تھا اور سوئمنگ کاسٹیوم خریدنے پر پیسے بھی نہیں خرچ کرنا چاہتے تھے' بلکہ محدود بجٹ میں اتنی سکت بھی نہ تھی۔ چنانچہ اس سفر میں پہلی مرتبہ تینوں درویشوں میں کسی بات پر کلی اتفاق ہوا تو وہ یہ تھا کہ ہم نے سنجیدگی سے غسل کا لباس ایجاد کرنا شروع کیا۔ درویش اول نے اپنی قمیص اتار دی اور ایک تنگ سی پتلون چڑھالی جس کو چڑھانے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

میں ہم دونوں نے بھی اسکی مدد کی۔ پھر اس پتلون کے پائینچے گھٹنوں تک اوپر کو موڑ لئے۔ درویش دوم نے یہی سلوک اپنی شلوار کے ساتھ کیا۔ مگر قمیص نہیں اتاری جو ہم دونوں نے زبردستی اتار دی۔ درویش دوم نے مجھے اپنی نیکر ادھار دیدی جو پہنتے ہی میری ٹانگوں پر غرارہ سی بن گئی۔ فرق صرف یہ تھا کہ ازار بند کی جگہ میں نے پٹی باندھ رکھی تھی۔ ہمارا یہ ملبوس اس قدر مضحکہ خیز تھا کہ ہم ایک دوسرے سے بھی شرمندہ ہو رہے تھے اور خود اپنے آپ سے بھی شرمسار تھے۔ اور اسی شرمندگی کے سبب کمرے سے باہر قدم رکھنے کی ہم میں ہمت نہ ہو رہی تھی کہ آسٹریلین درویشنوں نے آواز دی' جس پر ہم تینوں لبیک کہکر باہر نکل آئے اور اپنا حلیہ بھول کر ان کو تکتے رہ گئے۔ صاحب لباس ہو تو اُنسا اور اس لباس کے لئے جسم بھی ہو تو اُنسا۔ آسٹریلین لڑکیوں میں نسوانیت تو قدرے کم ہی ہوتی ہے مگر جسم و جسامت بھرپور ہوتی ہے۔ یہی حال دونوں درویشنیوں کا تھا۔ ہر ایک کا جسم اک ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر تھا۔ جسکا ہمیں اگر رات کو پتہ چل جاتا تو سچ مچ کا بھوت بلا لیتے۔ بھلے درویش دوم کو ہی لانا پڑتا۔ آگے آگے درویشانیاں اور پیچھے پیچھے ہم۔ ان کی چال قیامت کی چال تھی اور ان کی چال دیکھ کر ہم اپنی چال بھی بھول گئے۔ کیونکہ خود ساختہ لباسوں نے اپنی اپنی جگہ ہم تینوں کے لئے مشکل پیدا کر دی تھی۔ مثلاً" میری غرارہ نما نیکر پٹی کسنے کے باوجود قدم قدم پر نیچے گرتی چلی جا رہی تھی۔ اور اگر اس نیکر کو اپنی گرفت میں نہ رکھتا تو کھلے ساحل پر یقیناً اوپن ایئر کیبرے بن جاتا اور لوگ "پاگل ای اوئے .... پاگل ای اوئے" کے نعرے لگاتے۔ پھر دنیا میں لباس تو بنا ہی اس لئے ہے کہ انسان اپنے جسمانی معائب چھپا سکے۔ بھلا میں اس غرارہ نما نیکر میں اپنی شکر قندی جیسی ٹانگیں کیسے چھپاتا؟ بھالو جسامت درویش دوم تو تھری پیس سوٹ میں بھی بھالو لگتا تھا۔ اس کے بدن پر اگا ہوا بالوں کا جنگل بھلا اکیلی شلوار میں کیونکر سماتا۔ ظاہر ہے ایسے لوگ جنگلوں میں تو سما سکتے ہیں ساحلوں پر نہیں۔ رہا تنگ پتلون میں جکڑا درویش اول تو اسکی جاپانی کھلونے والی چال ہی بدل گئی۔ کیونکہ اس پر خطرہ لاحق تھا کہ

اگر وہ کھل کر سانس بھی لے گا تو اسکی تنگ پتلون کھل جائے گی اور اگر پتلون کھلے گی تو اس کے سب بھید کھل جائیں گے۔ ادھر درویشنیوں کو کوئی بھید چھپانے کی فکر نہ تھی۔ چنانچہ وہ ساحل پر پہنچتے ہی سمندر میں کود گئیں اور ہم تینوں ساحل پر کھڑے کے کھڑے ہی رہ گئے۔ اور یونہی ان دونوں آسٹریلین درویشنیوں کو سمندر میں تیرتے اور ساحل پر لوٹتے دیکھ دیکھ کر دن گنوا دیا۔

شام ہوتے ہی درویش اول نے میرے کمرے میں پڑاؤ ڈال دیا۔ مجھے کمرہ چھوڑنے کو تو وہ ہرگز نہیں کہہ سکتا تھا۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ میں لڑنے مرنے پہ تیار ہو جاؤں گا۔ چنانچہ اس نے درویش دوم کے خوفناک خراٹوں کا بہانہ بنا کر میرے کمرے میں سونے کی خواہش ظاہر کی جو میں نے بادل نخواستہ قبول کر لی۔ ویسے بھی دو درویشنیوں کے لئے درویش بھی دو ہی چاہیے تھے۔ لہٰذا اس کی آمد سے مجھے بھی کچھ حوصلہ سا مل گیا اور ہم دونوں نے ان دونوں کو بھوت کہانیوں کے جال میں پھنسانے کی سکیمیں بنانی شروع کر دیں۔ درویش اول نے تو آخری حربے کے طور پر دست شناسی پر ہاتھ رواں کرنے کا منصوبہ بھی بنا لیا۔ اور مجھے یقین تھا کہ درویش اول جیسے عیار کے سامنے وہ یقیناً ہتھیار ڈال دیں گی۔ ہم دونوں نے اپنی اس یقینی کامیابی پر جشن تک منا لئے۔ مگر ان دونوں کا کمرہ بھی بند تھا اور بتی بھی گل تھی۔ "خدا خبر کہاں رہ گئیں؟ ساحل سے تو سیدھی ادھر ہی آئیں تھیں۔" میں نے درویش اول سے سوال کیا۔ سمندر میں تیرتے تیرتے تھک گئی ہونگی اس لئے آرام کر رہی ہیں۔ اچھا ہے جتنی دیر سے اٹھیں گی اتنی ہی تازہ دم ہونگی۔ درویش اول نے مجھے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ مگر مجھے ذرہ بھر تسلی نہ ہوئی' بلکہ بے چینی میں مزید اضافہ ہو گیا۔ ادھر درویش اول کو پورا یقین تھا کہ گیم ہمارے ہاتھ میں ہے اور اسی بھروسے پر آدھی رات گزار دی اور آخر تھک ہار کر لیٹ گئے۔ مگر۔

ہر آہٹ پہ چونکے ہم' جاگ کے ساری رات کٹی
آنے والی سو گئیں جانے کس کے پہلو رات کٹی

میں درویشنیوں کو بھلا کر اونگھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ درویش اول نے مجھے جھنجھوڑ کر اٹھا دیا۔ میں سمجھا کہ وہ آگئی ہیں۔ مگر ان کے بجائے درویش اول کے ذہن میں ایک سکیم آئی تھی۔ اور اس سکیم کو پورا کرنے کے لئے ایک عدد جیمز باؤنڈ درکار تھا۔ چنانچہ درویش اول کے بتائے ہوئے راستے پر (جو یقیناً صراط مستقیم نہیں تھا) عمل کرتے ہوئے میں ان کے کمرے کے روشن دان تک پہنچنے کی تگ و دو کرنے لگا۔ درویش اول کے کندھوں پر چڑھ کر میں نے روشن دان تک رسائی تو حاصل کر لی مگر کمرے کے اندر تک جھانکنے کے لئے ایک آدھ فٹ اور اونچا ہونا لازمی تھا۔ لہٰذا میں نے اپنے پاؤں اس کے کندھوں سے اوپر کی سیڑھی یعنی موصوف کے سر پر رکھے۔ عام حالت میں تو درویش اول اپنے سر پر مکھی بھی نہیں بیٹھنے دیتا تھا' مگر ان درویشنیوں کے عشق میں وہ کچھ نہ بولا۔ ادھر میں عجب مشکل میں تھا۔ کیونکہ ایک تو اس کی چٹیل اور چپڑی کھوپڑی پر قدم جمانے کا مسئلہ نہایت پیچیدہ تھا' دوسرے روشن دان تک رسائی اور تیسرے اندھیرے کمرے میں جھانک کر جاسوسی کرنا۔ مگر جب اندر نظر گئی تو میں سارے خطرے بھول بھال گیا اس اندھیرے میں بھی ان دونوں درویشنیوں کا کردار اور عمل روشن ہو گیا۔ وہ بھوتوں کے خوف کے بغیر ہی ایک دوسرے سے لپٹی تھیں۔ ہم دونوں ان دونوں کے اس باہمی تعلق پر اس قدر برہم ہوئے کہ درویش اول تو سیدھا خراٹوں والے درویش دوم کے کمرے میں جا کر سو گیا۔ اور میں رات بھر بستر پر کباب سیخ کی مانند کروٹیں لیتا اور تڑپتا رہا۔

صبح ناشتے کی میز پر محبت سے مایوس چڑچڑے درویش اول نے نہار منہ درویش دوم کی حجامت بنا دی۔ حجامت سے ہماری مراد زبانی کلامی حجامت ہے۔ کیونکہ استرے سے تو بالوں کے اس جنگل کی ایک درجن حجام بھی حجامت بنانے کے قابل نہ تھے۔ جھگڑا جزیرہ بالی میں آخری دن گزارنے کا تھا۔ دونوں درویشوں کا شوق سیاحت بالکل مختلف سمتوں میں تھا۔ مگر مصیبت یہ تھی کہ اکٹھا سیر کرنا بھی لازمی تھا۔ کیونکہ ہمارے معاشی حالات کے مطابق علیحدہ علیحدہ سیر پر جانے کی گنجائش ہرگز نہ تھی۔ چنانچہ بھوت بنگلے سے سامان سمیٹا اور اس طلسمی جزیرے کے میدانوں اور پہاڑوں کا رخ کیا۔ کیونکہ ساحل کی جانب آنے سے تو اہل بالی بھی کتراتے ہیں۔ انکے عقیدے کے مطابق سمندروں پر بدروحوں کا راج ہوتا ہے۔ پہاڑوں پر بھگوان اور میدانوں میں انسان بسیرا کرتے ہیں۔ بالی کی بستیوں میں ہر روز کوئی نہ کوئی مذہبی تہوار ضرور منعقد ہوتا رہتا ہے' کیونکہ ایک تو ان کا سال صرف ۲۱۰ دن کا ہوتا ہے پھر ہر مندر میں ہر سال کم از کم ایک تہوار ضرور منایا جاتا ہے۔ اور ہر گاؤں میں مندر بھی تو کئی کئی ہوتے ہیں۔ اسی لئے عام سال کے دوران بالی میں مذہبی تہوار چلتے ہی رہتے ہیں۔ ان تہواروں پر لڑکیاں زرق برق لباس پہن کر' خوراک' پھلوں اور پھولوں کے خوبصورت سجاوٹ والے نذرانے لیکر مندروں میں قطار اندر قطار آتی ہیں۔ اکثر اوقات ان سجے ہوئے منزل در منزل نذرانوں کی اونچائی نذرانے لانے والی لڑکیوں کے قد و قامت سے تجاوز کر جاتی ہے۔ مگر چھوٹے قدوں اور بھرپور جسموں والی یہ پجارنیں درحقیقت دیویاں دکھائی دیتی ہیں۔ ان سنہری بدن پجارنوں کی پوجا کرنے کو بار بار جی چاہا اور اگر ہمیں گاؤں کے 'ڈشکروں' کے ڈنڈوں کا ڈر نہ ہوتا تو ہم بے خطر اس آتش نمرود میں کود جاتے اور ان آتش فشاں پہاڑوں اور آتش فشاں جوانیوں کے جزیرے میں راکھ ہو جاتے' مگر ہماری بزدلی نے ہمیں باز رکھا۔

اگرچہ ہم نے اپنے سامان کے سبب پوری بیوں یعنی بالی کی سوزوکی وین بک کروا رکھی تھی مگر ڈرائیور کی سفارش پر ایک سواری ہمیں اپنے ساتھ بٹھانی پڑی۔ تنگ پتلون اور بو تیک بشرٹ والا یہ پھرت باز نوجوان کبھی پھدک کر ایک درویش کے ساتھ بیٹھتا اور کبھی دوسرے کے ساتھ۔ اس کی انگریزی خاصی معقول تھی اور اسکی گفتگو سے اندازہ ہو گیا کہ وہ سیاحوں کو دلچسپ قصے سنانے میں خاصی مہارت رکھتا تھا۔ چنانچہ یہ مفت کا گائیڈ ہمارے ساتھ شامل ہو گیا۔ ڈینپسر اُوبُد Ubud شاہراہ پر ہماری بیوں دوڑتی جا رہی تھی۔ سڑک کے دونوں جانب ناریل کے جھومتے پیڑ اور چاول کے کھیت تھے' جو حد نگاہ تک پھیلے ہوئے تھے۔ کہیں کہیں ناریل کے جھنڈ میں

مندر اور گاؤں ..... گاؤں اور مندر ..... پھر ایک گاؤں ایسا آیا جہاں ہمارے گائیڈ نے گاڑی روکنے کو کہا اور اس گاؤں میں چلنے کا اشارہ کیا۔ وہاں ایک ہجوم تھا۔ بہت سے لوگوں نے لمبے لمبے بانسوں کی مدد سے رنگ برنگے کاغذوں اور زرق برق کپڑوں سے سجا ایک مینار سا اٹھا رکھا تھا۔ لکڑی کے ایک تختے پر کھڑا پروہت اس مینار پر کچھ پانی پھینک رہا تھا۔ موسیقی اور ہجوم کے شور نے قیامت برپا کر رکھی تھی۔ پھر اچانک اس جلوس پر کچھ لوگوں نے حملہ کر دیا۔ اس منزل در منزل مینار کو اٹھائے ہوئے نوجوانوں نے مینار کو بچانے کی خاطر بھاگ دوڑ شروع کی۔ نیم آسمان پر مینار سے لٹکا پروہت متواتر پانی پھینکے جا رہا تھا۔ اک عجب لوٹ کھسوٹ اور کھینچا تانی کا عالم تھا۔ موسیقی بھی جاری تھی اور شور و ہنگامہ بھی۔ ہماری سمجھ میں قطعاً" کچھ نہ آ رہا تھا۔ اس افراتفری میں ہمارا گائیڈ بھی غائب ہو گیا۔ اور درویش دوم بھی ..... خیر درویش دوم تو فوراً ہی مل گیا کیونکہ وہ ناریل کے پیڑ کے پیچھے چھپا ہوا ہمیں آوازیں دے رہا تھا۔ "اوئے بیوقوفو ادھر آجاؤ ورنہ مفت میں مارے جاؤ گے۔" ہم لوگ فوراً ادھر کو چلے گئے اور اس کمین گاہ سے اس جنگ و جدل کا نظارہ کرنے لگے۔ اس ہجوم کے پیچھے ایک اور بھی ہجوم تھا اور وہ ہجوم سیاحوں کا تھا جو کیمروں سے لیس اس ہجوم پر بھرپور حملہ آور تھا۔ سیاحوں کو دیکھ کر ہمیں کچھ تسلی تو ہوئی مگر پلے پھر بھی کچھ نہ پڑا۔ پھر سیاحوں کے جھرمٹ سے اچانک ہمارا گائیڈ نمودار ہوا' جس نے اس چھینا جھپٹی کی وضاحت کی۔ دراصل یہ گاؤں کے ایک مالدار آدمی کا جنازہ تھا جسے جلانے کے لئے لے جایا جا رہا تھا۔ ان کے عقیدے کے مطابق مرنے والے کی روح جلنے کے بعد گھر کے ارد گرد منڈلانے لگتی ہے۔ اسی لئے روح کو گمراہ اور کنفیوز کرنے کے لئے جنازے پر حملے کئے جاتے ہیں۔ مختلف راستوں اور گزرگاہوں سے گزار کر جلایا جاتا ہے تاکہ روح گھر کا راستہ نہ ڈھونڈ سکے۔ مرنے والے کی روح تو کنفیوز ہوئی یا نہیں اس کی تو ہمیں خبر نہیں البتہ ہم لوگ خاصے کنفیوز ہو گئے اور فوراً ہی وہاں سے اُوبُد کا راستہ اختیار کیا۔

اُوبُد کا پہاڑی قصبہ جزیرہ بالی کا لاہور ہے۔ مصوروں' شاعروں' سنگ تراشوں' مجسمہ سازوں اور فنکاروں کا شہر۔ جہاں رقص و موسیقی کی تعلیم بھی دی جاتی ہے اور مصوری اور مجسمہ سازی کی بھی۔ یہ بالی کے تہذیب و تمدن کا جیتا جاگتا شہر ہے۔ جہاں ڈینپسر والی افراتفری کے بجائے سکون' تحمل اور ٹھہراؤ ملتا ہے۔ ایسا حسین شہر جہاں ناریل کی اونچائی سے اونچی عمارتیں دکھائی نہیں دیتیں۔

جزیرہ بالی میں تقریباً" ہر گھر کے سامنے بھگوان بوما کا مجسمہ موجود ہوتا ہے۔ زمین کے دیوتا کا یہ بیٹا ہاتھ میں گرز لئے گھروں کی حفاظت کرتا ہے تاکہ دنیاوی آفتیں اور بد روحیں گھر میں داخل نہ ہو سکیں۔ شاید بھگوان بوما کا خوف تھا جس کے سبب درویش دوم نے ہمیشہ ان کے گھروں میں جانے سے انکار کیا' حالانکہ وہاں کے لوگ بڑے ہی مہمان نواز ہیں اور اکثر گھر ان کے بنائے ہوئے مجسموں اور تصویروں کی آرٹ گیلریاں معلوم ہوتے ہیں۔ جہاں باقاعدہ سودے بازی کے اہتمام کے ساتھ تصویروں اور مجسموں کی خرید و فروخت ہوتی ہے۔ وہاں مردوں اور عورتوں کے کاموں کی بڑی اچھوتی تقسیم ہے۔ مثلاً" خرید و فروخت' کھیتی باڑی' ناچ گانا' بچے پیدا کرنا' پالنا اور گھر چلانا عورت کی ذمہ داری ہے۔ باقی سارے کام بیچارے مردوں کے سر ہیں۔ سب سے پہلا کام تو شادی کے لئے لڑکی کو اغوا کرنے کا ہے۔ اور شادی کا یہ طریقہ بڑا مقبول ہوتا جا رہا ہے۔ کیونکہ یہ سب سے کم خرچ طریقہ ہے۔ اس کے علاوہ مرغے لڑانا' پتنگ اڑانا' سیاحوں کو الو بنا کر ان کی جیب تراشی بھی مردوں ہی کی ذمہ داری ہے۔ اور اسی کام پر ہمارے معصوم گائیڈ کی بھی گزر اوقات تھی۔ درحقیقت وہ بیوں ڈرائیور کا پارٹنر تھا۔ کیونکہ ایسی وارداتیں سواریوں سے بھری بیوں میں باآسانی ہو سکتی ہیں۔ مگر ہمارے ساتھ جیب تراشی کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ میری تو ویسے ہی جیب خالی تھی۔ درویش اول ڈرائیور کے ساتھ اگلی سیٹ پر فٹ تھا۔ رہا درویش دوم تو اسکی جیب سے پیسہ نکالنا شیش ناگ کے حلق سے لعل (من) نکالنے سے بھی دشوار تھا۔ اسی لئے وہ بیچارہ جنازے کے دوران سیاحوں کے جھرمٹ میں گھس کر دہاڑی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بنانے گیا تھا۔

درویش اول حسب عادت بیوں کی اگلی سیٹ پر فٹ ہو کر بیٹھ گیا۔ میں بوجہ مجبوری سب کا سامان لادنے میں مصروف تھا۔ اور درویش دوم غائب۔ جہاز کے اڑنے میں صرف چار گھنٹے باقی تھے اور ہم کو ڈینپسر کے ہوائی اڈے پر بھی پہنچنا تھا۔ اگر درویش دوم کی جیب میں ہمارے پیسے نہ ہوتے تو ہم یقیناً اسے جزیرہ بالی میں ہی چھوڑ جاتے' مگر مجبوراً اسکا انتظار کرنا پڑا۔ طویل انتظار کے بعد وہ مست ہاتھی کی طرح جھومتا جھومتا پہنچا تو اسکے ہاتھ میں شاپنگ بیگ تھا۔ درویش اول نے چنگھاڑتے ہوئے پوچھا" یار! یہ شاپنگ کرنے کا کون سا وقت ہے؟" جس پر درویش دوم نے لاپروائی سے جواب دیا" یہی تو شاپنگ کا وقت ہے"..... صبح صبح ہندو دکاندار پہلے گاہک کو خالی ہاتھ نہیں جانے دیتا ..... اس سے بدشگونی ہوتی ہے۔ اسی لئے تو میں نمار منہ گیا تھا۔ ہر چیز اونے پونے داموں خرید لایا ہوں" ہم نے اسکی اس منطق کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے اور چپکے سے ہوائی اڈے کا سفر اختیار کیا۔ ڈینپسر سے ہمیں جکارتہ پرواز کرنی تھی۔ جہاں سے دوسرا جہاز پکڑ کر آسٹریلیا کے شہر ایڈیلیڈ جانا تھا۔

آسٹریلیا

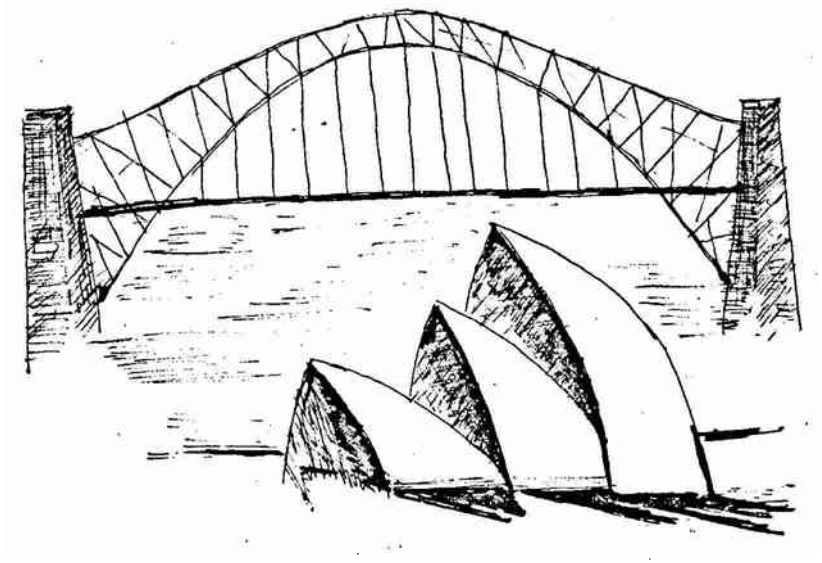

www.iqbalkalmati.blogspot.com

آسٹریلیا کو دنیا کی سب سے بڑی جیل تصور کیا جاتا رہا ہے جو مشرق سے مغرب تک ۴۰۰۰ چار ہزار کلو میٹر اور شمال سے جنوب تک ۳۲۰۰ تین ہزار دو سو کلو میٹر کے طول و عرض میں پھیلا ہوا ہے۔ ملک کے چار سو سمندر واقع ہے' جسے بڑا سے بڑا تیراک بھی تیر کر عبور نہیں کرسکتا۔ اس قدرتی زندان خانے کو ۱۷۸۸ء میں سرکار برطانیہ نے خوفناک مجرموں کو دیس نکالا دینے کے لئے پہلی مرتبہ استعمال کیا اور اسکے بعد اس قسم کے مجرموں سے لدے پھندے جہاز آسٹریلیا بھیجے جانے لگے۔ اسی کامیاب تجربے کی بناء پر ان گوروں نے ہندوستان کے کالے آزادی پسندوں کو بھی مجرم ٹھہرا کر کالے پانی (عبور دریائے شور) بھیجنا شروع کیا۔ آسٹریلیا اور ایک عام جیل میں بنیادی فرق وہی ہے جو چڑیا گھر اور نیشنل پارک کے مابین ہوتا ہے۔ یعنی قیدی بہرحال دونوں ہی ہوتے ہیں۔ پہلی صورت میں پنجرے کی قید تک محدود ہوتے ہیں اور دوسری صورت میں نیشنل پارک کے حدود وقیود تک۔

یہ برطانوی مجرم رفتہ رفتہ آسٹریلیا کے قدیم باشندوں پر سبقت لے گئے۔ کیونکہ وہاں کے ابواورجنل Aboriginals نسل کے چھوٹے چھوٹے سیاہ فام لوگ ابھی تک جنگلوں اور غاروں میں اقامت رکھتے تھے اور جنگلی جانوروں کے شکار پر گزر اوقات کرتے تھے۔ ان کے شکار کا سب سے دلچسپ اور مہلک ہتھیار "بوم رینگ" Boomerange تھا۔ "بوم رینگ" کوئی تین انچ چوڑا اور دو فٹ لمبا ہتھیار ہے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اور درانتی کے پھل کی طرح نیم دائرے کی صورت میں ہلال نما بنا ہوتا ہے۔ اس ہتھیار کے دونوں سرے ایسے زاویوں پر مڑے ہوئے ہوتے ہیں کہ جب کوئی ماہر شکاری اسے ہوا میں لہرا کر پھینکتا ہے تو شکار کو زخمی کرنے کے بعد "بوم رینگ" مخصوص زاویوں کے سبب خود بخود شکاری کے پاس لوٹ آتا ہے۔ اچھے "بوم رینگ" کے لئے ہتھیار بنانے والا بھی ہنرمند ہونا چاہئے اور شکاری بھی ماہر فن۔ آجکل یہ ہتھیار شکار کے بجائے کھیل کے مقابلوں کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ اور غیر ملکی سیاح اسے سونیئر سمجھ کر خریدتے ہیں۔

۱۸۵۱ء میں آسٹریلیا کی ریاست وکٹوریہ میں سونا دریافت ہوا تو اس دیس کے مجرموں کے وارے نیارے ہوگئے اور دیس نکالا دیئے گئے ان غنڈوں اور قاتلوں کے وارث بھی وہاں پیدا ہو گئے اور ان سے ملاقات کرنے کے لئے آسٹریلیا پہنچنا شروع ہو گئے۔ قاتلوں کے وارثوں کے بعد وارثوں کے وارث یعنی سرکار برطانیہ بھی سونے کی تلاش میں جا پہنچی اور اس طرح آسٹریلیا ایک بدنام جیل اور گمنام خطے سے مہذب ملک بن گیا۔ کیونکہ گاؤں کے لوگ ایک مثال دیا کرتے ہیں کہ' جیدے گھر دانے۔ اوہدے کملے وی سیانے یعنی جسکے پاس دولت آتی ہے اسکے پاس دانائی بھی آجاتی ہے۔ چنانچہ یہی حال آسٹریلیا کا ہوا۔ دولت پاتے ہی آسٹریلین ترقی کی راہ پر گامزن ہوگئے۔ انکی ترقی میں ہمارے خطے کے ایک نوجوان امیر دوست محمد خان اور اس کے چالیس اونٹوں نے نہایت اہم کردار ادا کیا۔ آسٹریلیا میں دوست محمد اور اسکے چالیس اونٹ علی بابا اور چالیس چور کی داستان کی طرح مشہور ہیں۔ وہاں کے صحرا کو عبور کرنے اور بار برداری کے لئے اس صحرائی جہاز کی بھی اشد ضرورت تھی اور اس بندۂ صحرا کی بھی۔ چنانچہ اس افغان نوجوان نے (جسکے سبب ان کی نسل کو اب وہاں "غانز" کہا جاتا ہے) آباد کاری کے لئے دور دراز علاقوں تک سامان پہنچانے کی ذمہ داری سنبھالی اور خوب سنبھالی کہ ڈاک بانٹنے کا کام بھی اسی کے سپرد کر دیا گیا۔ ڈاک کے بعد ٹیلیگرام کا نظام آیا تو اونٹوں کی ٹیڑھی کلوں اور سیدھی قطاروں نے پورے آسٹریلیا میں پول اور تار پہنچائے۔ آسٹریلیا کو دریافت کرنے والی سیاحتی مہموں کی کامیابی کا انحصار بھی افغانوں کے اونٹوں پر تھا۔ جو میل ہا میل کا سفر پانی کے بغیر طے کرتے رہے۔

اونٹوں کا آسٹریلیا کا سفر درحقیقت ۱۸۵۵ء میں ایک برطانوی افسر کے ہمراہ شروع ہوا۔ یہ برطانوی افسر پہلی اور دوسری برٹش افغان جنگوں کے دوران صوبہ سرحد میں موجود تھا اور اونٹوں کی باربرداری کی خصلت سے شناسا ہوگیا چنانچہ اپنی ملازمت سے ریٹائر ہونے کے بعد جب اس نے آسٹریلیا میں رہائش پذیر ہونے کا فیصلہ کیا تو اپنے ہمراہ چند اونٹ اور اونٹ بان لے گیا۔ آسٹریلیا کی آبادی میں اونٹوں کا تجربہ اتنا کامیاب رہا کہ پھر کراچی کی بندرگاہ سے جب کوئی برطانوی جہاز آسٹریلیا کے لئے گزرتا تو اس پر اونٹ بھی ہوتے اور اونٹ بان بھی۔ کراچی میں باقاعدہ ایسی رکروٹنگ ایجنسیاں کھل گئیں جو بلوچستانی اونٹ اور افغانی اونٹ بان آسٹریلیا پہنچانے لگے۔ چنانچہ آسٹریلیا نے ایک صدی پہلے وہی کردار ادا کیا جو موجودہ دور میں دوبئی نے ادا کیا۔

امیر دوست محمد خان اپنے چالیس اونٹوں کے ہمراہ کراچی سے آسٹریلیا ۱۸۹۰ء میں پہنچا۔ اسکی غیر معمولی شہرت درحقیقت ایک رومانوی داستان کے سبب ہے۔ کول گاردی کے سونے کی کانوں کے قریب' جہاں افغانوں کی خیمہ بستی تھی' ایک جرمن خاندان بھی آباد تھا۔ دوست محمد ایک خوبرو نوجوان ہونے کے علاوہ کشتی کا بھی بڑا ماہر تھا۔ بڑے بڑے طاقتور کان کن اس سے کشتی کا مقابلہ کرنے آتے مگر وہ انہیں ایک لمحے میں پچھاڑ دیتا۔ اسی دوران جرمن خاندان کی ایک لڑکی اینی Annie اور دوست محمد کا عشق ہوگیا۔ دوست محمد اینی سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ مگر جرمن خاندان نے انکار کر دیا تو وہ دونوں سسی پنوں بن گئے اور اونٹ پر بیٹھ کر غائب ہوگئے۔ اور ہزاروں میل کے صحرا کو عبور کر کے پورٹ ہیڈ لینڈ Port Headland جا پہنچے۔ جہاں انہوں نے شادی کی اور انکے ہاں ایک بچہ پیدا ہوا جسکا نام انہوں نے مصطفےٰ رکھا۔ جب مصطفےٰ چند سال کا ہوا تو دوست محمد اپنی بیوی اینی کے ہمراہ کراچی آیا اور اپنے بیٹے کو رشتے داروں کے پاس چھوڑ کر پھر آسٹریلیا لوٹ گیا۔ اب تک اینی کے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

خاندان سے صلح بھی ہو چکی تھی۔ چنانچہ دوست محمد نے کال گاروی میں جا کر دوبارہ کاروبار شروع کیا۔ اسکے کاروبار نے اسقدر ترقی کی کہ ایبی کے دو بھائی اسکے ہاں ملازم ہو گئے۔ اسی اثنا میں اسکے ہاں چار بیٹیاں اور ایک بیٹا پیدا ہوا۔

کسی کاروباری جھگڑے پر دوست محمد اور اسکے سالوں کے درمیان ہاتھا پائی ہو گئی۔ طاقتور خان نے ایک سالے کی خوب پٹائی کی۔ اس بے عزتی کا بدلہ لینے کے لئے دونوں سالوں نے انتقام لیا اور جب دوست محمد سو رہا تھا تو اسے قتل کر دیا۔ ایبی اس قتل کی گواہ تھی۔ مگر اس نے عدالت میں اپنے بھائیوں کے حق میں گواہی دی اور وہ آزاد ہو گئے۔ ایبی نے فوراً کراچی کا سفر اختیار کیا تاکہ دوست محمد کی کراچی والی جائیداد پر قبضہ جما سکے۔ ایبی کی اس حرکت پر آسٹریلیا میں مقیم پٹھان سخت ناراض تھے۔ اور وہ حقیقت میں ایبی کو ہی دوست محمد کا قاتل سمجھتے تھے۔ چنانچہ دوست محمد کے ساتھیوں کے تین بیٹوں نے ایبی سے اپنے چچا کا انتقام لینے کے لئے کراچی کا سفر اختیار کیا۔ کراچی پہنچتے ہی وہ سیدھے دوست محمد کے گھر پہنچے اور انہوں نے چاقوؤں کے وار کر کے ایبی کو قتل کیا اور فرار ہو گئے۔ قتل کے دوران ایبی نے ایک لڑکے کی انگلی کاٹ لی۔ جب اسکا پوسٹ مارٹم کیا گیا تو اسکے منہ سے کٹی ہوئی انگلی نکلی۔ اور اس طرح پولیس ان تینوں لڑکوں کو تلاش کرنے میں کامیاب ہو گئی اور انہیں پھانسی چڑھا دیا گیا۔ ایبی ۷ اگست ۱۹۱۰ء کو کراچی میں قتل ہوئی اور اب وہیں دفن ہے۔

ایڈیلیڈ سے آسٹریلیا کے مغربی شہر ایلس سپرنگ تک ٹرین شروع کی گئی تو اسکا نام "دی غان" رکھا گیا۔ کیونکہ منزل کے آخری حصے میں ٹرین کو انجن کے بجائے اونٹ کھینچ کر لے جاتے تھے۔ اس ٹرین کو کھینچنے کے لئے گو اب اونٹوں کی ضرورت نہیں رہی مگر نام اب بھی "دی غان" ہے۔ بالآخر وہ مشینیں جو اونٹوں پر لاد کر آسٹریلیا کے کونے کونے پہنچائی گئیں جب اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے اور چلنے پھرنے کے قابل ہو گئیں تو انہوں نے اونٹوں کی جگہ لے لی۔ کیونکہ وہ جوان بھی تھیں اور تیز بھی۔ جب اونٹوں کا کاروبار ختم ہوا تو پٹھانوں نے مزدوری شروع کر دی' یہاں تک کہ ایڈیلیڈ کی بندرگاہ پورٹ ڈارون بھی پٹھان مزدوروں کی مدد سے بنائی گئی۔ ایڈیلیڈ میں سو سالہ پرانی ایک مسجد بھی موجود ہے جو پٹھانوں نے تعمیر کی تھی اور ابھی تک قائم و دائم ہے۔

اس رومانوی دور کے اونٹ اور اونٹ بان دونوں کی نسلیں آسٹریلیا میں موجود ہیں۔ اونٹوں کی ضرورت ختم ہوئی تو انہیں صحرا میں آزاد کر دیا گیا' جہاں وہ پھلتے پھولتے رہے۔ اور اب آسٹریلیا کے ریگزاروں میں سینکڑوں ہزاروں اونٹ آزادی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ چند برس قبل سعودی عرب میں وبا پھیلی تو بہت سے اونٹ مر گئے۔ چنانچہ سعودی حکومت نے آسٹریلیا سے سینکڑوں اونٹ درآمد کئے اور اپنے ملک میں اونٹوں کی کمی کو پورا کیا۔

قوانٹاس Qantas آسٹریلیا کی قومی ایئرلائین ہے اور اس کے جہازوں کی دم پر کینگرو کا علامتی نشان بنا ہوتا ہے۔ ہم لوگ پہلی مرتبہ کسی ایسی ہوائی کمپنی کے طیارے میں سفر کر رہے تھے جس کا علامتی نشان جانور ہو۔ کیونکہ عموماً" پرندوں کو ہی پرواز کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ درویش دوم عجیب و غریب منطق کا مالک تھا۔ اس نے اندیشہ ظاہر کیا کہ اگر جہاز کی پرواز بھی علامتی جانور کینگرو کی چال سی ہوئی تو سفر بہت برا ہو گا۔ درویش دوم ویسے بھی پروازوں سے بہت خوفزدہ ہوتا تھا۔ مگر درویش اول نے تسلی دیتے ہوئے فرمایا کہ فکر کی کوئی بات نہیں سفر خوب مزے میں گزرے گا' کیونکہ صرف جہاز پر ہی کینگرو کا نشان بنا ہے ایئر ہوسٹس تو کینگرو نہیں ہونگی اور پھر اس نے بالی والی دونوں آسٹریلین لڑکیوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ سوچو اگر وہ دونوں ایئر ہوسٹس کی وردی پہن کر آجائیں تو کیسی لگیں گی؟ اور پھر آسٹریلیا میں تو ہر لڑکی ان دونوں سے بہتر ہی ہوگی۔ چنانچہ خوبرو فضائی میزبانوں کی امید پر ہم لوگ آنکھ بند کر کے جہاز میں سوار ہو گئے۔ مسافروں کو اپنی مخصوص نشستوں تک پہنچانے کے لئے ایک باریش سٹیورڈ مقرر تھا جسے دیکھتے ہی درویش اول کا ماتھا ٹھنکا اور اس نے فوراً دوسرے میزبانوں کی طرف نظر دوڑائی۔ ہر سو باریش باوردی مشتنڈہ نما سٹیورڈ ہی

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

دکھائی دیئے۔ میزبانی اور خصوصاً" فضائی میزبانی تو صرف لڑکیوں ہی کو زیب دیتی ہے۔ لڑکے تو ہوائی قزاق یعنی ہائی جیکر دکھائی دیتے ہیں۔ پھر قوانٹاس Qantas کے یہ سٹیورڈ جنازوں میں شامل ہونے کے لئے تو موزوں تھے جہازوں میں میزبانی کے لئے ہرگز نہیں۔ اپنی نشستوں تک پہنچے تو درویش اول جھٹ سے کھڑکی کی جانب سیٹ پر بیٹھ گیا۔ گو عام حالات میں آئیل سیٹ پر اسکا جدی پشتی قبضہ ہوتا تھا تاکہ ایئر ہوسٹس کی چال ڈھال پر نظر رکھ سکے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر جہاز کی کھڑکی کھل سکتی تو وہ فوراً جہاز سے باہر کود جاتا۔ تاہم وہ جہاز سے باہر تو نہیں کودا البتہ احتجاج کے طور پر اس نے اپنی آنکھوں پر سیاہ کھوپے Slumbrette چڑھا لئے جو ہوائی کمپنی والے مسافروں میں تقسیم کرتے ہیں تاکہ جو لوگ روشنی کے باوجود آرام کرنا چاہیں وہ آنکھوں پر کھوپے چڑھا کر سو جائیں۔ اگرچہ درویش اول کا سونے کا کوئی ارادہ نہ تھا نہ یہ سونے کا وقت تھا اور نہ وہ سویا۔ مگر ضدی درویش نے اپنے احتجاج کا بھرم رکھتے ہوئے برابر سیاہ کھوپے چڑھائے رکھے۔ کھانا بھی اس حالت میں کھایا۔ یہاں تک کہ فلم بھی کھوپے چڑھائے ہوئے ہی دیکھ ڈالی۔ جب فلم ختم ہوئی اور جہاز کی روشنیاں بند ہو گئیں تو اس نے اپنے سیاہ کھوپے اتار لئے اور الو کی طرح جگرانہ (رت جگا) شروع کر دیا۔ "آئیل' کے دوسری جانب سیٹ پر ایک دراز قامت سردار جی بیٹھے ہوئے تھے۔ جنہوں نے فضائی ساقی سے خوب دوستی بنا رکھی تھی اور اس دوستی کے بل بوتے پر مفت وارو چڑھائے چلے جا رہے تھے۔ انہوں نے گلاس کو ڈیک لگائی' وارو گلے میں انڈیلی اور خالی گلاس مجھے دکھاتے ہوئے پوچھا۔ "مہاراج کچھ پیئو گے؟" سردار جی کے اس سوال نے مجھے تذبذب میں ڈال دیا۔ کیا رات کے بارہ بجے بھی سردار جی لوگ اسی انداز میں سوچتے ہیں جس طرح دن کے بارہ بجے؟ (اگر واقعی وہ سوچتے ہیں) اولاً" تو میں مہاراج نہیں تھا' بلکہ حلیئے سے تو صرف راج ہی لگتا تھا۔ دوسرے اگر کچھ پینا چاہتا بھی تو بھلا خالی گلاس سے کیا پیتا.... چنانچہ "نئیں سردار جی توہاڈی بڑی مہربانی ...." کہہ کر پیچھا چھڑانے کی کوشش کی۔ مگر سردار جی کو تو رات بھی کاٹنی تھی اور سفر بھی' اور وہ گپ لگانے کے فل موڈ میں تھے۔ وہ مسافر جنہیں دوران سفر جہاز میں نیند نہ آتی ہو وہ اکثر ایسے مسفروں کی تلاش میں رہتے ہیں جن کو گپیں سنا سنا کر وقت کاٹ سکیں۔ اس پورے جہاز میں سردار جی کو شاید مجھ جیسا کوئی دوسرا چغد نظر نہیں آیا ہوگا۔ چنانچہ انہوں نے مجھ پر سوال و جواب کی بوچھاڑ شروع کر دی۔ اگر میں پردیس میں نہ ہوتا.... سردار جی دیو قامت نہ ہوتا .... اور دوسرے درویش بھی میری طرح بزدل نہ ہوتے تو میں سردار کے کسی سوال کا جواب نہ دیتا۔ مگر اپنی ان کمزوریوں کے سبب سردار جی پر ہم نے اپنی خوش اخلاقی کا سکہ جما دیا۔ اور ایڈیلیڈ تک اپنی سات نسلوں کا ایک دوسرے سے تعارف کرا دیا۔ ویسے تو سفر کا اصل مقصد ہی لوگوں سے میل ملاپ ہوتا ہے۔ ریل گاڑی کے دور میں تو مسفروں کی دوستیاں اتنی مضبوط ہوجاتی تھیں کہ اکثر اوقات رشتوں میں بدل جاتی تھیں۔ ویسے تو یہ سردار جی بھی ہمارے رشتہ دار نکلے۔ تقسیم سے پہلے وہ ایف۔ سی۔ کالج۔ لاہور میں پڑھتے تھے اور کالج کی باسکٹ بال ٹیم کے کپتان تھے۔ ان کا قد باسکٹ بال کھیلنے اور پتنگ لوٹنے کے لئے نہایت موزوں تھا۔ کالج کے رشتے بڑے عظیم رشتے ہوتے ہیں۔ اس لئے فارمانائیٹ ہونے کے ناطے سردار جی سے ہم کالج ہونے والا پختہ رشتہ ہو گیا اور اس رشتے کے سبب ان کے ریستوران میں مفت کھانا کھانے پر ہمارا پورا حق قائم ہوچکا تھا' جو ایڈیلیڈ میں قیام کے دوران ہم نے بلا ناغہ ادا کیا اور اس سینئر فارمانائیٹ نے بھی فراخدلی سے اپنا یہ رشتہ نبھایا۔

درویش دوم کو انناس سے بڑی رغبت تھی۔ اگرچہ وہ خود بھی کچھ انناس کی جسامت کا مالک تھا۔ انڈونیشیا سے روانگی پر اس نے چار انناس چپکے سے اپنے بھاری اور بھدے بیگ میں ٹھونس لئے تھے۔ جسکا ہمیں کچھ علم نہ تھا۔ ادھر آسٹریلیا والے اپنے ملک میں نہ تازہ سبزیاں اور پھل لانے دیتے ہیں اور نہ جانور اور جانوروں کی کھالیں۔ اس پابندی پر ان کی قرانطیہ والے بڑی سختی سے عمل کرتے ہیں۔ کیونکہ ان کا خیال ہے' اور وہ خیال درست بھی ہے کہ یہ چیزیں اپنے ساتھ جراثیم اور دوسری

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

مہلک بیماریاں لاتی ہیں اور اس طرح آسٹریلیا میں پیدا ہونے والی سبزیاں' پھل اور جانور ان غیر ملکی بیماریوں کا شکار ہوسکتے ہیں۔ اس قسم کی پابندیاں ویسے تو کئی اور ممالک میں بھی ہیں' مگر اتنی سختی سے ان پر عمل نہیں ہوتا۔ شاید اسکی وجہ یہ بھی ہے کہ آسٹریلیا دنیا کے دوسرے تمام ممالک سے الگ تھلگ ہے۔ اس لئے یہ پابندیاں بڑی موثر اور کارگر ثابت ہوئی ہیں۔ ظاہر ہے جراثیم' آسٹریلیا کے اردگرد پھیلے ہوئے وسیع سمندر تو عبور کرنے سے رہے۔ مگر ہمارے ایک معتبر دوست منور میر کا خیال بالکل مختلف ہے۔ ان کا دعویٰ یہ ہے کہ لاہور کے لارنس گارڈن یعنی باغ جناح میں شہد کی مکھیاں آسٹریلیا سے آتی ہیں۔ منور میر کا شہد سے جذباتی سا رشتہ ہے۔ کیونکہ شہد کا شوق انہیں اپنے والد سے ورثے میں ملا ہے اور اس نسبت سے وہ شہد کے بارے میں جو کچھ کہتے ہیں پورے اعتماد سے کہتے ہیں۔ وہ لارنس گارڈن سے ملنے والے شہد کے بڑے پرانے خریدار ہیں اور گرمیوں کی "شکر دوپہرے' خود اپنے سامنے شہد کے چھتوں سے شہد نکلواتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ شہد کا خریدار اگر ہوشیار نہ ہو تو شہد بیچنے والے خالص شہد کی جگہ لوگوں کو گڑ کا شیرا بیچ دیتے ہیں۔ مگر منور میر تو شہد چکھ کر ان پھولوں کی نسل اور رنگ تک بتا دیتے ہیں جن کے رس سے شہد بنایا گیا ہو۔ مثلاً" مئی کے مہینے میں اترنے والا شہد بہار کے خوش رنگ پھولوں کے رس سے اکٹھا کیا جاتا ہے۔ اسی طرح جولائی اگست کے مہینوں میں اترنے والا زرد رنگ کا کڑواہٹ والا شہد املتاس کے زرد سنہری پھولوں کا نچوڑ ہوتا ہے۔ شہد کی ظالم مکھیوں سے شہد چھیننا بھی ایک فن ہے۔ کیونکہ مکھیوں کی ہوائی فوج بڑی بے جگری سے شہد اور شہد کی ملکہ کی حفاظت کرتی ہے۔ منور کے مطابق شہد کے ہر چھتے میں ایک ملکہ کی حکمرانی ہوتی ہے جسے Queen Bee کوئین بی کہا جاتا ہے اور باقی تمام مکھیاں اور مکھے اسکے تابع ہوتے ہیں۔ یہ بادشاہت کا نظام بھی ایک ابدی قسم کا نظام ہے۔ مگر یہ فیصلہ کرنا قدرے مشکل ہے کہ آیا یہ نظام انسانوں نے درندوں سے' پرندوں اور کیڑے مکوڑوں سے سیکھا یا ان سب نے اسے انسانوں سے سیکھا۔ جہاں تک انسانوں کا تعلق ہے تو انہوں نے اپنی عقل و فہم سے کئی اور نظام بھی مرتب کئے۔ جن میں جمہوری نظام' کیمونسٹ نظام اور سوشلسٹ نظام شامل ہیں۔ ایک اور نظام حکومت' جو صرف درندوں میں اور تیسری دنیا میں پایا جاتا ہے آمرانہ نظام ہے۔ جہاں تک آمرانہ نظام کا تعلق ہے اس سے ہم سب واقف ہیں۔ بالخصوص پاکستانی تو صرف آمرانہ نظام ہی سے واقف ہیں کہ جب جمہوریت ہوتی ہے تو سفید لباس اور رنگ برنگ بیجرو والے آمر ہوتے ہیں اور جب ڈکٹیٹر شپ ہوتی ہے تو خاکی لباس اور خاکی جیپ والے آمر ہوتے ہیں۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ دونوں قسم کے آمروں کو "فورویل ڈرائیو' Four Wheel Drive کی ضرورت لاحق ہوتی ہے۔ وہ شاید اس لئے کہ انہیں اپنے ضمیر کی دلدل میں دھنس جانے کا خطرہ رہتا ہے۔ مگر ہم نے کسی آمر کو پرسکون اور قدرتی موت مرتے نہیں دیکھا۔ ہاں تو ذکر ملکہ شہد یعنی "کوئین بی' کا ہو رہا تھا۔ ملکہ شہد کی مکھیوں کی ہو یا مکھی نما انسانوں کی ہو بنیادی طور پر خود پسند بھی ہوتی ہے' مغرور بھی ہوتی ہے اور خود غرض بھی۔ ایک شہد کے قطرے قطرے کی مالک ہوتی ہے اور دوسری ملک کے ذرے ذرے کی۔ ایک کی مرضی کے بغیر کوئی مکھی بھن بھنا نہیں سکتی اور دوسری کی مرضی کے بغیر کوئی انسان دم نہیں مار سکتا۔ دونوں کا ڈنک زہریلا ہوتا ہے اور دونوں ہی بغیر سوچے سمجھے ڈنک مارتی ہیں۔ چھتے کا شہد اور ملک کی دولت صرف اور صرف ان کے حصے میں آتی ہے جو ملکاؤں کی قربت میں ہوتے ہیں۔ مگر قربان جائیں باغ جناح کے مالیوں کے کہ وہ ایسی خود غرض ملکہ سے شہد چھین لیتے ہیں۔ شہد نکالنے کا سب سے کامیاب طریقہ چھتے کو دھواں دینے کا ہے۔ پرانے کپڑے اور آم کے سوکھے ہرے پتوں کو جب آگ لگائی جاتی ہے تو شعلہ بننے کی بجائے اس میں سے کڑوا دھواں اٹھتا ہے۔ یہ دھواں جب شہد کے چھتے کو دیا جاتا ہے تو مکھیاں تتر بتر ہوجاتی ہیں اور انہیں ڈنک مارنے کا ہوش نہیں رہتا۔ اس طرح مالی بغیر کسی خطرے کے درخت سے شہد اتار لیتے ہیں۔ ویزا اور پاسپورٹ کی پابندیوں سے بالا تر پرواز کرنے والی شہد کی مکھیاں سردیاں آنے سے پہلے ہی واپس آسٹریلیا لوٹ

جاتی ہیں۔ کیونکہ جب یہاں سردیاں ہوتی ہیں تو آسٹریلیاں میں گرمی کا موسم شروع ہوجاتا ہے۔

ایڈیلیڈ اترنے سے کوئی ڈیڑھ گھنٹے پہلے ہی جہاز کے عملے نے فارموں کے پلندے مسافروں کو تھما دیئے اور اعلان کیا کہ جہاز چھوڑنے سے پہلے ہر مسافر کو وہ فارم پُر کرنے ہونگے۔ سب سے طویل فارم قرنطیہ والوں کے تھے۔ جن پُر جلی حروف میں ممنوع چیزوں کے بارے میں لکھا تھا اور خبردار کیا گیا تھا کہ غلط بیانی کرنے کی صورت میں بھاری جرمانے ہونگے۔ ایک تو ان فارموں نے اور دوسرے درویش اول کے تمسخر نے بے چارے درویش دوم کو سخت پریشان کیا۔ کیونکہ جب جانوروں اور ان کی کھالوں کے بارے میں سوالنامہ آیا تو درویش اول نے درویش دوم سے کہا۔ "بھالو میاں .... ان سوالوں کا جواب کیسے دو گے؟ .... اگر قرنطیہ والوں نے تمہارے جسم پر بھالو جیسے بال دیکھ لئے تو وہ یقیناً تمہیں چڑیا گھر میں بند کر دیں گے۔" معصوم درویش دوم نے جھٹ سے قمیص کے بٹن بند کر لئے۔ ہم سب فارم پُر کرنے میں اس قدر الجھ گئے کہ کھڑکی سے باہر نظارے کرنے کا موقع بھی نہ مل سکا۔ جونہی جہاز رکا تو جہاز کے عملے نے پورے جہاز میں جراثیم کش سپرے کر دیا۔ وہ سپرے اسقدر سخت تھا کہ مجھے یقین ہے کہ ہمارے جدی پشتی جراثیم بھی ہلاک ہو گئے ہونگے۔ پھر جہاز کے دروازے اس وقت تک نہ کھولے گئے جب تک ان کو پختہ یقین نہ ہو گیا کہ جراثیم بالکل ختم ہو چکے ہیں۔ مجھے تو یہ خوف تھا کہ درویش اول جیسا کمزور دل آدمی ہی نہ 'پھڑک' جائے۔ مگر شکر ہے کہ ہم بخیر و عافیت ایئرپورٹ میں داخل ہوگئے اور سکھ کا سانس لیا۔ ایئرپورٹ کے کوریڈور میں جگہ جگہ وارننگ کے بورڈ لگے ہوئے تھے اور ہر بورڈ کے نیچے ایک ڈبہ رکھا تھا۔ ان بورڈوں پر مسافروں کو خبردار کیا گیا تھا کہ اگر ان کے پاس ممنوعہ اشیاء ہوں تو وہ ان ڈبوں میں ڈال دیں۔ بورڈ پڑھتے ہی درویش دوم سہم کر ایک ڈبے کے پاس کھڑا ہو گیا۔ درویش اول نے اسے آگے دھکیلتے ہوئے کہا "بھالو میاں یہ ڈبہ تو تازہ پھل اور سبزیاں پھینکنے کے لئے رکھا ہوا ہے۔ تم فکر نہ کرو جب جانور پھینکنے والا ڈبہ آئے گا تو ہم خود ہی تمہیں اس میں پھینک دیں گے۔"

درویش دوم نے اس سفر میں پہلی مرتبہ برہمی کا اظہار کیا اور درویش اول کو وہ بات کہی جو اسے گولی کی طرح لگتی تھی۔ "گنجے! کبھی عقل کی بات بھی کیا کرو۔ تمہیں معلوم ہے تازہ پھل لانے پر کتنا جرمانہ لگے گا؟ ہم تینوں کا پورے ہفتے کا خرچہ اس جرمانے میں چلا جائے گا۔"

کمپیوٹر دماغ درویش دوم کا یہ حساب کتاب میری سمجھ میں تو بالکل نہ آیا اور میں نے اس سے وضاحت طلب کرتے ہوئے پوچھا۔ "یار ہم کونسا تازہ سبزیاں اور پھل لئے پھرتے ہیں جو وہ ہمیں جرمانہ کریں گے؟"

درویش اول جو گنجا کہلوانے کی وجہ سے درویش دوم سے چڑا ہوا تھا جل کر بولا "چلو چلو کچھوے .... بے غم ہو کر چلو .... ہم تمہاری صفائی دیدیں گے کہ تم بھالو نہیں انسان ہو۔ اس لئے جرمانے کا کوئی غم نہ کرو۔" مگر درویش دوم نے جلدی سے کہا۔ "بیوقوفو سمجھتے کیوں نہیں ہو .... میرے پاس چار اناس ہیں۔"

"کیا؟" ہم دونوں نے بہ یک زبان پوچھا۔ جس پر اس نے معصومیت سے جواب دیا۔ "یار مجھے کیا پتہ تھا آسٹریلیا والے فروٹ کے اس قدر خلاف ہیں۔ سستے مل رہے تھے .... میں نے لے لئے مگر بتاؤ اب کیا کریں؟"

بات تو درویش دوم کی بھی معقول تھی۔ ہم میں سے کسی کو بھی اس کا علم نہ تھا کہ تازہ پھل لے جانا آسٹریلیا میں عذاب جان بن جائے گا۔

درویش اول نے مسئلے کا حل نکالتے ہوئے مشورہ دیا کہ یار! مسئلہ کیا ہے؟ اناس اس ڈبے میں پھینک دو .... اللہ اللہ اور خیر سلا ....

درویش دوم نے اپنے مخصوص معصومانہ انداز میں پوچھا۔ "یار کیسے پھینک دوں؟"

درویش اول نے گرجتے ہوئے کہا۔ "احمق آدمی تجھے ڈبے میں پھل پھینکنا نہیں آتا؟ لاؤ مجھے دو میں پھینک دیتا ہوں۔" اتنی دیر میں دراز قامت سردار جی بھی اپنا

دستی سامان، جسکا وزن ایک من ہوگا، گھسیٹتے ہوئے ہمارے پاس پہنچ گئے اور آدھے آسمان کی اونچائی سے بولے "او کی گل آ شہزادیو، اینتھے رک گئے او.... کتے آسٹریلیا دا ویجا لینا تے نئیں بھل گئے؟"۔ "نہیں سردار جی ایہہ گل نئیں .... ساڈا ایہہ یار اپنے نال ناجہ پھل لیا بیٹھا اے ...." میں نے اپنا ماجرا سناتے ہوئے سردار جی کی طرف مشورہ طلب نگاہوں سے دیکھا۔

"کوئی گل نئیں کاکا" سردار جی نے درویش دوم کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "فل ایس ڈبے وچ سٹ دے۔" درویش دوم نے جھلا کر کہا۔ "سردار جی پھل ہوں تو پھینکوں۔"

"او جھلیو جد فل نئیں تے فیر فکر کا دا" درویش دوم نے مزید تلملا کر کہا۔ فکر جرمانے کا ہے سردار صاحب اس لئے کہ پھل ہیں ۔۔ اب سردار جی کو بھی تیش آگیا اور مجھے یقین ہے کہ اگر اسے میرے فارمانیٹ ہونے کا لحاظ نہ ہوتا تو وہ درویش دوم کی اس احمقانہ گفتگو پر اسے اپنے سامان کے ساتھ گھسیٹتا ہوا لے جاتا۔ مگر انہوں نے اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے درویش دوم سے پوچھا "اوئے کاکا! اک گل دس فل تیرے کول ہے کہ نئیں؟"

سردار جی کے غصے سے مرعوب ہو کر درویش دوم نے تقریباً گڑگڑاتے ہوئے جواب دیا "سردار جی پھل تو ہیں۔ مگر وہ میرے بیگ میں ہیں اور وہ بیگ کسٹم کے احاطہ میں آئے گا۔۔ اب آپ ہی بتائیں میں پھل اس ڈبے میں کیسے پھینک دوں؟"

درویش دوم کی یہ معصوم اور کھری بات شائد سردار جی کو موم کر گئی اور انہوں نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "پت جی! فیر فکر دی کوئی گل نئیں۔" اور اس کے بعد واقعی فکر کی کوئی بات نہ رہی۔ کیونکہ جونہی درویش دوم کا سامان کسٹمز کے احاطے میں پہنچا ۔ سردار جی نے اسے اناس نکالنے کو کہا۔ درویش دوم نے ڈرتے ڈرتے پھل نکالے اور سردار جی کے حوالے کر دیئے۔ انہوں نے بڑی ہی چابکدستی سے اپنی کرپان کے وار کئے اور چاروں اناس چھیل کر ایک ایک ہمارے حوالے کیا اور چوتھے کو خود کھانا شروع کر دیا۔ ہمیں کسٹمز کے جرمانے کا اتنا خوف تھا کہ پلک جھپکتے ہی اناس صاف کر گئے۔ سردار جی نے چٹخارے لیتے ہوئے کہا۔ "کاکاجی چار اناس تے شے ای کوئی نئیں ...... اساں پہلی وار حد اتھے آئے سی تے امباں دی سالم پیٹی کھڑے کھڑے صاف کر گئے سی۔۔۔۔" سردار جی کے اس انوکھے ٹوٹکے کے بعد ہم باعزت ائیرپورٹ کے باہر نکل گئے۔البتہ ایک ذمہ داری امیگریشن والوں نے ہمارے سر کر دی، اور وہ یہ کہ پاسپورٹ پر اندراج کا ٹھپہ لگانے والوں کو ایڈیلیڈ میں ہماری رہائش گاہ کا پتہ درکار تھا۔ اس وقت تو کوئی پتہ ہمارے پاس تھا نہیں، کیونکہ ہوٹل بک کرنے والی ایجنسیاں تو امیگریشن اور کسٹم وغیرہ گزرنے کے بعد ہی ہوتی ہیں۔ چنانچہ انہوں نے ہم تینوں کو ایک ایک لفافہ تھما دیا۔ جس پر امیگریشن کا پتہ بھی چھپا ہوا تھا اور ڈاک کے ٹکٹ بھی لگے ہوئے تھے۔ شہر پہنچنے کے بعد اپنے ہوٹل کا پتہ لکھ کر اس لفافے میں ڈال کر پوسٹ کرنے کی ذمہ داری ہماری تھی۔

سکھ مرد تو موروں کی طرح بڑے خوبرو ہوتے ہیں۔ لیکن سکھ عورتیں مورنیوں کی طرح اکثر صرف گزارہ ہی ہوتی ہیں۔ تاہم سردار جی کی بیٹی جو انہیں ائیرپورٹ پر لینے آئی تھی سراپا حسن اور شباب تھی۔ شاید اسی لئے دل پھینک درویش اول جھٹ سے سردار جی کے گرد منڈلانے لگا تاکہ ان کی بیٹی سے تعارف ہو سکے۔ اور تعارف یقیناً ہوا۔ سردار جی نے اپنی بیٹی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے درویش اول سے کہا۔۔ "میٹ یور سسٹر کلجیت۔" یعنی اپنی بہن کلجیت سے ملو۔ درویش اول کا مصافحے کے لئے بڑھا ہوا ہاتھ ایکدم یخ ہوگیا اور اس کی امیدوں پر اوس پڑ گئی۔ درویش دوم اور میں تو محفوظ فاصلے پر کھڑے رہے تاکہ کلجیت کا بھائی کہلانے سے بچ نکلیں اور خدا کا شکر ہے کہ ہم دونوں بال بال بچ گئے۔ شاید اس بات کا بھی درویش اول کو شدید غم تھا۔ مگر یہ تو درویش اول کے غموں کی صرف ابتداء تھی۔ جب سردار جی نے اپنی گاڑی میں شہر پہنچانے کے لئے لفٹ دی تو کھسیانے سے درویش اول کو سردار جی کے

پہلو میں اگلی سیٹ پر جگہ ملی اور ہم دونوں کو کلیجت کے پہلو میں پچھلی سیٹ پر۔ ادھر سردار جی درویش کا انٹرویو لیتے رہے ادھر ہم کلیجت کا انٹرویو لیتے رہے۔ اور یہ معلومات حاصل کر لیں کہ سردار جی کے ریستوران کا نام بینگل ہے اور کلیجت اس ریستوران کی منیجر ہے۔ وہ صبح دس بجے سے دوپہر چار بجے تک اور شام سات بجے سے رات بارہ بجے تک ریستوران میں ہوتی ہے۔ ہم نے تو چپکے سے ریستوران کا ٹیلی فون نمبر بھی لے لیا۔ درویش اول کلیجت سے ہماری کھسر پھسر پر بڑے پیچ و تاب کھا رہا تھا' مگر وہ سردار جی کی باتیں سننے پر مجبور تھا اور ہم اسکی مجبوری سے پورا پورا فائدہ اٹھا رہے تھے۔ کوئی آدھے گھنٹے کی ڈرائیو کے بعد ہم ایڈیلیڈ کی مین شاہراہ کنگ ولیم سٹریٹ پر تھے۔ مگر یقین جانئے کلیجت کی قربت میں وہ آدھا گھنٹہ پانچ منٹ میں گزر گیا۔ اور جب کلیجت گئی تو ایسا لگا جیسے کُل دل جیت گئی۔

جب تک ہم لوگ ایڈیلیڈ پہنچے تب تک ہماری چھٹیاں بھی آدھی ختم ہو چکی تھیں اور خرچہ بھی۔ چنانچہ درویشوں کی تین رکنی کابینہ نے ہنگامی اجلاس طلب کیا تاکہ باقی چھٹیوں کی منصوبہ بندی ہوسکے اور خرچے کا بجٹ بن سکے۔ نئے منصوبے کے تحت ایڈیلیڈ کے حصے صرف دو دن آئے۔ حالانکہ درویش دوم اور میں نے بڑی کوشش کی کہ یہاں قیام میں کچھ اضافہ ہوسکے' مگر درویش اول نے ڈٹ کر مخالفت کی۔ اور حیرت کی بات یہ ہے کہ اس سارے جھگڑے فساد کی جڑ کلیجت تھی۔

ویسے بھی ایڈیلیڈ کو ایک میل کا شہر کہا جاتا ہے۔ کیونکہ دس لاکھ کی آبادی کے اس شہر میں ہر کام کی شئے اسی ایک میل کے اندر اندر فراہم ہو جاتی ہے۔ جہاں تک تاریخی مقامات کا تعلق ہے وہ بھی مین شاہراہ کنگ ولیم سٹریٹ اور وکٹوریہ چوک کے گرد ونواح میں واقع ہیں۔ اور تاریخی مقامات بھی کیا ہیں۔ جس شہر نے خود ۱۸۳۷ء میں جنم لیا ہو وہاں آثار قدیمہ تو ہونے سے رہے۔ البتہ چند بارعب قسم کی ٹھوس عمارتیں ضرور نظر آتی ہیں۔ جن میں ٹاؤن ہال' جنرل پوسٹ آفس' سپریم کورٹ اور چرچ شامل ہیں۔ مگر ان عمارتوں کی سیر تو نہیں کی جاسکتی بس سڑک سے گزرتے ہوئے ایک طائرانہ نگاہ ڈالی جاسکتی ہے' سو یہی ہم نے کیا اور شہر سے جان چھڑا لی۔ ہاں ایک جگہ جو ہم بڑے شوق سے دیکھنے گئے وہ وہاں کی ٹورزم یونیورسٹی ہے۔ ٹورزم یونیورسٹی ہمارے لئے بڑی حیرانی کی بات تھی کہ آخر سیر سپاٹے میں پڑھانے لکھانے والی کیا بات ہے۔ سیر تو کورا ان پڑھ بندہ بھی کر سکتا ہے پھر اس میں علامہ ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ چنانچہ ہم یونیورسٹی کے شعبہ پبلک ریلیشنز میں جا پہنچے۔ درویش اول نے وہی پرانا پی۔ آئی۔ اے والا راگ چھیڑ دیا۔ حالانکہ اس قسم کے ڈرامے کی وہاں کوئی ضرورت نہ تھی۔ کیونکہ یونیورسٹی کی پبلک ریلیشنز ڈیپارٹمنٹ تھی ہی اس لئے کہ جو لوگ یونیورسٹی دیکھنا چاہیں یا اسکے بارے میں کچھ معلومات حاصل کرنا چاہیں وہ سب ان کو فراہم کرے۔

چنانچہ یونیورسٹی دکھانے کے لئے اور یونیورسٹی کے بارے میں کچھ بتانے کے لئے مس میرلن ہماری گائیڈ تھی۔ میرلن سے ملاقات کیوجہ سے ہمیں کئی فائدے ہوئے۔ یونیورسٹی کے بارے میں دلچسپ انکشافات تو ہوئے' اس کے علاوہ وہ لڑکی بذات خود بڑی دلچسپ ثابت ہوئی۔ وہ آسٹریلین جانوروں کا مرکب سا لگتی تھی۔ گردن زرافہ جیسی' چال کینگرو جیسی اور چلن چل چلاؤ۔ چنانچہ چند ہی لمحوں میں درویش اول اور دوم نے اس سے پکا وعدہ لے لیا کہ وہ شام کو انہیں کیسینوں یعنی جوئے خانے لے جائے گی۔

میرلن گو شکل سے تو پیدل ہی تھی مگر سیاحت پر پورا عبور رکھتی تھی' اور جب اپنے علم کی روانی میں آئی تو اس نے سیاحت کے بارے میں ایسے ایسے انکشافات کئے کہ ہم دنگ رہ گئے۔ سیاحت' جسے ہمارے ملک میں سیر سپاٹے سے زیادہ کوئی اہمیت نہیں دی جاتی اور جو لوگ سیر کے شوقین ہوں انہیں اکثر آوارہ گرد بھی کہا جاتا ہے درحقیقت ایک بہت بڑی صنعت ہے جو موجودہ صدی میں تو دنیا کی دوسری تمام صنعتوں کے مقابلے میں دوسرے نمبر پر آتی ہے' مگر اکیسویں صدی میں صف اول کی صنعت ہو جائے گی۔ ترقی یافتہ ممالک میں ۸۰ فی صد لوگ ہر سال سیاحت کے لئے

نکلتے ہیں اور ایک معقول رقم خرچ کرتے ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق سیاحت کی صنعت میں خرچ کی گئی سالانہ رقم سامان جنگ پر خرچ کی گئی رقم سے کہیں زیادہ ہے۔ خدا کرے دنیا میں ایسا وقت آئے کہ دنیا کی ہر صنعت سامان جنگ سازی کی صنعت سے آگے نکل جائے' کیونکہ اسی میں انسانیت کی بقا ہے۔

ایڈیلیڈ کی ٹورزم کی یونیورسٹی میں تین سال کا ڈپلومہ کورس اور پانچ سال کا ڈگری کورس دیا جاتا ہے جس میں سیاحت کے مختلف شعبوں کے بارے میں بڑے جدید خطوط پر تعلیم دی جاتی ہے۔ اور اس تعلیم کو حاصل کرنے کے لئے دور دراز کے ممالک سے طلبہ آتے ہیں۔ ہمارے پڑوسی ملک چین میں بھی سیاحت کی دو یونیورسٹیاں

اور نو سکول ہیں' جہاں سینکڑوں ہزاروں کی تعداد میں طلبہ کو سیاحت کی تعلیم دی جاتی ہے۔ بد قسمتی سے پاکستان میں اس صنعت کی کوئی وقعت نہیں۔ نہ عوام اسکو سمجھتے ہیں نہ بیروکریٹس اس کو سمجھتے ہیں اور نہ ہی سیاسی راہنما۔

شام کو ہماری منزلیں جدا جدا تھیں۔ درویش دوم قمار اور جوئے کا شیدائی تھا۔ درویش اول اگرچہ لڑکیوں کا شیدائی تھا' مگر ایڈیلیڈ میں آمد پر ہی چونکہ اسے کلیجت کا بھائی بننا پڑگیا تھا اس لئے اس نے پرانے فارمولے Unlucky in love lucky In Gambling یعنی محبت کا بد قسمت جوئے کا دھنی ہوتا ہے' پر عمل کرتے ہوئے میرلن کے ساتھ کیسینوں کا پروگرام بنایا۔ میرے لئے کیسینوں کوئی نئی بات نہیں' کیونکہ میں بہت پہلے مانٹی کارلو کے کیسینوں میں ایک مرتبہ قسمت آزمائی کر چکا تھا۔ اور سچی بات یہ ہے کہ ایڈیلیڈ میں اگر میں کہیں اور کسی پر قسمت آزمائی کرنا چاہتا تھا تو وہ کلیجت اور اسکا ریستوران تھا۔ چنانچہ شام ڈھلے جب درویش اول اور دوم میرلن کا انتظار کرنے لگے تو میں کلیجت کے جسم و جوانی کے بارے میں دھنک رنگ منصوبے بنانے لگا۔ آخر میرلن آئی۔ اس نے دونوں درویشوں کو خوش کرنے کے لئے ساڑھی پہن رکھی تھی۔ وہ تو دونوں درویشوں کو ہانکتی ہوئی کیسینوں لے گئی اور میں چل دیا بینگل ریستوران۔

بینگل ریستوران کی زیبائش دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ اسکی چھت سے رنگ برنگ کانچ کی چوڑیوں کے گچھے لٹکے ہوئے تھے اور ان گچھوں میں بجلی کے قمقمے اس انداز سے چھپائے گئے تھے کہ روشنی کے دھنک رنگ ریستوران میں ہر سو پھیلے ہوئے تھے۔ موسیقی میں ٹھیٹھ پنجابی دھنیں' کانسی تانبے کے برتن' چنگیر میں روٹیاں' دیسی کھدی کے کپڑے کے میز پوش اور نیپکن۔ غرضکہ پورا کا پورا ماحول دیسی اور دیسی ماحول کے سونے پہ سہاگہ کلیجت نے ائیر پورٹ والی جینز اور بلاؤز کی جگہ شلوار قمیض پہن رکھی تھی۔ گوٹہ کناری والا دوپٹہ اور بالوں کی سیاہ زلفوں کو سلیقے سے سمیٹنے والا سنہری پراندہ۔۔۔۔ اگر کوئی ہیر ہوگی تو کلیجت سے بہتر نہ ہوگی۔ کلیجت کی چال

میں پنج دریاؤں کی روانی تھی۔ اور مجھے یقین ہے کہ ریستوران میں بیٹھے ہوئے بہت سے نوجوان کلچیت کے لئے کان چھدوا کر رانجھا بننے کو تیار ہوں گے۔۔۔۔ کیونکہ ریستوران فل تھا۔ مجھے بھی اس نے کاؤنٹر کے قریب ایک سٹول پر بٹھا دیا اور زیرہ پانی کا گلاس تھماتے ہوئے کہا۔ "یہ اپیٹائزر ہے اس سے بھوک بڑھتی ہے۔۔۔۔" اسکے بعد وہ مجھے مسلسل زیرہ پانی پلاتی رہی۔۔۔۔ بھوک اور پیاس بڑھاتی رہی .... ریستوران بند ہوتا رہا کھلتا رہا .... میں آتا رہا جاتا رہا .... اور ایڈیلیڈ میں مختصر سے قیام کے دوران میں نے کلچیت کے لئے بینگ ریستوران کے اتنے پھیرے لگا لئے کہ مجھے یقین ہے کہ اس کے پھیرے لینے والا بھی اتنے پھیرے نہیں لگائے گا۔

بھالو نما درویش دوم اور کینگرو نما میرلن ایک دوسرے سے اتنے مانوس ہوئے کہ وہ سڈنی روانگی کے وقت ائیرپورٹ پر نظر آئے۔ درویش اول نے محبت میں تو مات کھائی مگر کیسینوں میں اس قدر کامیاب رہا کہ ہمارے باقی سفر کا بجٹ ورلڈ بنک اور آئی ایم ایف IMF سے قرضہ لئے بغیر ہی معقول ہوگیا۔ اس شہر میں اگر کوئی خسارے میں رہا تو وہ میں تھا۔ کیونکہ زیرہ پانی پی پی کر میں پاگل ہوگیا۔ اور مجھے جب ایڈیلیڈ کی یاد آتی ہے تو زیرہ پانی کی یاد آتی ہے۔

چند گھنٹوں کی پرواز کے بعد ہم سڈنی کے کنگز فورڈ سمتھ ائیرپورٹ پر اترنے کی تیاری کر رہے تھے۔ اترتے وقت شہر کے خوب نظارے تھے۔ سبزہ زار میں گھرے ہوئے سرخ چھتوں والے گھر۔۔۔ نہانے کے تالاب۔۔۔۔ ٹینس کے گراؤنڈ اور کھیلوں کے وسیع میدان۔۔۔۔ درختوں کے جھنڈ اور پارک۔۔۔۔ سرخ' سبز اور نیلا سمندر۔۔۔۔ سمندر کے اندر تک بنے ہوئے "رن وے" پر اترے تو کچھ لمحوں کے لئے تو ایسا محسوس ہوا کہ پائلٹ نے غلطی سے جہاز سمندر میں اتار دیا ہے۔ درویش اول نے سیٹ کے نیچے رکھی ہوئی لائف جیکٹ تک سنبھال لی۔ مگر دوسرے ہی لمحے ہوائی اڈے کی عمارت سامنے تھی اور ہماری سب فکریں کافور ہوگئیں۔ چونکہ یہ اندرون ملک پرواز تھی اس لئے ہمیں نہ کسٹم کا ڈر تھا نہ امیگریشن کا خوف۔ چنانچہ ہم دندناتے

ہوئے اس ہوائی پل صراط کو پار کر گئے۔۔۔۔ گو سڈنی آسٹریلیا کا سب سے قدیم اور آبادی کے لحاظ سے بڑا شہر ہے' مگر ایڈیلیڈ کی طرح ہوائی اڈہ سیدھا سادہ سا ہے۔ بنیادی سہولتیں اور ضرورتیں تو سب پوری کرتا ہے مگر ہوائی اڈوں والی شو شا نہیں دکھائی دیتی۔ مثلاً" پاکستانی ہوائی اڈوں پر جائیں تو مسافروں اور مسافروں کے وارثوں پر باقاعدہ رعب اور دبدبہ پڑتا ہے۔ ہماری شاہین نگاہ سیکیورٹی فورس کی ایکسرے کرتی آنکھوں سے بچ کر کوئی نہیں نکل سکتا۔ خصوصاً" معصوم اور شریف شہری تو ادھر نہ گاڑی میں جا سکتے ہیں اور نہ پیدل۔ کیونکہ ہماری حکومت نے ہمارے لئے دنیا ہی میں پل صراط پار کرنے کی ریہرسل کا بندوبست کر دیا ہے۔ اس لئے جب تک مسافر جہاز تک پہنچتا ہے اس کے سب پاپ دھل جاتے ہیں۔ سامان اور جسم ہلکا ہو جاتا ہے اور اس طرح وہ خوشی خوشی اپنی منزل کو روانہ ہو جاتا ہے۔

گو ہسپانوی اور پرتگالی مہم جُو آسٹریلیا کے مغربی اور جنوبی ساحلوں پر برطانوی کیپٹن کک سے بہت پہلے پہنچے تھے مگر وہ ساحل چونکہ بالکل غیر آباد تھے اس لئے وہ لوٹ گئے۔ خوش قسمتی سے کیپٹن کک آسٹریلیا کے مشرقی ساحل پر پہنچا جہاں سبزہ بھی تھا اور پانی بھی۔ چنانچہ وہ موجودہ سڈنی کے ساحل پر لنگر انداز ہوا۔ بندرگاہ کا نام جیکسن اور آبادی کا نام سڈنی رکھا اور یوں ایک نئے ملک کی بنیاد ڈال دی۔ اسی دور میں امریکہ' برطانیہ کے چنگل سے آزاد ہوا اور برطانیہ کے خطرناک مجرموں کو دیس نکالا دینے کے لئے نئے علاقے کی تلاش تھی جو آسٹریلیا کی دریافت نے پوری کردی۔ لہٰذا آسٹریلیا دریافت ہونے کے صرف اٹھارہ سال بعد یعنی ۱۷۸۸ء میں مجرموں کا پہلا جہاز فرسٹ فلیٹ سڈنی میں جیکسن کی بندرگاہ پر لنگر انداز ہوا اور یوں سرکار برطانیہ کا اس نئے خطے سے رشتہ جڑ گیا۔ سڈنی کے شہر کو بندرگاہ نے دو حصوں شمال اور جنوب میں تقسیم کردیا ہے اور دونوں حصوں کا ملاپ ہاربر برج کے ذریعے سے ہوتا ہے جو ۱۹۳۲ء میں تعمیر کیا گیا۔ یہ اتنا بڑا پل ہے کہ اسے سمندر کی مرطوب ہوا کے سبب زنگ سے بچانے کے لئے رنگ ساز متواتر رنگ کرتے رہتے ہیں اور جونہی پل کے

ایک سرے سے دوسرے سرے تک رنگنا ختم کرتے ہیں تو انہیں پھر سے وہی عمل دہرانا پڑتا ہے اور یوں زنگ اور رنگ کی جنگ جاری رہتی ہے۔

کنگز کراس' سڈنی میں گناہوں کی بستی ہے جہاں گناہ بے لذت بھی ہوتے ہیں اور بالذت بھی۔ ڈارلنگ ہرسٹ گناہوں کی اس بستی کی بدنام گلی ہے اور پلازہ ہوٹل گناہوں کی بستی کی اس بدنام ترین گلی میں واقع ہے۔ جس ہوٹل میں درویش اول نے ائیرپورٹ کی ایجنسی سے ہمارے لئے کمرے بک کروائے اس ہوٹل میں داخلہ مین روڈ کی بجائے ایک تنگ و تاریک گلی سے ہوتا ہے' جس سے اس ہوٹل میں قیام پذیر ہونے والے لوگوں کی نیتوں اور حرکتوں کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ ہم نے دو راتوں کے لئے دو کمرے بک کرائے تو کمرے اور ناشتے کا بل پیشگی ادا کرنا پڑا' کیونکہ ہوٹل والے جانتے ہیں کہ گناہوں کے سوداگر راتوں کو اکثر چپکے سے لوٹ لئے جاتے ہیں۔ چنانچہ پونجی لٹنے سے پہلے وہ اپنا کرایہ وصول کر لیتے ہیں۔ کمرے میں پہنچتے ہی درویش اول نے ٹیلیفون گھمایا۔ کسی سے اردو میں بات کی اور دو گھنٹے میں ملاقات کا وعدہ کر کے ٹیلیفون بند کر دیا۔ ہم دونوں کی سوالیہ نگاہوں کا جواب دیتے ہوئے درویش اول نے کہا۔ "بھئی کراچی میں کسی دوست نے میمن بھائی کا ٹیلیفون نمبر دیا تھا اور کہا تھا کہ فون کر لینا وہ تمہیں سڈنی کی سیر کرا دے گا۔ میمن بھائی دو گھنٹے میں پہنچنے والے ہیں۔ اس لئے تم جلدی سے تیار ہو جاؤ تو سیر کو نکلتے ہیں۔" چنانچہ ہم جلدی سے تیار ہو گئے۔

آسٹریلیا میں اٹھارہ سال کی رہائش نے میمن بھائی کے حلیے پر ذرہ برابر اثر نہ کیا تھا۔ پائنچوں سے بہتی ہوئی پان کی پیک' سر پر مخمل کی دوپلی ٹوپی' پاجامہ نما سفید پتلون' بلغ نما پاؤں میں سنہری چپل اور بھکے مارتی ہوئی عطر کی خوشبو۔ میمن بھائی ہم سب سے یوں بغلگیر ہوئے گویا صدیوں کے بچھڑے ساتھی مل رہے ہوں۔ حالانکہ ان سے ملاقات محض چند لمحے پیشتر ہوئی تھی۔ میمن بھائی کے خلوص کی طرح ان کے عطر کی مہک بھی ہم سے یوں بغلگیر ہوئی کہ پیچھا چھڑانا دشوار ہو گیا۔ سڈنی کی سیر میمن بھائی کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھی' کیونکہ ایک تو ہر شہر میں چند ایک مقامات ہی ایسے ہوتے ہیں جو ہر سیاح کو قسمیہ طور پر دیکھنے پڑتے ہیں۔ دوسرے میمن بھائی کے اٹھارہ سالہ قیام میں سینکڑوں ہمارے جیسے پاکستانی سڈنی آئے ہونگے جن کے پاس کراچی کے دوست کا دیا ہوا سفارشی سیاحتی رقعہ ہوگا' جس کے سبب انہیں سڈنی کی سیر کرانی پڑی ہوگی چنانچہ انہوں نے لمبی تمہید باندھے بغیر ہی ہمیں شام تک کا پروگرام بتایا اور وقت ضائع کئے بغیر ہی اپنے ساتھ لے کر چل دیئے۔

میمن بھائی کی گاڑی ایک چلتا پھرتا سٹور تھی جس میں باسمتی چاولوں کے تھیلے' گرم مسالے' سرخ مرچیں' چائے کے ڈبے' اچار کی بوتلیں اور پلاسٹک کے تھیلوں میں بند حلال کی ہوئی مرغیاں ٹھنسی ہوئی تھیں۔ درویش دوم اور مجھے اس بند پیک اپ کے پچھلے حصے میں بند ہونا پڑا۔ سیٹوں کے نیچے اور اوپر ہر سو اور ہر جا سامان ہی سامان تھا۔ مجبوراً" ہمیں سامان کے اوپر ہی بیٹھنا پڑا۔ درویش دوم کو تو باسمتی چاولوں کی سیٹ ملی اور مجھے حلال مرغیوں پر بیٹھنا پڑا۔ سٹور کی حفاظت کے طور پر میمن بھائی نے پک اپ کے پچھلے حصے کے شیشے کھڑکیاں بند کروا دیں تھیں۔ چنانچہ جب انہوں نے بھلا دروازہ بند کیا تو ہم پر قبر سا اندھیرا چھا گیا۔ البتہ ہمارے اور پک اپ کی اگلی سیٹ کے درمیان لوہے کی ایک مضبوط جالی تھی۔ جس کے سبب ہم تک روشنی بھی پہنچ رہی تھی اور ہوا بھی۔ ادھر درویش اول جونہی میمن بھائی کے ساتھ اگلی سیٹ پر بیٹھنے لگا تو مرغیوں نے کہرام مچا دیا۔ درویش اول اچھل کر گاڑی سے باہر کود گیا۔ ذبح شدہ مرغیاں کیونکر زندہ ہو گئیں؟ ہم تینوں حیران تھے۔ مگر میمن بھائی نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "گھبرانے کی کوئی بات نہیں' یہ زندہ مرغیاں تو یہاں قریب ہی ایک ریستوران میں پہنچانی ہیں۔ اسکے بعد پوری سیٹ خالی ہو جائے گی۔" اور کسی کو ہو نہ ہو مجھے تو میمن بھائی کی بات سے فوراً تسلی بھی ہو گئی اور خوشی بھی' کیونکہ درویش اول مرغیوں کے جھرمٹ میں تھا۔

سڈنی کی اس انوکھی سیر کے دوران انکشاف ہوا کہ میمن بھائی درحقیقت شہر

کے مختلف ریستورانوں کو سامان سپلائی کرتے ہیں اور یوں پورے شہر میں گھوم کر ڈیلوری دینا ان کا روز کا معمول تھا۔ چنانچہ پہلا سٹاپ آیا تو میمن بھائی نے گاڑی میں بیٹھے بیٹھے درویش اول کو اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "بھائی صاحب اگر تکلیف نہ ہو تو سڑک کے اس پار وہ سامنے ریستوران میں دس مرغیاں پہنچا دیں۔ ویسے میں خود چلا جاتا مگر یہاں سالا پارکنگ کا برا لفڑا ہے۔" اس سفر میں بار برداری کا کام صرف مجھ سے لیا جاتا تھا۔ نخریلا درویش اول تو بریف کیس اٹھانے پر بھی لاکھ نخرے کرتا تھا۔ اب اسے مرغیاں اٹھانی پڑ رہی تھیں اور مرغیاں بھی زندہ' جن کے شور و ہنگامے نے ہر راہگیر کو درویش اول کی طرف متوجہ کر دیا' جو درویش اول کے لئے شرم سے ڈوب مرنے کا مقام تھا۔ شاید اسی بوکھلاہٹ میں وہ بلا جھجک بہتے ٹریفک کے باوجود سڑک پار کر گیا۔ حالانکہ سڑک پار کرنا درویش اول کی زندگی کا اہم ترین مسئلہ تھا۔

میمن بھائی کو وقت پر ڈیلوری پہنچانے کی جلدی تھی۔ چنانچہ وہ کلی دبائے جا رہا تھا۔ ہم دونوں پک اپ کے پیچھے کبھی آپس میں اور کبھی سامان سے گتھم گتھا ہو جاتے تھے۔ شرم سے شرابور اگلی سیٹ پر درویش اول آنکھیں جھکائے بیٹھا تھا۔ سڈنی کی شاہراہیں' گلی کوچے اور بازار پلک جھپکتے میں گزر رہے تھے۔ ایک جھلکی سڈنی کی موجودہ پہچان اوپیرا ہاؤس کی دکھائی دی۔ اوپیرا ہاؤس کی عمارت مجھے تو کچھ ایسے لگی جیسے تین دیو قامت کچھوے ایک دوسرے کے اوپر سوار ہو کر سمندر کی لہریں گن رہے ہوں۔ پھر ہاربر برج سے گزر ہوا اور بڑی دیر تک گزر ہوتا رہا' کیونکہ یہ پل کم بخت ختم ہونے ہی میں نہ آتا تھا۔ ۱۹۷۳ء سے پہلے جب اوپیرا ہاؤس کا افتتاح نہیں ہوا تھا تو ہاربر برج ہی کو سڈنی کی پہچان تصور کیا جاتا تھا۔ خدا خدا کر کے ہاربر برج بھی ختم ہوا' میمن بھائی کی سپلائی بھی ختم ہوئی اور ہماری سیر بھی۔ مگر ہماری دشواری ابھی باقی تھی' کیونکہ میمن بھائی نے اپنا موبائیل جنرل سٹور اپنے گودام پر لا کھڑا کیا۔ اسی گودام کی بالائی منزل پر میمن بھائی کا گھر تھا' جہاں وہ ہماری خاطر تواضع کرنے کے لئے ہمیں لے گئے۔ درویش دوم اور میں تو ویگن کی سواری کی تکلیف سے جھکے ہوئے تھے اور درویش اول سڈنی کے ریستورانوں میں مرغیاں بانٹنے کی ندامت میں جھکا ہوا تھا۔ ویسے لگ یوں رہا تھا کہ ہم لوگ تکلف میں جھکے ہوئے ہیں۔ تکلف تو گیا بھاڑ میں ہمیں میمن بھائی سے جان چھڑانے کے لالے پڑے ہوئے تھے۔ مگر خاموش صرف اس لئے تھے کہ میمن بھائی کا گودام خدا خبر سڈنی کے کونسے ویران کونے میں واقع تھا جہاں سے ہوٹل تک پہنچنے کے لئے انکی راہنمائی لازمی تھی۔ لہٰذا ہم چپ سادھے سولی پر چڑھ گئے۔ فلیٹ میں پہنچتے ہی خود تو وہ کھانا تیار کرنے میں مصروف ہو گئے اور اپنے چار سالہ بیٹے رب نواز اللہ والا کو ہماری خاطر تواضع پر مامور کر دیا۔ اس ہونہار بچے نے نرسری کی ساری نظمیں' اکائی دہائی کے پہاڑے اور دنیا بھر کے لطیفے اور کہانیاں ہمیں سنائیں' اور ہم نے پوری توجہ سے سنیں۔ گو دل ہمارا یہ چاہ رہا تھا کہ یا خود بہرے ہو جائیں اور یا اسکا گلا دبا دیں۔ ابھی ہم اسکی پہلی یلغار ہی سے نہ سنبھلے تھے کہ اس ستم ظریف نے درویش اول پر خاطر تواضع کا ایک اور وار کیا۔ اب تک میمن بھائی بھی پیلے رنگ کے شربت کے گلاس ہمارے ہاتھوں میں تھما چکے تھے۔ ان کے عطر کی طرح انکے شربت کی مٹھاس بھی بن پیے ہی محسوس ہو رہی تھی۔ ہاں تو بات رب نواز اللہ والا کی ہو رہی تھی۔ وہ معصوم' درویش اول کے چرنوں میں بیٹھ کر ان کے جوتے اتارنے لگا۔ درویش اول نے پاؤں ادھر ادھر سرکانے کی کوشش کی تو میمن بھائی نے یہ کہہ کر منع کر دیا کہ جوتے اور جرابیں اتارنا بچے کا مشغلہ ہے اور اگر اسے ایسا کرنے سے منع کیا جائے تو وہ بہت روتا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ بچے کا مشغلہ صرف جوتے اور جرابیں ہی اتارنے تک محدود تھا۔

شام ڈھل چکی تھی جب میمن بھائی سے ہم نے خلاصی پائی۔ وہ تو دوسرے دن سڈنی کے گرد و نواح کے علاقے میں سیر کی دعوت دے رہے تھے مگر ہم نے گڑگڑا کر التجا کی کہ کل ہمیں پی آئی اے کے مینجر سے ملنا ہے اس لئے ان کی سیر کی دعوت کسی صورت قبول نہیں کر سکتے۔ جس پر مایوس میمن بھائی نے وعدہ لے لیا کہ کبھی آئندہ سڈنی آئیں تو ضرور فون کریں گے۔

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

کنگز کراس کی گناہوں کی بستی پورے جوبن پر تھی۔ امریکی بحریہ کے ملاح غول در غول ڈارلنگ ہرسٹ سٹریٹ میں ہر سو پھیلے ہوئے تھے۔ جب کوئی امریکن جہاز سڈنی کی بندر گاہ میں لنگر انداز ہوتا ہے تو گناہوں کا کاروبار چمک اٹھتا ہے۔ ہم کمرے کی کمین گاہ سے گناہ بے لذت سے لذت اٹھا رہے تھے۔ نیچے رنگ برنگ جلتے بجھتے نیو ان سائینوں کے سائے میں نیم برہنہ جسم جنس کا اشتہار بنے کھڑے تھے۔ کہیں پیپ شو' کہیں جنسی فلمیں اور کہیں سٹیج پر جنسی کھیل' تماشائیوں کو جنسی اشتعال دلا رہے تھے تاکہ وہ کرائے کے جسم خرید سکیں۔ پھر کہیں ٹھکرے آرٹسٹ بیئر کی بوتل کے بدلے پورٹریٹ بنا رہے تھے۔ کہیں جادوگر منہ سے آگ نکال کر پیٹ کی آگ بجھانے کے لئے کرتب کر رہے تھے۔ کہیں جسموں کے اس بازار میں بازیگر جسموں کے کرتب دکھا رہے تھے۔ کہیں جپسی عورتیں راہگیروں کو گھیرا ڈالے قسمت کے حال بتانے میں مصروف تھیں۔ کہیں کوئی موسیقار فٹ پاتھ پر کپڑا بچھائے اس بے ہنگم مخلوق کو موسیقی کی دھنیں سنا کر سکے وصول کرنے کی تگ و دو میں تھا۔ کہیں کوئی آسٹریلین بوڑھا اپنے کندھوں پر عمر اور گناہوں کا بوجھ اٹھائے شراب میں دھت لڑکھڑاتا پھر رہا تھا۔ پھر اک سمت سے شور اٹھا۔ کچھ بدمست ملاحوں کی آپس میں مڈھ بھیڑ ہو گئی۔ شراب کی خالی بوتلیں ہتھیار بن گئیں۔ کچھ چہرے سرخ ہو گئے کچھ جسم نیلے ہو گئے۔ اتنے میں سیٹیاں بجاتی پولیس پہنچ گئی۔ حالات پھر جوں کے توں ہو گئے۔ پو پھٹتے ہی گناہوں کی اس بستی کی آنکھیں چندھیانے لگیں۔ ملاح اپنے اپنے جہازوں کو لوٹ گئے۔ جسموں کی جفاکش جنس کے پسینے پونچھ کر اپنے اپنے فلیٹوں میں لوٹ گئی۔ نسیم سحری' شراب کی بو اور دھوئیں کی مہک اڑا لے گئی۔ ڈارلنگ ہرسٹ کا کاروبار بند ہو گیا' لیکن ایل ایل امین کا فوارہ ابھی تک چل رہا تھا۔ بھلا ڈارلنگ ہرسٹ کے موڑ پر ابلتے اس فوارے اور مصر کے شہر سکندریہ سے سو میل دور ایل ایل امین کے قصبے میں کیا رشتہ ہو سکتا ہے؟ دوسری جنگ عظیم میں ایک طرف جنرل رومیل کے جرمن ٹینک تھے اور دوسری طرف اتحادیوں کے جری جوان۔ ایل ایل امین کے صحرا میں گھمسان کا رن پڑا۔ جنگوں میں صرف درندگی کی فتح ہوتی ہے۔ انسانیت تو ہر صورت میں شکست ہی کھاتی ہے۔ اس جنگ کی یاد میں ایل ایل امین کے مقام پر جرمنوں' اطالویوں اور اتحادیوں کی یادگاریں ہیں' جہاں کتبوں پر ہزاروں معصوموں کے نام ہیں جو درندگی کا شکار ہوئے۔ اپنے برطانوی آقاؤں کی خاطر سینکڑوں پاک و ہند کے نوجوانوں نے بھی وہاں جانیں قربان کیں۔ ممکن ہے ایل ایل امین کی جنگ میں کچھ آسٹریلوی بھی شامل ہوئے ہوں' جن کی یاد میں ایل ایل امین کا فوارہ کنگز کراس میں بنایا گیا ہو۔

مجھے کینگرو دیکھنے کا شوق تھا اور درویش دوم کو شاپنگ کا۔ میمن بھائی کے ہاتھوں سیر کی رسوائی ہونے پر درویش اول اس قدر نادم تھا کہ اس نے طبیعت کی ناسازی کا بہانہ بنا کر ہوٹل ہی میں آرام کرنے کا اعلان کیا۔ چنانچہ میں نے تو ہوٹل کے کاؤنٹر سے چالمرز ٹریول کمپنی کا کورنگ گائی نیشنل پارک کا ٹور بک کیا اور ہنیری سٹریٹ پر کمپنی کے دفتر پہنچ گیا۔ جہاں سے بس کو روانہ ہونا تھا۔ ویسے اگر باعزت ہوٹلوں میں قیام گاہ ہو تو بس والے ٹورسٹوں کو ان کے ہوٹل سے بھی اٹھاتے ہیں۔ ظاہر ہے پلازہ ہوٹل میں اٹھانے کے لئے بھلا کس کو آنا تھا۔ ہماری آرام دہ ایئر کنڈیشنڈ بس میں ہمارے علاوہ اور اکتیس سیاح تھے جن میں پندرہ سولہ تو جاپانی تھے۔ یہ جاپانی بھی عجیب مخلوق ہیں۔ دنیا کے ہر کونے میں پائے جاتے ہیں اور بھیڑوں کے ریوڑ کی طرح اپنے گڈریے کے اشاروں پر چلتے رہتے ہیں۔ باقی سیاحوں میں کچھ امریکن' کچھ جرمن' کچھ اطالوی اور کچھ برطانوی تھے۔ مگر مزے کی بات یہ تھی کہ میں واحد دیسی سیاح تھا۔ جو دوسرے سیاحوں کے لئے بڑی دلچسپی کی بات بنا ہوا تھا اور وہ تو درحقیقت ایک ٹکٹ میں دو دو مزے لے رہے تھے۔ ویسے ہم پاکستانیوں کے لئے قدرتی نظارے کوئی کشش نہیں رکھتے' کیونکہ ہم میں سے کثیر تعداد ایسے لوگوں کی ہے جنہیں اپنے ملک کی سربفلک پہاڑی چوٹیاں' سرسبز وادیاں' گنگناتے ہوئے چشمے' شیشہ نما جھیلیں' للکارتے ہوئے برفانی دریا' گلیشیرز اور حد نظر تک پھیلے ہوئے صحرا اور سمندر کبھی نہیں بھاتے۔ ہم جب جاتے ہیں اور جہاں جاتے صرف شاپنگ کے لئے ہی

جاتے ہیں اور وہی کام میرا دوست درویش دوم کر رہا تھا۔ کیونکہ قدرتی نظاروں اور جانوروں سے کہیں زیادہ اسے پٹ جورج سٹریٹ کے سٹوروں میں دلچسپی تھی۔ ادھر ہماری بس جب روانہ ہوئی تو ہماری گائیڈ نے معلوماتی اور واقعاتی علم کا ایک سمندر ہمارے سامنے پھیلا دیا۔ ہاربر برج سے میمن بھائی کی تنگ و تاریک پک اَپ میں بھی گزرے تھے' مگر اب میں اور تب میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ میں نے جاپانی گروپ کے لیڈر ناکامورا سے دوستی کر لی' کیونکہ اسکے گروپ میں زیادہ تر زنانہ ریز گاری تھی۔ باتوں باتوں میں ہماری جیمز بانڈ خصلت کے سبب یہ بھی معلوم ہو گیا کہ یہ آسٹریلیا میں ان کا آخری دن تھا اور وہ ہماری طرح دوسرے دن جاپان ایئرلائینز کی پرواز سے ٹوکیو جا رہے تھے ۔ چنانچہ اپنے ٹوکیو کے پروگرام کو رنگین بنانے کے لئے میں ناکامورا سان سے منتھی ہو گیا۔ سان جاپانی زبان میں مسٹر یا جناب کی جگہ استعمال ہوتا ہے۔

سڈنی کے شمال میں ۲۴ کلو میٹر کے فاصلے کو طے کرنے کے بعد کُورنگ گائی کا نیشنل پارک آتا ہے۔ مگر وہاں پہنچتے پہنچتے ساحل اور سمندر کے بڑے ہی پُرکشش نظارے ہیں۔ بحیرہ اوقیانوس کے نیلگوں سینے کو چیرتے ہوئے بحری جہاز اُن جان منزلوں کو رواں دواں تھے۔ ادھر پارک کی گلابی پیلی پتھریلی زمین میں چھوٹی چھوٹی خار دار جھاڑیاں اُگی ہیں اور یا دیو قامت سفیدے۔ یہ سفیدے کے درخت پاکستان میں بھی آسٹریلیا ہی سے لائے گئے ہیں۔ اس وسیع پارک میں پیدل چلنے کے لئے کئی گزر گاہیں بنائی گئی ہیں' جن میں کئی ایک پر تو ہمارے گروپ نے بھی سفر کیا۔ آخر کار میں اس جگہ پہنچا جو میرے من پسند جانور کینگروؤں کے لئے مخصوص تھی۔ وہاں ہمارے گائیڈ نے گروپ کو پارک کے رینجرز کے حوالے کر دیا' جنہوں نے ہمیں کینگرو اور دوسرے جانوروں کے بارے میں تفصیل بتائی۔ ان کے مطابق کینگرو کی پچاس مختلف نسلیں ہیں۔ ان میں سات فٹ اونچا کینگرو بھی ہوتا ہے اور تقریباً" چوہے جتنا کینگرو بھی ہوتا ہے۔ بڑا کینگرو چالیس میل فی گھنٹہ کی رفتار سے دوڑ سکتا ہے اور پچیس فٹ لمبی

چھلانگ لگا سکتا ہے۔ وہ خطرے کے وقت اپنے بچے کو پیٹ کے نیچے بنی ہوئی تھیلی میں ڈال کر بڑی تیزی سے بھاگ جاتا ہے۔ مگر اس پارک کے کینگرو بڑے ہی ملنسار تھے۔ خاص طور پر بچوں سے تو ان کو خاصی الفت دکھائی دیتی تھی۔ گو کینگرو عام حالات میں تصویر کھنچوانے کو برا نہیں سمجھتا اور اچھے خاصے پوز بناتا رہتا ہے' مگر ہمارے جاپانی گروپ کی فلیش گنوں اور کیمروں کے تابڑ توڑ حملوں کی تاب نہ لا سکا اور وہاں سے کھسک گیا۔ چنانچہ ہم لوگ بھی وہاں سے کھسکے اور بس تک پہنچنے کے لئے ڈبل مارچ شروع کی۔ اس سیر میں ایک تو میں نے کینگرو سے ملاقات کی اور دوسرے ناکامورا سان' سے جنہوں نے ٹوکیو کے بارے میں بڑے ہی کار آمد اور قیمتی مشورے دیئے۔

سڈنی میں رات گزارنا ہمارے لئے کوئی مسئلہ نہ تھا۔ چنانچہ ہم تینوں اپنے کمرے کی کمین گاہ میں مورچے سنبھال کر بیٹھ گئے اور رات بھر گناہ بے لذت سے لطف اٹھاتے رہے۔ صبح سویرے سامان سمیٹا اور ائیرپورٹ کی راہ اختیار کی' جہاں سے جہاز میں بیٹھ کر جاپان کے شہر ٹوکیو جانا تھا۔

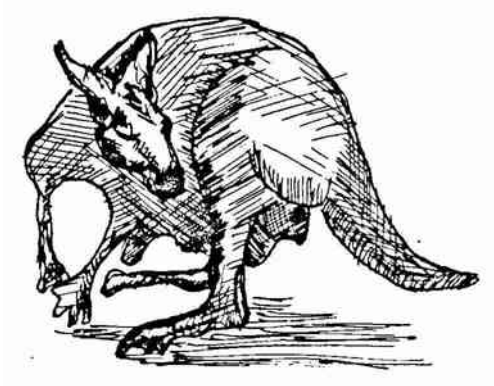

www.iqbalkalmati.blogspot.com

جاپان

www.iqbalkalmati.blogspot.com

درویش اول نے جونہی جاپان ایئر لائنز کے جہاز میں قدم رکھا اسکی لالچی نگاہیں چمک اٹھیں۔ کیونکہ جدھر بھی نگاہ اٹھتی تھی لڑکیاں ہی لڑکیاں دکھائی دیتی تھیں۔ نیلی اور سرخ وردی والی فضائی میزبانوں کا تو ایک لشکر کا لشکر تھا جو سامان سے لدے پھندے بد حواس مسافروں کو مسکراہٹیں بھی بانٹ رہی تھیں' ان کی مخصوص نشستوں تک پہنچنے میں راہنمائی بھی کر رہی تھیں اور تکیئے بھی بانٹ رہی تھیں۔ عیار درویش اول نے اک تتلی نما ایئر ہوسٹیس کو اپنا بورڈنگ کارڈ دکھایا اور وہ ہم تینوں کی راہنمائی کرتی ہوئی ہمیں ہماری سیٹوں تک لے گئی۔ درویش دوم نے جھٹ سے اپنی جدی پشتی کھڑکی والی سیٹ پر قبضہ جمالیا۔ درویش اول نے سامان سمیت مجھے درمیان والی سیٹ پر دھکیلتے ہوئے خود آئیل سیٹ سنبھال لی اور بیٹھتے ہی ایئر ہوسٹیس سے تکیئے لانے کا مطالبہ کیا جو وہ تتلی پلک جھپکتے میں لے آئی۔ کھڑکی کے قریب بیٹھے درویش دوم نے اس طرح جھپٹ کر تکیہ گھسیٹا کہ اگر میں راستے میں نہ ہوتا تو یقیناً" وہ ایئر ہوسٹیس اسکے پہلو میں آگرتی۔ شکر ہے درویش دوم کی یہ آرزو پوری نہ ہوئی اور وہ کھسیانہ سا ہو کر کھڑکی کے باہر سڈنی کے ہوائی اڈے کے نظارے لینے لگا۔ نظاروں کے معاملے میں درمیان والی سیٹ جس پر مجھے ہمیشہ بیٹھنا پڑتا تھا' بہت گھٹیا ہوتی ہے' کیونکہ یہاں سے نہ باہر کے نظارے ملتے ہیں اور نہ اندر کے۔ سفر لمبا ہو تو دل

پشوری کرنے کے لئے آئیل یعنی راہگزر والی سیٹ بہت موزوں ہوتی ہے۔ بالخصوص اگر راہگزر سے گزرنے والیاں جاندار بھی ہوں اور جوان بھی تو ہر ہر قدم پر زاویے بھی بدلتے ہیں اور نظارے بھی۔ مگر جاپان ایئر لائنز کے جہاز میں اس طرح کے خون گرما دینے والے نظاروں کی امید بہت ہی کم تھی۔ کیونکہ جسمانی لحاظ سے تو جاپانی لڑکیاں صرف اندازے سے ہی لڑکیاں تصور کی جاسکتی ہیں۔ ان کے استری شدہ جسموں میں جوانی کی نمو کے آثار تو ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ بھرپور جسموں کی آرزو میں جاپانی مرد ملک ملک گھومتے ہیں۔ اور جاپانی جتنے یورپین اور امریکن ٹیکنالوجی کے مداح ہیں اس سے کہیں زیادہ وہاں کے بھرپور جسموں کے مداح ہیں۔ ویسے جاپانیوں کی نئی نسل جدید سرجری کا بھرپور فائدہ اٹھا رہی ہے۔ اور اب وہاں کئی چہرے دکھائی دیتے ہیں جن پر ناک بھی چپٹی نہیں ہوتی اور آنکھیں بھی ترچھی نہیں ہوتیں۔اسی طرح پلاسٹک سرجری کے کرشمے سے جسموں میں قوسیں بھی نمایاں ہیں۔ لیکن اس جہاز میں ہمیں کوئی ایسی بی بی دکھائی نہ دی جو سرجری کی سہولت سے مستفید ہوئی ہو۔

جونہی جہاز اپنی مخصوص بلندی پر پہنچا تو میخاروں کے حفاظتی بند بھی کھل گئے اور میخانوں کے در بھی۔ میں نے بھی اپنی حفاظتی بیلٹ کھولی اور دونوں درویشوں سے چھٹکارا پایا اور مس کاتو کی تلاش میں نکل پڑا۔ سڈنی کے نیشنل پارک میں ناکامورا سان کے جس جاپانی گروپ سے میری ملاقات ہوئی تھی اس میں مس کاتو بھی تھی اور وہ اس گروپ کی واحد لڑکی تھی جس کو کچھ انگریزی آتی تھی۔ چنانچہ ٹوکیو کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے بہانے میں اسکی جستجو میں نکلا۔ مگر جمبو جیٹ میں کسی کو تلاش کرنا اتنا آسان نسخہ نہیں ہوتا۔ پھر ہمیں تو سب جاپانی ایک سے لگتے ہیں۔ ویسے میرا خیال ہے کہ جاپانیوں کو بھی سب جاپانی ایک سے لگتے ہونگے۔ شاید اسی لئے اکثر جاپانی سیاحوں نے ان مخصوص کمپنیوں کے بیج لگا رکھے تھے جن کمپنیوں کے ذریعے بک ہو کر وہ سیر کو نکلے تھے۔ میں ٹھہرا صحرا کا بندہ۔ ہمارے چولستان کے گڈریے تو سینکڑوں

ہزاروں بھیڑوں میں سے اپنی بھیڑیں تلاش کر لیتے ہیں بھلا مس کاتو کو تلاش کرنا میرے لئے کیا مسئلہ تھا۔ چنانچہ میں سیٹ سیٹ گھومنے لگا۔ مشروبات سے بھری ٹرالیاں کھینچتی ہوئی ایئر ہوسٹس میرے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ تھیں۔ پہلی رکاوٹ پر میں نے "ایکسکیوز می" کہا۔ ٹرالی سے دامن بچایا، لڑکھڑایا، ایئر ہوسٹس سے ٹکرایا تو بڑا مزہ آیا۔ اور پھر رکاوٹیں پار کرنے کا ایسا چسکا لگا کہ میں مس کاتو کو بھول بھال کر اسی کام پہ لگ گیا۔ آخر کار جہاز کے ایک حصے میں ناکامورا سان کی کمپنی "ٹکی ورلڈ" کے بیج دکھائی دیئے اور میں مس کاتو تک جا پہنچا۔ وہ زنانہ مجمع ایک قطار میں بیٹھا تھا۔ ان کی بہت سی چھوٹی چھوٹی ترچھی ترچھی آنکھوں نے مجھے دیکھا۔ ان سب آنکھوں کو جمع کر کے یقیناً ایک غزالی آنکھ تو بنتی ہوگی۔ پہلے تو ان شرمیلی سی بیبیوں نے آپس میں کچھ کھسر پھسر کی، پھر اپنی نازک سی پیلی ہتھیلیوں میں چہرے چھپا کر ہنسنا شروع کیا۔ جاپانی لڑکیاں اکثر ہنستے وقت اپنے چہرے ہتھیلیوں کے پیچھے چھپا لیتی ہیں۔ ویسے بھی جبڑے کھول کر ہنسنا تو گنواروں کا کام ہے۔ جاپانی لڑکیوں میں نسوانیت کوٹ کوٹ کر بھری ہوتی ہے۔ ان کی ادا اور آواز سے ہی ہم جیسے نووارد، لڑکے اور لڑکی میں امتیاز کر سکتے ہیں۔ کیونکہ ان کے جسم کی پیلی ملائم جلد تو اکثر یکساں ہوتی ہے۔ پھر ہم تو عادی ہی ہیں درویش دوم جیسے بھالو نما جسموں کے، جو بالوں کے جنگل میں گھرے ہوتے ہیں۔ ادھر جاپانی مردوں کے جسموں پر کم بخت بال بھی تو نہیں ہوتے ۔ ہاں تو بات مس کاتو اور اس کی سہیلیوں کی ہو رہی تھی جو ابھی تک اپنی پیلی پیلی ہتھیلیوں میں چہرے چھپائے ہنس رہی تھیں۔ ویسے جاپانی والدین کو اپنی بیٹیوں کے ہاتھ پیلے کرنے کی چنداں فکر نہ ہوتی ہوگی، کیونکہ وہ قدرتی پیلے ہوتے ہیں۔ ان کی ہنسی کا دورہ ختم ہوا تو میری گفتگو شروع ہوئی اور ہم ٹھہرے گفتار کے غازی ۔ چنانچہ گفتار کی ایسی یلغار کی کہ مس کاتو کے پہلو میں سیٹ بھی پائی اور گپیں سنانے کے لئے ایک زنانہ مجمع بھی فراہم ہو گیا ۔ کرشن جی کو گوپیوں اور رادھا کے سوا کیا چاہیے ،ہمسفر من پسند ہوں تو گھنٹوں کا سفر منٹوں میں گزر جاتا ہے۔ پھر مس کاتو کے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

پاس تو جاپان کے متعلق معلومات کا ایک خزانہ تھا جو وہ مفت لٹانے کو تیار تھی اور یقیناً میں لوٹنے کو آمادہ تھا۔ اور وہ گرانقدر معلومات میں کیوں نہ حاصل کرتا کہ کسی اجنبی شہر اور وہ بھی ٹوکیو جیسے شہر میں بغیر تیاری کے داخل ہونا خودکشی کرنے سے بھی بدتر ہے۔ کیونکہ ایسے بھیڑ بھاڑ والے صنعتی شہروں میں آپ کی داد فریاد سننے والا کوئی نہیں ہوتا' اور اگر کوئی سننے والا مل بھی جائے تو وہ آپ کی بات سمجھ نہیں پاتا۔ چنانچہ نریتا ائیرپورٹ سے ٹوکیو میں ہوٹل تک آسانی سے رسائی پانے کے لئے میں نے سڈنی سے ٹوکیو تک کا ہوائی سفر ان جاپانی لڑکیوں کے نام کر دیا۔

نریتا انٹرنیشنل ایرپورٹ ٹوکیو شہر کے مشرق میں ۶۶ کلو میٹر کے فاصلے پر تعمیر کیا گیا ہے۔ یا یوں کہیے کہ سینکڑوں کسانوں کے لہلہاتے کھیتوں کو دفن کر کے ان پر سیمنٹ اور کنکریٹ کی طویل قبر بنائی گئی ہے' جس پر جمبو جیٹ چنگھاڑتے ہوئے اترتے ہیں اور جاپانی کسانوں کی احتجاج بھری آوازوں کو اپنے کرخت شور میں دبا دیتے ہیں۔ نریتا دنیا کا واحد ہوائی اڈہ ہے جہاں تک رسائی کے لئے میلوں دور ہی سے حفاظتی رکاوٹوں سے گزرنا پڑتا ہے اور سامان کی باقاعدہ جانچ پڑتال کروانی پڑتی ہے۔ اس بے جا حفاظتی اقدام کا اصل سبب وہ ناانصافی ہے جو حکومت نے ہوائی اڈہ بناتے وقت کسانوں کے ساتھ کی اور اب انہیں متواتر یہ خطرہ لاحق رہتا ہے کہ کہیں وہ احتجاج اڈے کو کھنڈے میں نہ بدل دے۔ مگر اس وقت ہمارے مسائل حفاظتی رکاوٹیں نہ تھیں بلکہ ٹوکیو میں آمد کی الجھنیں تھیں جو مس کاتو کے علاوہ جاپان ائیر لائنز نے معلوماتی فلم دکھا کر ختم کر دیں۔ اس فلم میں امیگریشن اور کسٹم کے قوانین' کرنسی بدلنے کے کاؤنٹر' شہر تک رسائی کے لئے بسوں' ٹرینوں اور ٹیکسیوں کے کرائے اور انہیں حاصل کرنے کے سٹاپ کے علاوہ ہوٹلوں وغیرہ کے بارے میں پوری پوری تفصیلات تھیں۔ یہ معلومات دوسرے مسافروں کے لئے تو بڑی کارآمد ثابت ہوئیں' مگر یہ فلم دیکھنے کے بعد میں بالکل بیکار ہو گیا۔ کیونکہ میں اس امید پر جاپانی لڑکیوں سے معلومات حاصل کرتا رہا تھا

کہ دونوں درویشوں کو مرعوب کروں گا۔ البتہ ایک ایسا نسخہ میں نے مس کاتو سے حاصل کر لیا تھا جو اس معلوماتی فلم میں نہیں تھا' اور وہ نسخہ تھا ہوٹل میں قیام اور ہوٹل تک مفت رسائی کا۔ مس کاتو نے دو ہوٹلوں کی سفارش کی تھی۔ ان میں ایک ہوٹل ٹاکاناوا تھا اور دوسرا ٹاکاناوا پرنس۔ پہلا روایتی اور سستا تھا اور دوسرا جدید اور مہنگا۔ دونوں ہوٹل نکی ورلڈ کے دفتر کے قریب تھے جہاں اس کمپنی کی بس نے اپنے گروپ کو اتارنا تھا۔ چنانچہ ان لڑکیوں نے مجھ سے وعدہ کر لیا تھا کہ وہ ٹاکامورا سان سے سفارش کریں گی کہ وہ تینوں درویشوں کو بھی بس میں بیٹھنے کی اجازت دیدیں۔ یہ اس سفر میں میری پہلی کامیابی تھی۔ رہا ہوٹل کا انتخاب تو وہ اتنا دشوار نہ تھا۔ کیونکہ سستے ہوٹلوں میں ٹھہرنا ہماری مجبوری تھی اور اس مجبوری کو ہم نے روایت پسندی کا رنگ دیکر اپنی غربت کی لاج رکھ لی۔ ویسے ہم خود بھی تو پرنس تھے' اس لئے ٹاکاناوا پرنس میں ٹھہرنے کی بھلا ہمیں کیا ضرورت تھی۔

امیگریشن کی درجنوں لمبی لمبی قطاریں تھیں۔ جاپانیوں اور غیر ملکیوں کے لئے علیحدہ علیحدہ کاؤنٹر تھے۔ یہ امتیاز دنیا کی ہر ائیرپورٹ پر ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ کراچی ائیرپورٹ پر بھی غیر ملکیوں اور ملکیوں کے لئے علیحدہ علیحدہ کاؤنٹروں کا انتظام کیا گیا ہے۔ بیچارے پاکستانیوں کے لئے اپنے شہر کراچی میں بھی ایک ہی قطار اور وہ بھی لمبی سی قطار میں کھڑے ہو کر امیگریشن سے گزرنا پڑتا ہے۔ گو امیگریشن کی موٹی توند والے افسروں کی نفری تو وافر ہوتی ہے مگر وہ کاؤنٹر پر کام کرنے کے بجائے پان چباتے لائن میں کھڑے مسافروں کے اردگرد شکروں کی طرح منڈلاتے رہتے ہیں تاکہ کوئی نہتا مسافر ان کے ہتھے چڑھ جائے اور وہ اس سے مالی یا جسمانی ٹیکس وصول کر سکیں۔ سری لنکا' تھائی لینڈ' فلپائینز اور بنگلہ دیش کی خادمائیں اور نرسیں ٹرانزٹ سے واپسی پر یا روانگی میں جاتے ہوئے ٹرانزٹ میں ان باوردی شکروں کے ہتھے چڑھ جائیں تو ان کی خیر نہیں ہوتی۔ وہ بیچاری کچھ نہ کچھ دے کر ہی جان چھڑاتی ہیں۔ مگر نریتا کے ہوائی اڈے پر اسطرح کا کوئی خطرہ نہیں ہوتا۔ اگر کاغذات صحیح ہوں تو امیگریشن سے

گزرنا کوئی مسئلہ نہیں۔ مگر اس کے باوجود درویش اول کی جاپانی امیگریشن والے سے مڈھ بھیڑ ہو گئی۔ ان امتیازی کاؤنٹروں اور قطاروں کے باوجود درویش اول اک جاپانی بی بی سے کھسر پھسر کرتا جاپانیوں کی قطار میں جا کھڑا ہوا۔ حلیئے کے لحاظ سے تو ممکن ہے وہ کسی جاپانی پہلوان کا پٹھا دکھائی دیتا ہو' مگر جاپانی سرخ پاسپورٹوں میں پاکستانی سبز پاسپورٹ بھلا کیسے چھپتا؟ چنانچہ درویش اول کی کوشش اور اسکی جاپانی ساتھی کی سفارش کے باوجود امیگریشن افسر نے اسکے پاسپورٹ پر ٹھپہ لگانے سے صاف انکار کر دیا۔ جاپانی تہذیب یافتہ قوم ہے وہ انکار بھی کرتے ہیں تو بڑی عاجزی کے ساتھ اور ہم ٹھہرے عادی دھینگا مشتی کے۔ چنانچہ اپنی نئی نویلی گرل فرینڈ پر اپنی مردانگی کا رعب ڈالنے اور امیگریشن والے کی مہذب گفتگو کو اسکی کمزوری سمجھتے ہوئے درویش اول نے اپنا پاسپورٹ دوبارہ اسکے سامنے پھینکتے ہوئے بہ زبان انگریزی اور با آواز بلند ٹھپہ لگانے پر اصرار کیا۔ ارد گرد کھڑے جاپانی اپنی چھوٹی چھوٹی ترچھی ترچھی آنکھوں سے حیران پریشان یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ جہاز میں ملاقات پانے والی وہ جاپانی لڑکی بپھرے ہوئے درویش اول سے اسقدر پریشاں ہوئی کہ وہ فوراً" وہاں سے غائب ہو گئی۔ امیگریشن والے نے خدا خبر خطرے کا کیسا بٹن دبایا کہ پلک جھپکتے ہی کمانڈوز کی ایک پلٹن نمودار ہو گئی۔ ان میں سے کچھ نے سٹین گنیں تھام رکھی تھیں اور کچھ کے ساتھ خونخوار کتے تھے۔ خطرہ بھانپتے ہی درویش اول "سوری" کہتے کہتے بڑی تیزی سے غائب ہوا اور غیر ملکیوں کی سب سے دور اور سب سے لمبی قطار کے آخر میں جا کر پناہ لی۔ ادھر درویش دوم کسٹمز کے احاطے میں اٹک کر رہ گیا تھا۔ کیونکہ کسٹم والے اسکا بکس کھلوانا چاہتے تھے۔ اس بکس کی چابی درویش اول کے بریف کیس میں تھی اور وہ بریف کیس سمیت قطار کے آخر میں تھا۔

جاپان میں بھی ہماری طرح ٹریفک بائیں ہاتھ کو چلتی ہے۔ اسی لئے تو جاپان میں چلائی جانے والی کاریں ری کنڈیشن کر کے پاکستان بھیج دی جاتی ہیں۔ نکی ورلڈ کی بس شاہراہ پر ٹوکیو کی جانب رواں دواں تھی۔ شاہراہ کے دونوں جانب جاپانیوں کے کھیت اور باغات تھے جو پلاسٹک کے بنے ہوئے ہی دکھائی دیتے ہیں۔ انکی اسقدر صفائی اور نفاست سے کٹائی ہوتی ہے کہ ایک شاخ بھی فالتو دکھائی نہیں دیتی۔ مجھے یقین ہے کہ پھلوں کے درخت اور سبزیوں کے پودے اور بیلیں باقاعدہ کمپیوٹر کے پروگرام کے مطابق پھلتے پھولتے ہونگے اور کوئی عجب نہیں کہ اپنے مخصوص پروگرام کے مطابق پودا خود ہی مالک کے پاس آکر اپنا پھل یا سبزی اسے دے جاتا ہوگا۔

شاہراہ پر ہر جا سائین بورڈ اور اشتہار صرف جاپانی زبان ہی میں لکھے ہوئے تھے۔ جاپان میں یہ بہت بڑا مسئلہ ہے۔ کیونکہ سڑکوں پر' چوکوں پر اور بلڈنگوں پر صرف نمبر ہی انگریزی میں لکھے ہوتے ہیں باقی ہر عبارت جاپانی میں لکھی ہوتی ہے۔ اسی لئے وہاں انگریزی والے نقشے یا سٹی پلین بالکل بیکار ہو جاتے ہیں کیونکہ جو چیز آپ نقشے میں پڑھ رہے ہیں وہ سڑک پر نہیں پڑھ سکتے۔ لہٰذا کوئی جگہ تلاش کریں تو کیسے؟ البتہ ایک عبارت بڑے واضح اور جلی الفاظ میں انگریزی میں لکھی دکھائی دی اور وہ شاہراہوں پر اس جگہ دکھائی دی' جہاں پر ٹول ٹیکس ادا کرنا پڑتا ہے۔ وہ شاید اس لئے بھی کہ اکثر شاہراہیں پرائیویٹ کمپنیوں کی ملکیت ہیں اور وہ ٹول ٹیکسوں کی آمدنی سے ہی سب خرچ پورے کرتی ہیں۔ اس لئے وہ غیر ملکی ڈرائیوروں کی سہولت کے لئے پوری عبارت انگریزی میں لکھتے ہیں تاکہ وہ ٹول ٹیکس ادا کرتے وقت کسی الجھن کا شکار نہ ہوں۔ مگر ہم تینوں ٹول ٹیکس کی فکر سے آزاد مزے میں سفر کر رہے تھے۔ درویش اول ایئرپورٹ کی رسوائی تقریباً" بھول چکا تھا اور مس کاتو سے آنے بہانے گفتگو کو پھیلاتا جا رہا تھا جو خطرے سے خالی نہ تھا' کیونکہ درویش اول کے لئے عشق میں پھنسنا اور کیلے کے چھلکے سے پھسلنا تقریباً" یکساں تھا۔ ادھر مس کاتو تھی کہ وہ آنکھوں سے مجھے تسلی دے رہی تھی اور باتوں سے درویش اول کو۔ ہوٹل پہنچنے تک آنکھوں اور باتوں کا سلسلہ جاری رہا اور آخر جاتے جاتے مس کاتو درویش اول کے ہاتھ میں ایک چٹ تھما گئی اور میں خالی ہاتھ آنکھیں پھاڑے اسے دیکھتا رہ گیا۔ اگرچہ واقف وہ میری تھی مگر خفیہ پیغام درویش اول کی مٹھی میں تھا۔

ہوٹل ٹاکانادا روایتی کم اور کفایتی زیادہ لگا۔ مگر کفایت کرائے میں ہرگز نہ تھی صرف کمروں کے سائیز میں کی گئی تھی۔ مثلاً" جس کمرے میں درویش دوم اور مجھے ٹھہرنا تھا اس کمرے میں کوئی نارمل آدمی انگڑائی تو کیا پورا منہ کھول کر جمائی بھی نہیں لے سکتا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ اس شاعر نے اسی کمرے میں بیٹھ کر اپنے محبوب کے بارے میں لکھا ہوگا کہ سہ انگڑائی بھی وہ لینے نہ پائے اٹھا کے ہاتھ ..... بھلا ہاتھ اٹھاتے بھی کیسے؟ کمرے کی چھت تو تالو سے لگی ہوئی تھی۔ ماچس کی ڈبیا نما اس کمرے میں البتہ آرام و آسائش کا سب سامان موجود تھا۔ بستر تو ہر کمرے میں ہوتے ہی ہیں۔ مگر اس کمرے میں کپڑے لٹکانے کے لئے دو الماریاں' ٹی۔ وی جو چھت سے نیچے جھانک رہا تھا' فرج جس میں صرف بونے سائیز کی بوتلیں ہی فٹ ہوسکتی تھیں' استری اور کپڑے پھیلانے کے لئے بورڈ' شیو کے لئے شیشہ' شاور اور غسل خانہ بقلم خود' تولئے لٹکانے کے لئے سٹینڈ اور گاہکوں کے آرام کے لئے جاپان کے مخصوص' لباس کیمونوں کے جوڑے اور سلیپر رکھے ہوئے تھے۔ اس کمرے کو دیکھتے ہی مجھے تو جاپانی قوم کی کامیابی کا اصل راز سمجھ میں آگیا۔ کیونکہ جو قوم اتنی مختصر سی جگہ کو اتنی خوش اسلوبی سے استعمال کرسکتی ہے وہ یقیناً دنیا میں کچھ بھی کر سکتی ہے۔ مگر ہم درویشوں کے لئے صرف ایک ہی مسئلہ تھا اور وہ تھا اپنے بھاری بھرکم اور بھدے بیگوں کو ان کمروں میں سونا۔ وہ مسئلہ ہم نے بڑی خوش اسلوبی سے حل کیا۔ مگر بتائیں گے صرف اس لئے نہیں کہ وہ راز حکیموں کے نسخوں کی طرح ہمارے سینوں میں دفن ہے اور ہمارے ساتھ ہی دفن ہو جائے گا۔

درویش اول کیمونو پہن کر کیسا لگ رہا تھا اسکی تو ہمیں خبر نہیں البتہ درویش دوم کیمونوں پہن کر بہت ہی چغد لگ رہا تھا۔ کیمونو تو میں نے بھی پہنا اور مجھے یقین ہے کہ وہ جاپانی لباس مجھ پر سج بھی رہا ہوگا۔ مگر احتیاطاً" میں نے اپنے آپکو آئینے میں نہ دیکھا۔ جاپان کا یہ روایتی لباس کیمونو دیکھنے میں تو بہت جاذب نظر ہوتا ہے مگر پہننے میں نہایت کمینہ۔ اگر جاپانی خواتین میں تحمل نہ ہوتا تو مجھے یقین ہے کہ وہ اس لباس کو پہننے کا تردد ہرگز نہ کرتیں' کیونکہ اس ہوائی دور میں بھی اس لباس کو پہننے اور بننے سنورنے میں گھنٹوں لگتے ہیں البتہ اتر آسانی سے جاتا ہے۔ پھر مصیبت یہ ہے کہ کنواری لڑکیوں کے لئے اور کیمونو ہوتا ہے اور شادی شدہ عورتوں کے لئے اور۔ شادی بیاہ کے لئے مختلف کیمونو ہوتا ہے اور پارٹیوں کے لئے مختلف۔ غرضکہ یہ لباس ایک اچھی خاصی سائنس بن گیا ہے۔ پھر اسکو پہن کر اٹھنے بیٹھنے اور چلنے پھرنے کے مختلف آداب بھی ہیں اور انداز بھی۔ بروکیڈ' سلک اور سیٹن کے خوش رنگ ڈیزائینوں والا یہ لباس ظاہراً" تو ایک گاؤن نما ہوتا ہے جسے اوڑھ کر کمر کے ارد گرد اسی کپڑے کی ایک چوڑی پٹی باندھ لی جاتی ہے' مگر یہ سب اتنا آسان نسخہ نہیں ہوتا۔ کیونکہ پاؤں کے سلیپر سے سر کی سجاوٹ تک اور ہاتھ کے پنکھے سے اوڑھنے کی چھتری تک ہر چیز میں ایک رشتہ ہوتا ہے اور جس خوش اسلوبی سے یہ رشتہ جوڑا جاتا ہے وہی کیمونو کا روایتی حسن ہے۔ البتہ جو کیمونو ہوٹل والے اپنے گاہکوں کے لئے کمروں میں رکھتے ہیں وہ صوتی کپڑے کے بالکل سادہ سے گاؤن ہوتے ہیں' جنہیں اوڑھ کر کپڑے کی بیلٹ سے باندھ لیا جاتا ہے۔ مگر وہ پہن کر آپ کمرے اور غسل خانے تک ہی محدود ہو جاتے ہیں۔ شاپنگ یا سیر وغیرہ کو نہیں نکل سکتے۔ لڑکیوں کے چال چلن پر تو ہم ویسے ہی گہری نظر رکھتے ہیں۔ مگر کیمونو پہننے والی لڑکیوں پر ہم نے بطور خاص نظر رکھی اور اس نظر میں انکشاف ہوا کہ چلتے وقت وہ لڑکیاں زمین پر پورا پاؤں نہیں جماتیں بلکہ پنجوں کے بل چلتی ہیں اور اپنے چھوٹے چھوٹے قدم اٹھا کر یوں چلتی ہیں گویا تیرتی چلی جا رہی ہوں۔ میرا اندازہ یہ ہے کہ ۱۹۲۳ء میں جب ٹوکیو میں زلزلہ آیا اور جسکے نتیجے میں آگ لگی اور ایک لاکھ کے لگ بھگ لوگ لقمۂ اجل ہوئے تو غالباً" اسکا اصل سبب کیمونو ہی تھے۔ کیونکہ کیمونو میں ملبوس باوقار جاپانی لڑکیاں زلزلے اور آگ کے باوجود جان بچانے کی خاطر بھاگی ہرگز نہ ہونگی۔ صرف روایتی انداز میں دھیرے دھیرے چل پھر رہی ہونگی کہ آگ نے آن دبوچا ہوگا اور وہ اپنے رنگ برنگ کیمونوں میں سجی سیاہ راکھ ہو گئی ہونگی ۔ ویسے کیمونو پہن کر بھاگتی لڑکیاں لگیں بھی تو بہت عجیب سی۔

میں کیمونو والی لڑکیوں کے بارے میں سوچ کے خوش رنگ تانے بانے بن رہا تھا کہ ہمارے کمرے کے کیپسول نما غسل خانے سے شور اٹھا۔ یقیناً درویش دوم کسی مشکل میں ہوگا اور وہ مشکل میں تھا۔ مشکل بھی ایسی کہ کچھ نہ پوچھئے۔ وہ بیچارہ جھاگ کا گولہ سا بنا غسل خانے میں گرے صابن کو اٹھانے کی تگ و دو کر رہا تھا۔ آنکھیں کھولتا تو آنکھوں میں صابن کا جھاگ جاتا۔ آنکھیں بند کئے صابن تلاش کرتا تو کبھی پلاسٹک کی دیوار سے ٹکراتا جس کے ٹوٹنے کا سو فیصد خطرہ تھا' اور کبھی آئینے سے' اور آئینہ تو پلاسٹک سے زیادہ نازک بھی ہوتا ہے اور مہنگا بھی۔ ویسے اس غسل خانے میں جھکنے کی گنجائش تو تھی ہی نہیں ہر کام کھڑے کھڑے ہی کرنے کے لئے یہ بنایا گیا تھا۔ چنانچہ غسل خانے کے حدود اربعہ میں محدود رہتے ہوئے میں نے جھاگ میں چھپے برہنہ درویش دوم کو غسل خانے سے باہر گھسیٹا اور اس بند آنکھوں والے فقیر کے کھلے ہاتھوں میں صابن کی ٹکیہ کی بھیک ڈال دی۔

جاپان مشرق کا واحد ملک ہے جس پر مشرق والے بھی فخر کرتے ہیں اور مغرب والے بھی۔ اس زبردست مقبولیت کا اصل سبب انکی بے بہا دولت ہے۔ وہ دولت جو اس قوم کو نہ تو ورثے میں ملی ہے نہ انہوں نے کہیں سے لوٹی ہے اور نہ ہی زمین سے ابلتے ہوئے سیاہ سونے یعنی تیل سے حاصل کی ہے۔ بلکہ صرف اپنی محنت' ایمانداری اور ہنرمندی سے حاصل کی ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے شکست خوردہ اور ایٹم بموں سے تباہ شدہ اس ملک کی اسوقت معاشی قوت اس قدر مضبوط ہے کہ دنیا کے بڑے سے بڑے ملک دل ہی دل میں جاپانیوں سے خوفزدہ ہیں اور شاید اسی لئے جاپانیوں سے دوستی کے بندھن باندھنا چاہتے ہیں۔ حالانکہ موجودہ دور میں جاپان اور پاکستان نے ایک سے حالات میں ساتھ ساتھ قدم رکھے۔ وہ آج ایک صنعتی معجزہ ہیں اور ہم ابھی تک ترقی پذیر۔ جبکہ دونوں کے پاس قوت بازو کی وافر مقدار تھی۔ انسانی قوت کے علاوہ دونوں ممالک کے پاس اور کچھ نہ تھا۔ کیونکہ جاپان کو دوسری جنگ عظیم نے تباہ کر دیا تھا اور پاکستان برطانیہ کی عیاری اور ہندو کے تعصب کی سیاہ گھٹاؤں سے نکل کر دنیا کے نقشے پر نمودار ہوا تھا۔ ادھر جاپان کے دو شہروں یعنی ہیرو شیما اور ناگاساکی پر قیامت کی رسرسل ایٹم بموں کی صورت میں کی جاچکی تھی اور ٹوکیو دوسری جنگ عظیم میں آتشیں بموں سے برسنے والی آگ کے سبب ابھی تک راکھ کا ڈھیر تھا۔ اسی طرح پاکستان بھی کشت و خون کی ہولی کے بعد اپنے قدموں پر کھڑا ہونے کی کوشش میں لگا ہوا تھا۔ چنانچہ دونوں ممالک کے راہنماؤں اور سیاستدانوں کے لئے اپنے اپنے ملک کی تعمیر نو اور عوام کی آبادکاری ایک بہت بڑا چیلنج تھا۔ پوری دنیا کی نگاہیں ان دونوں ملکوں پر جمی ہوئی تھیں۔ ہمارے راہنماؤں اور سیاستدانوں کی کارکردگی کے نتائج ویسے تو اتنے واضح ہیں کہ کچھ کہنے سننے کی گنجائش نہیں۔ مگر دونوں ممالک میں بنیادی چیزیں یکساں ہونے کے باوجود اسقدر مختلف ہیں کہ کچھ کہے بغیر گزارہ نہیں۔ ہمارے ملک میں اس مقدس امتحان میں کون فیل ہوا؟ راہنما یا عوام ....؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جو ہمارے راہنماؤں اور عوام دونوں کے لئے لمحہ فکریہ ہونا چاہیے۔ مگر بدقسمتی سے راہنماؤں اور سیاستدانوں کو تو اس ملک کی دولت بٹورنے سے فرصت ہی نہیں اور عوام کو زندہ رہنے کے لئے روٹی کمانے سے فرصت نہیں .... پھر ہماری بات سنے گا تو کون؟

جاپان بیسویں صدی کا صنعتی معجزہ ہے جو کسی پیغمبر کے سبب نہیں ہوا بلکہ عام انسانوں نے کر دکھایا ہے۔ ایسے معجزے صرف اسی صورت میں رونما ہوسکتے ہیں جب انفرادی خود غرضی ختم کر کے اجتماعی ترقی کو ترجیح دی جائے۔ مگر جن قوموں کے راہنماؤں نے صرف ذاتی مفاد کو بروئے کار لاتے ہوئے قوم کے خزانے لوٹے وہ قوم تو غریب ہی رہی مگر خود غرضی سے لوٹی ہوئی وہ دولت ان کے کام بھی نہ آسکی۔ بیسویں صدی کا فرعون شاہ ایران اور فلپائینز کا آمر جنرل مارکوس اس دلیل کا زندہ ثبوت ہیں۔ رہی جاپان اور پاکستان کی صنعتی ترقی کی دوڑ' جس میں جاپان نے تو گولڈ میڈل جیتے ہیں اور پاکستان ابھی سٹارٹ لائین پر کھڑا دعائیں مانگ رہا ہے کہ شاید کوئی معجزہ ہو جائے۔

جاپان کی صنعتی ترقی کا جائزہ لیا جائے تو چند اصول اور روایتیں سامنے آتی ہیں جنکو اپنانے سے وہ ترقی کرگئے اور جن کو گنوانے سے ہم وہیں کے وہیں ہیں یا ممکن ہے اب ہم وہاں بھی نہ ہوں جہاں چند سال پہلے ہوا کرتے تھے۔

جاپانی فرد کی حیثیت سے بھی ایماندار ہے اور قوم کی حیثیت سے بھی۔ ہمارے ملک میں لاؤڈ سپیکروں پر چنگھاڑتے ہوئے بنیاد پرست اکثر ایمانداری کا تذکرہ تو کرتے ہیں مگر نہ وہ خود اس پر عمل کرتے ہیں اور نہ انکی بے اثر تقریروں کو سننے والے سامعین اس لفظ پر عمل کرتے ہیں۔ چنانچہ وہ لفظ جو ہمارے مذہب کا ستون تھا اسے ہم تو کھو بیٹھے اور لا مذہب جاپان نے (ہمارے خود ساختہ معیار کے مطابق) اس لفظ کو مضبوطی سے تھام لیا۔

جاپانیوں نے ایمانداری کے علاوہ اپنی قدیم روایتوں کو اس خوش اسلوبی کے ساتھ اپنی عملی زندگی میں شامل کر لیا ہے کہ مغرب کی ترقی یافتہ قومیں بھی محو حیرت ہیں۔ ' شوگنزم ' جاپان کی ایک قدیم روایت ہے۔ ' شوگن' علاقائی سردار ہوا کرتے تھے جو ہنر مند تلوار باز بہادر اور ذہین ہوتے تھے۔ وہ اپنے زیر اثر علاقوں میں ' سومرائی' جتھے تیار کرتے۔ یہ ' سومرائی' اپنے ' شوگن' کے وفادار اور جان نثار سپاہی ہوا کرتے تھے۔ جنکو خود داری اور تلوار بازی کی تربیت بچپن ہی سے دی جاتی تھی اس کے علاوہ سومرائی کی ہر قسم کی ضرورتوں کو پورا کرنا بھی شوگن کی ذمہ داری تھی اس تربیت اور دیکھ بھال کے عوض ' شوگن' کو یہ حق حاصل تھا کہ وہ اپنے ' سومرائی' سے ہر قسم کی قربانی مانگ سکے۔ یہاں تک کہ ' شوگن" کے حکم پر ' سومرائی' خود کشی بھی خوشی سے کر گزرتے تھے۔ درحقیقت ندامت یا شکست کی بجائے ' ہارا کیری' یا خود کشی کا رواج بھی بہادر ' شوگن' اور انکے ' سومرائی' کے دور سے ہی جاپان میں شروع ہوا اور اس عمل کو وہاں عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ شاید اسی لئے جاپان میں خود کشی کرنے کا ریٹ دنیا کے تمام ممالک سے کہیں زیادہ ہے۔ جاپانیوں نے اپنی قدیم روایت کو موجودہ دور میں آجر اور مزدور کے رشتے میں بدل دیا ہے۔ آجر نے شوگن کی تمام تر ذمہ داریاں سنبھال لی ہیں جبکہ مزدور نے سومرائی کا کردار اس خوبصورتی سے سنبھالا ہے کہ وہاں کوئی فیکٹری نہ ہڑتال کا شکار ہوتی ہے اور نہ تالا بندی کی۔ ہر فیکٹری کی چھت پر چینی کے برتنوں اور پلیٹوں کے ڈھیر لگا دیئے جاتے ہیں تاکہ جو مزدور ' فرسٹریشن' کا شکار ہو وہ چھت پر رکھے برتن اور پلیٹیں توڑ کر اپنا غصہ ٹھنڈا کر لے ۔ گھر پہنچ کر بیوی سے جھگڑا کرنے اور بچوں کو مرغا بنانے کی ضرورت نہ رہے ۔ اسی طرح جب مزدور کوئی مطالبہ منوانے کے لئے احتجاج کرتے ہیں تو بھوک ہڑتال کر کے نہ تو سڑکوں پر نکل کر ٹائیر اور بسیں جلاتے ہیں اور نہ ہی کوئی قومی ضیاع کرتے ہیں بلکہ بھوک ہڑتال کرتے ہوئے اپنی لنچ بریک ختم کر دیتے ہیں اور لنچ بریک میں بھی کام جاری رکھتے ہیں۔ اس احتجاجی عمل سے شوگن ذہنیت والی مینجمنٹ اور مالکان اپنے سومرائی مزدوروں کے سامنے ہتھیار ڈالتے ہوئے فوراً انکے مطالبات مان لیتے ہیں۔ ویسے بھی جاپان کے قوانین کے مطابق مزدوروں کی ہر طرح کی ذمہ داری یعنی رہائش' بچوں کی تعلیم اور علاج اور مزدوروں کے لئے غیر ملکوں میں تعطیلات گزارنا وغیرہ مالکان کے فرائض میں شامل ہیں۔

شوگن اور سومرائی قسم کا سلسلہ ہمارے خطے میں صدیوں پہلے مغلوں نے شروع کیا۔ وہ سلطنت کے دور دراز علاقوں میں اپنا اثر و رسوخ اور حکومت قائم رکھنے کے لئے بہادر لوگوں کو جاگیریں عطا کرتے تھے تاکہ اپنی عنایتوں کے عوض ضرورت کے وقت ان وفاداروں کے لشکر مغلیہ لشکروں کے شانہ بہ شانہ باغیوں کی سرکوبی کر سکیں۔ وہی نظام رفتہ رفتہ فرنٹیر میں قبائلی سرداروں' پنجاب میں جاگیرداروں اور سندھ میں وڈیروں کی شکل اختیار کر گیا ـــــ جاپان کے ' شوگنزم' کی طرح ہمارے اس نظام میں برائیاں بھی تھیں اور اچھائیاں بھی۔ مگر بدقسمتی سے ہمارے ملک میں فلموں اور ٹیلیویژن پر اس نظام کی برائیوں کو تو اچھالا گیا مگر اسکے اچھے اور کارآمد پہلوؤں پر دھیان نہ دیا گیا۔ پھر ہمارے ملک کے ایک جاگیردار عوامی راہنما نے اپنی ذاتی قوت بڑھانے کی خاطر اس نظام کی بنیادیں تک ہلا کر رکھ دیں۔ اس عمل سے اس راہنما کو

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

وقتی فائدہ تو ضرور ہوا مگر ملک کو ایسا نقصان پہنچا جس کی تلافی ممکن نہیں۔ کیونکہ اس روایتی نظام کو اگر جدید زاویوں پر ڈھال کر زرعی صنعت میں بدلا جاتا تو ممکن ہے پاکستان بھی جاپان کے پہلو بہ پہلو ترقی یافتہ ہوتا۔ مگر وہ نظام ختم ہوتے ہی کسانوں نے مزدور بن کر شہروں کا رخ کا۔ شہروں کی صنعت پر تنگ نظر، تنگ ذہن اور تنگ دست تاجروں کا قبضہ تھا۔ چنانچہ دو مختلف روایتوں کا تصادم ہوا۔ فیکٹریوں کے مزدوروں نے ہڑتالیں شروع کر دیں اور تاجروں نے تالا بندیاں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ملک کی صنعت تباہ ہو کر رہ گئی۔

جب تک درویشوں کے چہرے نکھرے تب تک سورج کے چہرے کو ٹوکیو کی آلودگی نے چھپا لیا تھا۔ چنانچہ سہمے سہمے قدموں سے ہم اس اجنبی شہر میں رات کی واردات کو نکلے۔ ہوٹل سے باہر قدم رکھا تو معلوم ہوا کہ موسلا دھار بارش شروع تھی۔ ان بدلتے موسموں کے سبب ہی جاپانی چوبیس گھنٹے برساتیوں اور چھتریوں سے مسلح رہتے ہیں۔ فٹ پاتھوں پر ہر سو برسات میں بھیگی چھتریوں کی قوس قزح سی پھیلی ہوئی تھی۔ ہم نے بھی برسات سے نجات پانے کے لئے چھتری کے سائے کی تلاش شروع کی اور اسی امید پر ہوٹل کے سامنے سے گزرنے والوں کے ہمرکاب ہوگئے کہ یقیناً کوئی ہمیں بھی اپنی چھتری کی پناہ میں لے لیگا۔ مگر کسی نے بھول کر بھی بھیگتے درویشوں کی طرف پلٹ کر نہ دیکھا۔ اور دیکھتا بھی کیسے؟ اول تو جاپانی یہ تصور ہی نہیں کرسکتے کہ کوئی شخص چھتری کے بغیر باہر گھوم پھر سکتا ہے۔ دوسرے ہمارے بھیگتے سر بھی تو چھتریوں میں چھپے پستہ قد جاپانیوں کی حد نگاہ سے کہیں اونچے تھے۔ چنانچہ جاپانی چھتریوں کی پناہ میں اور ہم بارش کی بوچھاڑ میں چھتریوں کے اس سیل رواں کے ساتھ ساتھ بہتے چلے گئے۔ خدا خبر کیسی کیسی گلیاں، شاہراہیں، چوک اور چوراہے آئے اور گزر گئے۔ ہم کچھ دیر تو سربفلک عمارتوں کی پناہ میں ستانے کے لئے تھم جاتے مگر پھر ہمت کر کے تیز ہوا اور بارش کے بھیگے تھپیڑے کھانے کے لئے نکل پڑتے۔ یونہی برساتی تھپیڑے کھاتے اور ستاتے تقریباً" نڈھال ہو کر ایک ریستوران میں گھس گئے۔ اور اس طلسمی ریستوران میں قدم رکھتے ہی ہم پتھرا گئے۔ کیونکہ ہمیں پتھر بنانے کے لئے تو گھومتے دروازے کے سامنے کھڑی خوش آمدید کہنے والی خوش شکل، خوش پوش، خوش رنگ اور خوشبو دار خادمہ ہی کافی تھی۔ اس پر وہ ستم ظریف خالص جاپانی روایتی انداز میں خوش آمدید کہتے ہوئے نیم رکوع میں چلی گئی۔ اس جادو گرنی کی نقالی کرتے ہوئے ہم جونہی جوابی نیم رکوع میں جھکے تو ہمارے بھیگے سروں اور بدنوں سے پانی کی برسات سی ہونے لگی۔ اور ہمیں یہ خطرہ لاحق ہوگیا کہ کہیں ہمارے جسموں سے نچڑتے پانی کے سیلاب میں وہ گلبدن ڈوب ہی نہ جائے۔ خیر وہ تو گھبرا کے پیچھے ہو گئی البتہ ریستوران میں رکھا غالیچہ اور اس غالیچے پہ بنی کلیاں پانی میں ڈوب گئیں۔ ہم اس ندامت سے ہی نہ سنبھلے تھے کہ تین اور خادمائیں خدا خبر کہاں سے نمودار ہوئیں اور انہوں نے خشک تولیوں سے ہمارے بھیگے بدن اور چہرے خشک کرنے شروع کر دیئے۔ اور ہم پسینے میں شرابور ہو گئے۔ اس ریستوران کی سجاوٹ اور خدمت کو دیکھنے کے بعد بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ یہاں کا بل کتنا وزنی ہوگا، اور وہ وزن ہم یقیناً اٹھانے کے قابل ہرگز نہ تھے۔ بل کا وزن تو خیر بعد کا مسئلہ تھا ابھی تو ہمارے پاؤں اسقدر وزنی ہوگئے تھے کہ بھاگنے کے لئے قدم اٹھانے کی ہمت نہ رہی تھی۔ کمپیوٹر دماغ درویش دوم نے بڑی ہی جرات کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ "سوری میڈم! وی آر لکنگ فار آ میڈیکل سٹور۔" (معاف کرنا میڈم! ہم تو دواؤں کی دکان ڈھونڈ رہے ہیں) یہ فقرہ کہتے ہی وہ ہمیں گھسیٹتا ہوا باہر بارش کی بوچھاڑ میں لے گیا۔ اور حیرت کی بات ہے کہ ہم تینوں ریستوران کے گھومتے دروازے کے ایک ہی حصے میں فٹ ہو کر باہر آگئے، حالانکہ وہ حصہ صرف ایک ہی شخص کے گزرنے کے لئے بنا ہوتا ہے۔

ایک تو اس ریستوران میں گھسنے کے خوشگوار حادثے نے ہمیں پریشان کر دیا تھا اور دوسرے موسلا دھار بارش سے خاصے تنگ آگئے تھے۔ چنانچہ بھوک کو بھسم کرنے کے لئے ایک ایک برگر کھایا۔ یہ پلاسٹک نما امریکن خوراک دنیا میں ہر جگہ ملتی ہے۔

اس میں کچھ غذائیت ہوتی ہے یا نہیں اسکی تو ہمیں خبر نہیں' البتہ نان چھولے کے علاوہ سستا پیٹ بھرنے کے لئے برگر سے بہتر کوئی شے نہیں۔ چنانچہ برگر ختم کرتے ہی ہم نے واپس ہوٹل جانے کا فیصلہ کیا۔ مگر ہوٹل پہنچتے تو کیسے؟ آتے وقت اتنی گلیاں چوک اور شاہراہیں پھلانگتے پھرتے رہے تھے کہ واپسی کے روٹ کی طرف دھیان ہی نہ دیا تھا۔ جو تھوڑا بہت راستے کا اندازہ تھا وہ بھی اس وقت ختم ہو گیا جب ریستوران سے جی بھر کے رسوا ہو کر بھاگے تھے۔ اب جس طرف نگاہ اٹھا کر دیکھتے تھے ایک سی شاہراہیں' ایک سے چوک اور ایک سی چھتریوں والی ان گنت مخلوق۔ پھر ستم یہ ہوا کہ ہم میں سے کسی کے پاس ہوٹل کا پتہ بھی نہ تھا۔ کیونکہ بڑے ہوٹلوں میں تو چابی دیتے وقت ریسپشن والے باقاعدہ شناختی کارڈ بنا کر دیتے ہیں جس پر گاہک کا نام' کمرہ نمبر اور ہوٹل کا پتہ درج ہوتا ہے۔ مگر اس چھوٹے سے ہوٹل میں اس قسم کے کوئی لوازمات موجود نہ تھے۔ پھر اکثر ہوٹلوں کے کمروں میں ماچسیں ضرور ہوتی ہیں جن کے پیچھے ہوٹل کا پتہ درج ہوتا ہے۔ چونکہ ہم میں سے سگریٹ کوئی نہیں پیتا تھا۔ اسلئے کمرے سے ماچس بھی نہ اٹھائی تھی۔ چنانچہ ہوٹل کا پتہ بتاتے تو کیسے؟ البتہ ہوٹل کا نام ہمیں یاد تھا اور ہمیں یقین تھا کہ نام بتا کر کسی نہ کسی راہگیر سے پتہ ضرور معلوم کر لیں گے۔ چنانچہ ہر راہگیر سے ہم ہوٹل ناکا ٹاوا کا پتہ پوچھنے لگے۔ مگر حیرت کی بات تھی کہ ہر شخص یا تو نفی میں سر ہلا دیتا اور یا یہ کہتا کہ ٹوکیو میں اس نام کا کوئی ہوٹل نہیں۔ ہم قسم قرآن کی کھا رہے تھے کہ ہم ہوٹل ناکاٹاوا میں مقیم ہیں' مگر جاپانی بضد تھے کہ اس نام کا کوئی ہوٹل نہیں۔ چنانچہ آدھی رات تک یونہی بارش میں بھیگتے گلی گلی طواف کرتے پھرے۔ نہ ہی ہوٹل تک پہنچے اور نہ ہی کسی جاپانی کو یقین دلا سکے کہ ناکاٹاوا نام کا ہوٹل ٹوکیو میں موجود ہے۔ اتنے میں گشتی پولیس کی گاڑی نظر آئی تو ہم نے بھاگ کر ان سے مدد کی درخواست کی۔ وہ بھی بضد تھے کہ اس نام کا وہاں کوئی ہوٹل نہیں۔ پولیس کے روایتی رویئے کے مطابق تو انہیں وہاں سے چلا جانا چاہیے تھا۔ اور اگر وہاں کے پولیس والے ہماری شاہین فورس پولیس کے اصولوں سے واقف ہوتے تو ہمیں یقیناً تب تک آوارہ گردی کے الزام میں بند کر دیتے جب تک کوئی تگڑی سفارش یا رشوت نہ دی جاتی' یعنی مٹھی گرم نہ کی جاتی۔ مگر انہوں نے ہمیں اپنی گاڑی میں بٹھایا اور دو منٹ کے بعد ہی ایک بلڈنگ کے سامنے لا کھڑا کیا۔ اس بلڈنگ کو دیکھتے ہی درویش اول نے اچھل کر کہا۔ "یہی ہے ہمارا ہوٹل۔" دراصل سیاحوں کی بدحواسیوں سے آشنائی اور اپنے وسیع تجربے کی بناء پر وہ ہمیں صحیح ہوٹل تک لے آئے تھے۔ جس ہوٹل کو ہم بار بار ناکاٹاوا کہتے رہے تھے وہ درحقیقت ہوٹل ٹاکاناوا تھا۔ اور اس نام کے ہیر پھیر نے ہمیں رات بھر پھیرے لگانے پر مجبور کر دیا تھا۔ پولیس کو "مری گاتو" یعنی شکریہ کہنے کے لئے ہم باجماعت جاپان کے روایتی نیم رکوع میں چلے گئے۔ اور جب رکوع سے اٹھے تو تینوں کے اپنی اپنی کمر پر ہاتھ تھے۔ کیونکہ نماز کی عادت نہ ہو تو یوں اچانک رکوع میں جانے سے اکثر کمر کے کڑاکے نکل جایا کرتے ہیں۔

ہر شہر میں سیاحت کے لئے چند سکہ بند قسم کی سیرگاہیں ہوتی ہیں جنہیں قسمیہ طور پر ہر سیاح کو دیکھنا پڑتا ہے اور چند روایتیں ہوتی ہیں جن سے گزرنا پڑتا ہے۔ چنانچہ یہ پابندی ہم پر بھی لاگو تھی جسے لازمی طور پر ہم کو پورا کرنا تھا۔ اپنے لئے نہ سہی تو زمانے کے لئے سہی۔ لہٰذا درویش اول کے دربار میں پہنچے تاکہ بجٹ اور سیاحت کی منصوبہ بندی کی جا سکے۔ درویش اول نماز منہ ٹیلی فون پر محو گفتگو بھی تھا اور محو عشق بھی۔ مجھے یقین تھا کہ مس کاتو نے جاتے وقت جو تعویز سا درویش اول کی مٹھی میں دیا تھا اس میں وہ اپنے گھر کا ٹیلی فون نمبر تھما گئی ہو گی۔ اچھی صورت پر بری نظر رکھنا تو ہمارا بھی پسندیدہ مشغلہ ہے اور اس جاپانی جتی پر تو میں سڈنی سے ڈورے ڈالتا آ رہا تھا۔ مگر وہ کم بخت پھنسی تو درویش اول کے جال میں۔ میں رقابت کی آگ میں جلنے لگا اور بارہا میرا جی چاہا کہ درویش اول کے سر پر سیٹ کئے ہوئے بالوں کے جال کو بکھیر دوں تاکہ وہ گنجا سا ہو کے رہ جائے۔ مگر ایسا کرنے کی مجھ میں ہمت نہ ہوئی۔ وہ متواتر عشق فرماتا رہا اور میں پیچ و تاب کھاتا رہا۔ آخر درویش دوم نے دہائی مچائی اور فون بند کروایا۔ درویش اول کے وسیع و عریض چہرے پر ڈیڑھ میل لمبی مسکراہٹ تھی۔ اس سفر میں یہ پہلا موقع تھا کہ وہ صبح سویرے اچھے موڈ میں

تھا اور اسی اچھے موڈ میں اس نے گنگناتے ہوئے فرمایا "بیوقوفو! تمہاری خاطر دیکھو مجھے کیا کیا کرنا پڑتا ہے۔ ابھی سیر کے لئے گاڑی اور گائیڈ دونوں کا بندوبست کر لیا ہے۔ مس کاتو آدھے گھنٹے میں پہنچنے والی ہے اور وہ ہمیں ٹوکیو کی سیر کرائے گی .... اور سیر بھی مفت۔" اس نے کمپیوٹر دماغ درویش دوم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ وزیر خزانہ درویش دوم کا غصہ کافور کرنے کے لئے تو مفت سیر کا جھانسہ کافی تھا۔ مگر میں رقابت کی آگ میں جھلس گیا۔ زن' زر اور زمین کو دنیا میں ہر فساد کی جڑ سمجھا جاتا ہے۔ ٹوکیو میں ہمارے پاس نہ زر تھی اور نہ زمین۔ تھی تو صرف ایک عدد زن' مس کاتو۔ سو اس پر بھی درویش اول نے قبضہ جما لیا اور وہ اسکے پہلو میں جا بیٹھی اور میرے پہلو میں درویش دوم .....

ٹوکیو میں ہماری سیر کا آغاز اسی مقام سے کیا گیا جس مقام پر شہر ٹوکیو کی بنیاد ۱۴۵۷ء میں رکھی گئی۔ دریائے سومیدا کا کنارہ' مچھیروں کی بستی' بستی سے قصبہ اور قصبے سے شہر اور شہروں میں آبادی کے لحاظ سے اب دنیا کا سب سے بڑا شہر۔ مگر اس دور میں اس قصبے کا نام ' ایدو' تھا اور یہ قصبہ ٹوکو گاوا نامی ایک جنگجو جاگیردار کی جاگیر تھا۔ ۱۸۶۸ء میں اس جنگجو شوگن اور اس کے اسی ہزار سومرائی بہادروں کو شکست ہوئی۔ شہنشاہیت اس علاقے تک پہنچی۔ شہنشاہ ' میجی' نے اپنا دربار اور درباری پرانے دارالحکومت کیوٹو سے ایدو منتقل کئے تو شہر کا نام بھی بدل گیا اور کایا بھی پلٹ گئی اور یہ ٹوکیو یعنی مشرقی دارالحکومت کہلایا۔ ٹوکیو میں شاہی باغات ہیں اوران باغات میں دوسرے سیاحوں کے ہمراہ ہم بھی کھڑے تھے۔ ہر گروپ کے گائیڈز بھانت بھانت کے سیاحوں کو عجیب و غریب بولیوں میں شاہی قلعہ کی تفصیل اور تاریخ بتا رہے تھے۔ ہماری گائیڈ مس کاتو نے ندیدے درویش اول کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کہنا شروع کیا۔ "وہ سامنے جو سنگ اسود کی فصیل اور اور اس کے ساتھ ساتھ آبی خندق ہے نا ...." درویش دوم اور میں نے سامنے دیکھا .... وہاں فصیل کے بجائے ٹریفک سگنل' خندق کی بجائے شاہراہ اور آب کی جگہ ٹریفک کا سیلاب تھا۔ ہم نے مڑ کر پیچھے دیکھا۔ وہاں فصیل بھی تھی اور آبی خندق بھی .... مگر وہ درویش دیوتا کی پجارن ادھر ادھر دھیان دیئے بغیر ہی بولتی چلی گئی .... "پرانے زمانے میں دشمن دیوار کے اندر شاہی محل تک ہرگز نہیں پہنچ سکتے تھے .... مگر ۱۹۴۵ء میں امریکنوں نے ہوائی حملے کے ذریعے شاہی محل پر بھی ٹوکیو شہر کی طرح آتشی بموں سے حملے کئے .... شہر اور شاہی محل دونوں کو راکھ کے ڈھیر میں بدل دیا ...." وہ متواتر درویش اول کو تکتی رہی اور بکتی رہی۔ "۱۹۶۸ء میں شاہی محل کی تعمیر نو ختم ہوئی اور اب اسکی کانکریٹ میں ایسے کیمیائی مادے استعمال کئے گئے ہیں کہ شاہی محل کو آگ نہیں لگ سکتی ..." درویش دوم مس کاتو کی بے رخی' میں رقابت کی اور درویش اول محبت کی آگ کے شعلوں کی لپیٹ میں تھے۔

خندق کے پار' گیٹ کے اندر پھر سیاحوں کے ہجوم لگ گئے۔ اور اب گائیڈ شاہی محل میں بسنے والے شاہی خاندان کی دھجیاں بکھیرنے لگے۔ ہماری بے رخ گائیڈ نے تو شاہی خاندان کا شجرہ نسب سورج دیوی' جمّوں تینو' کے پوتے سے جوڑ دیا۔ اسکی اس بات میں منطق ضرور تھی۔ کیونکہ جاپان کو چڑھتے سورج کی سرزمین بھی کہا جاتا ہے۔ سورج ان کے قومی پرچم پر بھی موجود ہے اور سب سے بڑی بات یہ کہ وہ شاہی خاندان کا دادا پردادا بھی نکلا۔ جس کے سبب بادشاہ کو بھگوان سمجھ کر اسکی پوجا کی جاتی رہی۔ مگر شاہی خاندان کے ایک سو چوبیسویں شہنشاہ ہیرو ہیتو نے ۱۹۴۶ء میں سورج کے ساتھ ہاتھ کر دیا اور سورج دیوتا کا پوتا بننے کے بجائے بندے کا بچہ بن گیا۔ یعنی خدائی دعوے سے دستبردار ہو گیا اور اس طرح جاپان میں شاہی خاندان کی پوجا ختم ہو گئی گو عزت جوں کی توں برقرار ہے۔

شاہی خاندان کے بارے میں ہلکا پھلکا لیکچر پلانے کے بعد مس کاتو نے ہمیں تو شاہی محل میں گھومنے کا حکم سنایا اور خود درویش اول کو لیکر چیری بلاسم کے پھولدار سائے میں بیٹھ گئی۔ بھلا یہ کہاں کا انصاف تھا کہ سیر کرنے کی سزا تو ہم دونوں کو ملے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اور عشق کرنے کی جزا درویش اول کو' اور وہ بھی اس لڑکی کے ساتھ جس پر میں بچپن سے یعنی سنڈنی سے نظر بد رکھتا تھا۔ چنانچہ میری رگ رگ میں کینگی کا زہر پھیل گیا اور اپنی اس شکست کا بدلہ لینے کے لئے درویش اول کے خلاف درویش دوم کے کان بھرنے شروع کئے۔ ادھر کم بخت درویش دوم بڑا ہی مست طبیعت بندہ تھا۔ کسی چغلی' شکایت کا اس پر اثر ہی نہ ہوتا تھا۔ البتہ پیدل چلنے سے اس کی جان جاتی تھی۔ امپیریل پیلس کے وسیع علاقے میں پیدل گھومنے سے جب اسکا چہرہ چقندر بنا تو میں نے پھر سے اپنا چغل ساز چھیڑ دیا۔ "یار ہمیں کیا ضرورت ہے جاپانیوں کا قلعہ دیکھنے کی؟ .... ہم نے تو کبھی مغلوں کا قلعہ نہیں دیکھا .... پھر اوپر سے دھوپ بھی تو اتنی تیز ہے ...." درویش دوم نے فوراً اپنے چہرے پر رومال کا واپر چلایا۔ لوہا گرم تھا میں نے دوسرا وار کیا۔ "خود تو نواب صاحب سائے میں بیٹھ گئے ہیں اور ہمیں ...." درویش دوم نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "چلو یار واپس چلتے ہیں ہم سے نہیں ہوتی یہ پیدل سیر۔" میری کینگی کارگر ثابت ہوئی اور ہم دونوں نے سیر ہڑتال کر دی۔ یعنی جو مس کاتو بتائے گی وہ سنیں گے نہیں اور جو دکھائے گی وہ دیکھیں گے نہیں۔

"یہ ٹوکیو ٹاور ہے۔ اسکی بلندی ہزار فٹ ہے اور یہ پیرس کے ایفل ٹاور سے ایک سو فٹ زیادہ بلند ہے۔" مس کاتو نے گاڑی میں بیٹھے بیٹھے ریڈیو جاپان کے آہنی مینار کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بتایا۔ ہم دونوں نے سنی ان سنی کر دی اور سرخ رنگ ٹاور کو نظر انداز کر دیا۔ ویسے درویش اول نے کونسا اس مینار کو دیکھا۔ وہ بھی تو ٹکٹکی باندھے مس کاتو کو یوں تکے جا رہا تھا گویا اسکی آنکھیں پتھرا گئی ہوں۔

"اڑ رڑ دھم .... اف کتنا سخت بھونچال ہے .... دیواریں ہلنے لگیں .... اے لو وہ سب مکان گر پڑے ...." صدیوں پہلے جب ہم پرائمری سکول کھیترانوالہ میں پہلی جماعت کے طالب علم تھے اور اپنے ہم جماعتوں' نجا ڈھڈی' مینا جھیڈو' پھیلی وٹو اور گوے کبڑے کے ہمراہ ٹاٹ پر کھڑے ہو کر با آواز بلند ٹوکیو کے بارے میں یہ سبق یاد کیا کرتے تو اس وقت جاپان کے متعلق نہ تو کوئی واقفیت تھی اور نہ ہی الفت۔

صرف ماسٹر خیر دین کے ڈنڈے کا خوف تھا کہ جب بھی وہ اپنے خواب خرگوش سے بیدار ہوتے تو اپنے ڈنڈے کی ضرب لگا کر ہمیں سبق یاد کرنے کی تاکید کرتے اور پھر اونگھنے لگتے۔

ٹوکیو کے زلزلوں کے سبق یاد کرتے کرتے بچپن میں ہم نے اتنی مار کھائی گویا اس شہر میں زلزلے لانے کی تمام تر ذمہ داری ہمارے سر ہو۔ حالانکہ اس شہر میں تو ہر سال دو زلزلے بلا ناغہ آتے ہیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ ٹوکیو بھی وینس کی طرح دھیرے دھیرے زمین میں دھنستا چلا جا رہا ہے۔ شاید اسی لئے وہاں لکڑی کی عمارتیں تعمیر کی جاتی تھیں۔ جن کا وزن بھی کم ہوتا تھا اور زلزلے بھی برداشت کر لیتی تھیں مگر آگ بہت جلد پکڑتی تھیں۔ ۱۹۲۳ء میں زلزلے کے بعد جب ٹوکیو میں آگ پھیلی تو شہر کا شہر راکھ کا ڈھیر بن گیا۔ چنانچہ ایک امریکن ماہر تعمیر جناب فرینک لائیڈ نے امپیریل ہوٹل کی تعمیر میں سیمنٹ' سریا' کانکریٹ اور شیشہ اس اسلوب سے استعمال کیا کہ وہ عمارت زلزلوں اور آگ سے محفوظ ہوگئی۔ اس کامیاب تجربے کے بعد ٹوکیو میں تعمیرات کا ایک سیلاب سا آگیا اور پگوڈا نما خوبصورت عمارتوں کی جگہ ہر سو کنکریٹ کے اژدہے پھن پھیلا کر کھڑے ہوگئے۔ اب حد نگاہ تک آلودگی کی چادر اوڑھے یہی اژدہے دکھائی دیتے ہیں' جنکی خوفناک آنکھیں نیون سائن بن کر جگمگ جگمگ کرتی رہتی ہیں۔ ان سربفلک عمارتوں کے سائے میں ٹریفک کا سیل رواں چیونٹیوں کا کارواں سا دکھائی دیتا ہے جو افراتفری اور نفسا نفسی کے عالم میں سڑکوں پر بھٹکتا پھرتا ہے۔ اس بے راہ روی کے باوجود ہماری گائیڈ نے ہمیں میجی مندر کے سامنے لا کھڑا کیا۔

میجی مندر شہنشاہ میجی اور انکی ملکہ دواگر شوکن کے نام سے منسوب ہے اور یہ اس دور میں تعمیر کیا گیا جب جاپانی شہنشاہوں کو سورج دیوی کی اولاد سمجھ کر ان کی پوجا کی جاتی تھی۔ ویسے یہ شنتو عقیدے کے لوگوں کا مندر ہے۔ جو اپنے مندر ہمیشہ قدرت کے حسین مناظر یعنی پہاڑی چوٹیوں' جنگلوں' جھیلوں اور جھرنوں کے قریب بناتے ہیں۔ کیونکہ ان کے مطابق بھگوان اور دیوتا حسین نظاروں میں ہی بسیرا کرتے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہیں۔ اسی عقیدے کو بروئے کار لاتے ہوئے میجی مندر بھی ایک حسین پارک میں تعمیر کیا گیا ہے۔ جاپانی صرف ٹیلی وژن' کمپیوٹر اور کیمرے ہی نہیں بناتے بلکہ باغ لگانے میں بھی بڑی مہارت رکھتے ہیں' یہاں تک کہ اسلام آباد کی لینڈ سکیپنگ اور باغ بھی ایک جاپانی ماہر باغبانی کی کاوش کا نتیجہ ہیں۔ مری روڈ سے زیرو پوائنٹ شاہراہ کے دونوں جانب ساکورا یعنی چیری بلاسم کے پھولدار پودے لگانے کا بھی منصوبہ تیار کیا گیا تھا جس کے لئے جاپانی حکومت نے پاکستان کو اپنے اس قومی پھول کے سینکڑوں پودے تحفے کے طور پر دئے۔ مگر ان میں سے کچھ پودے تو سی۔ ڈی۔ اے یعنی کیپٹل ڈویلپمنٹ اتھارٹی کے افسران بالا کی کوٹھیوں میں لگا دئے گئے اور کچھ ہمارے باغبانوں کی مہارت کی نذر ہوگئے۔ کیونکہ اس شاہراہ پر اب نہ تو کوئی چیری بلاسم کا پودا دکھائی دیتا ہے اور نہ ہی پھول۔ البتہ میجی مندر کی الگ بات ہے کیونکہ اسکے ارد گرد پھیلے ہوئے وسیع پارک میں چیری بلاسم کے علاوہ دوسرے سینکڑوں قسم کے اور بھی پودے اور درخت ہیں۔ جھیل اور جھرنے ہیں' پھول اور پھلواڑیاں ہیں اور لکڑی کے پل اور پگوڈے ہیں۔ ویسے جاپانیوں نے بڑے بڑے تناور درختوں کو بونا بنانے کے فن میں بڑی ہی مہارت حاصل کر لی ہے۔ چنانچہ اگر وہ چاہیں تو گنجائش کے مطابق برگد کے پیڑ کو چائے کے پیالے میں پال پوس سکتے ہیں۔ ویسے بھی ہمارے اور ان کے باغات میں چند بنیادی فرق ہیں۔ پہلا اہم فرق تو یہ ہے کہ ہمارے ملک میں پھلدار درختوں کے باغات ہوتے ہیں اور جاپان میں سجاوٹ کے لئے درختوں کے باغات ہوتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ جاپانی فطری طور پر رنگ و بو کے قدر دان ہوتے ہیں جبکہ ہم لوگ یورپین قوموں کی طرح رنگ و بو کے صرف تجارت کی حد تک قدر دان ہیں۔ ویسے بھی ہمارے اس خطے میں باغات کی روایت تو مغلوں نے ہی شروع کی۔ اس سے پہلے نہ تو باغات تھے اور نہ ہی باغبان۔ البتہ لکڑ ہارے بہت تھے۔ اب بھی موجود ہیں کہ جنگلوں کے جنگل بیچ کھاتے ہیں۔ پہلے مغل شہنشاہ بابر نے پشاور' اٹک' حسن ابدال' واہ اور کلرکہار میں باغات کا سلسلہ شروع کیا اور اسکے بعد آنے والے مغل شہنشاہوں نے وہ سلسلہ نہ صرف جاری رکھا بلکہ اس میں بڑا حسن و جمال پیدا کیا اور کمال حاصل کیا۔ یہاں تک کہ پھولوں اور پھلوں کے نام سے باغ منسوب کر دیئے۔ مثلاً" لاہور میں شالامار باغ کے علاوہ بادامی باغ' انگوری باغ' چنبیلی باغ' گلابی باغ اور پھر باغبانوں کا پورا علاقہ باغبان پورہ آباد کیا۔ مغلوں کے ان باغبانوں کی نئی پود باغوں سے اسقدر باغی ہوئی ہے کہ وہ نہ صرف شہنشاہ جہانگیر کے مقبرے کے ارد گرد پھیلے ہوئے نور جہاں کے دلکشا باغ بلکہ شالا مار باغ کو بھی اجاڑنے کے لئے دن رات کوشاں ہیں اور شرم کی بات تو یہ ہے کہ محکمہ آثار قدیمہ کی بے بسی اور حکومت کی بے حسی کے سبب ماشاء اللہ کامیاب بھی ہیں۔ مثلاً" گنڈیریوں' کیلوں اور مونگ پھلی کے چھلکے پھینکنا، پھول توڑنا' سنگ مرمر کی دیواروں کو وکٹ بنا کر کرکٹ کھیلنا' آم کی شاخوں سے جھولنا' شالامار کے فواروں اور تالابوں میں نہانا اور آثار قدیمہ کے چوکیداروں کو گالیاں دینا تو ان کا پیدائشی حق ہے۔ کیونکہ ان باغوں کے باغبان انکے آباؤ اجداد تھے۔ لیکن اب تو ملکی اور غیر ملکی سیاحوں پر غیر اخلاقی نعرے بازی' ہلڑ بازی اور لڑکیوں سے چھیڑ چھاڑ ان کے پسندیدہ مشاغل ہیں۔ جن مشاغل کو پورا کرنے کے لئے یہ نوجوان نمار منہ ہی ان باغات میں پہنچ جاتے ہیں۔ دن بھر چھابڑی فروشوں اور کھوکھے والوں سے غنڈہ ٹیکس وصول کرتے ہیں اور سیاحوں سے دل لگی کرتے ہیں۔ ستم کی بات یہ ہے کہ یہ نوجوان گھر سے تو تعلیم حاصل کرنے کے لئے نکلتے ہیں لیکن نہ استادوں میں ہمت ہے کہ ان کی غیر حاضری لگا سکیں نہ والدین کو فرصت ہے کہ انکی تعلیم کے بارے میں کچھ پوچھ گچھ کر سکیں اور نہ ہی کسی حکومت میں جرات ہے کہ یہ غنڈہ گردی روک سکے۔ مگر الحمد للہ میجی مندر کے باغ میں باغبان پورہ کے نوجوان غنڈے موجود نہ تھے۔ ہر طرف سکون تھا' خوشیاں تھیں' مہک تھی' جوبن تھا اور رنگ تھے۔ چنانچہ اس رنگ میں رنگ رلیاں منانے کے لئے ہماری گائیڈ مس کاتو اور باغی درویش اول نے تو ایک آبشار کا رخ کیا اور ہمیں میجی مندر میں جانے کا اشارہ کر دیا۔ ان کی اس حرکت پر ہمارا مٹی کا مادھو' درویش دوم بھی طیش میں آگیا اور اس نے

میرے دل کی بات کہدی۔ "اوئے گنجے شہزادے سلیم! ابھی تو تو اس چینی انارکلی کو عیاشی کرنے لے جا' مگر بچو! رات تو تمہیں ہمارے ساتھ ہی گزارنی ہے نا! ...." درویش دوم کے اس فقرے کا تو درویش اول پر کچھ اثر نہ ہوا البتہ درویش دوم نے جاتے جاتے جو بات کہی وہ بڑی کارگر ثابت ہوئی۔ "اوئے گنجے یاد رکھ ابھی ہمارا سفر بھی ختم نہیں ہوا اور ہوٹل کا بل بھی چکانا ہے۔" پیسہ ہمیشہ سے انسان کی کمزوری رہا ہے۔ اور یہ فقرہ سنتے ہی درویش اول مجبوری سے موم ہو گیا۔

سائپرس کی لکڑی کا روایتی دروازہ اور لکڑی کا ہی بنا ہوا پگوڈا نما مندر ..... کبوتر اور کبوتروں کو چوگہ ڈالتے جاپانی ۔ ان کبوتروں سے میں بہت تنگ ہوں۔ یہ ہر ملک میں ہر مذہب کے لوگوں سے چوگے کا ٹیکس وصول کرتے ہیں۔ اور ستم یہ کہ ان عیاروں کو دنیا بھر میں معصوم پرندہ بھی سمجھا جاتا ہے۔ اگر بھوکے پرندے کو چوگہ ڈالنے سے ثواب ملتا ہے تو پھر کوے کو چوگہ کیوں نہیں ڈالا جاتا۔ صرف کبوتر ہی کو کیوں؟ ویسے ہمارے گاؤں کے حکیم جی کبوتروں کو خوب نکرے ہیں۔ وہ ہر مریض کو نسخے میں کبوتر کا گوشت کھانے کا مشورہ دیتے ہیں۔ چنانچہ سردیوں کے موسم میں میلوں تک ہمارے گاؤں کے گرد و نواح میں کوئی کبوتر نہیں پھٹکتا۔ اور جو غلطی سے پھٹک جاتا ہے وہ پھڑکا دیا جاتا ہے۔ بدھ مذہب امن کا مذہب ہے۔ بدھ مت کے پیرو چرند پرند کسی پر بھی ظلم نہیں کر سکتے۔

کتنی حیرت کی بات ہے کہ صدیوں پہلے ہمارا خطہ بدھ مت کا گہوارہ تھا۔ مہاراجہ اشوک نے ۲۶۲ ق م کالنگا (موجودہ اڑیسہ) کی جنگ میں خونریزی دیکھنے کے بعد امن کا مذہب یعنی بدھ مت اختیار کیا اور اس مذہب کے پرچار کا بیڑا اٹھا لیا۔ قدیم گزر گاہوں پر کتبے نصب کئے گئے اور دور دراز ممالک میں بدھ مت پھیلانے کو تبلیغی جماعتیں روانہ کیں۔ کچھ تو جنوبی ہندوستان سے نکل کر برما اور سری لنکا جا پہنچیں اور وہاں بدھ مذہب پھیلایا اور کچھ تبلیغی جماعتیں قدیم شاہراہ ریشم سے چین کوریا اور جاپان جا پہنچیں۔ اور وہاں سے آنے جانے کا ایک نیا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ٹیکسلا سے کابل تک پھیلی ہوئی یہ گندھارا کی سرزمین جسکے سٹوپے، عبادت گاہیں اور یونیورسٹیاں اس قدر عروج پر پہنچیں کہ بدھ مت کے سکالرز اور عبادت گزار ہزار ہا میل کے دشوار گزار راستے طے کر کے یہاں پہنچتے۔ آج بھی شاہراہ ریشم پر جابجا ان قدیم مسافروں کی منتوں کے نشان چٹانوں پر کندہ ہیں۔ جاپان' کوریا' تائیوان اور دوسرے بدھ ممالک سے ہزاروں لوگ ان عبادت گاہوں کی یاترا پر آسکتے ہیں مگر ایسا ہوتا نہیں۔ کیونکہ سیاحت کو فروغ دینے والے سرکاری اداروں میں منصب سنبھالے بیرو کریٹس صرف حکمرانی کرنا اور کام میں روڑے اٹکانا تو جانتے ہیں مگر عمل کرنا نہیں جانتے اور نہ یہ چاہتے ہیں کہ سیاحت کو فروغ ہو۔ پھر ان عبادت گاہوں' سٹوپوں اور یونیورسٹیوں کی حالت زار بھی کچھ ایسی ہے کہ ہماری مذہبی فراخدلی کا منہ چڑاتی ہے۔ ویسے جاپانی حکومت نے تو ٹیکسلا کی بدھ یونیورسٹی کی تعمیر نو کی پیشکش بھی کی تھی۔ مگر سنا ہے کہ ہمارے حکمرانوں نے جاپانیوں کو بدھ یونیورسٹی کھولنے کی بجائے کاروں کا پلانٹ لگانے کا مشورہ دیا۔

ہم تو مسجدمیں بھی عید کے عید جاتے ہیں اس جاپانی مندر میں بھلا کیا جاتے ۔ مگر درویش دوم کی ہوٹل کا بل چکانے والی تازہ ترین دھمکی ہمیں یاد تھی۔ اس لئے جوتے بغل میں دبائے اور چپکے سے مندر میں گھس گئے۔ تاہم حیرت اس بات کی ہوئی کہ نہ تو وہاں کوئی جوتوں کی رکھوالی کرنے والا ٹھیکیدار تھا اور نہ ہی کسی دوسرے نے اپنے جوتے بغل میں دبا رکھے تھے۔ ہم نے ادھر ادھر دیکھا اور کھسیانے سے ہو کر اپنے ڈیڑھ فٹ لمبے جوتے بغل سے نکال کر جاپانیوں کے چھوٹے چھوٹے کھلونا نما جوتوں میں رکھ دیئے۔ مگر سچی بات یہ ہے کہ دل میں جوتا چوری ہونے کا دھڑکا لگا رہا۔ دل کو یہ سوچ کر تسلی دی کہ آخر جاپانی ہمارے جوتے کو چرا کر کریں گے کیا؟ .... لیکن ایک وسوسے نے میرے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے کہا کہ جہاں چوروں کے ہاتھ قلم کر دیئے جاتے ہیں چوری تو آخر وہاں بھی ہوتی ہے۔ جاپان میں بھلا کیوں نہ ہوگی؟ ہم فوراً اپنا جوتا اٹھانے کے لئے جھکے۔ کیونکہ ہمارا جوتا چوری ہونے کی صورت میں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہمارے سائیز کا جوتا تو پورے مشرق بعید میں ملنا ناممکن تھا۔ ہمارے ہاتھ جوتے تک پہنچنے ہی والے تھے کہ درویش دوم کی کرخت آواز میں حکم نے ہمیں ٹوک دیا۔

"اوئے تمہیں جوتا چوری ہونی کی کیسی فکر لگی ہے۔ نہ تو یہ کوئی پاکستانی مزار ہے اور نہ ہی یہاں درویش اول موجود ہے۔ پھر تمہارا جوتا بھلا کون چرائے گا؟ اور جاپانیوں کو اس ہنر کی عادت نہیں ہے۔" ہم نے جوتا وہیں چھوڑا اور درویش دوم کے ہمراہ ہولئے۔

میجی مندر کے اندر عجب منظر تھا۔ نسل نسل کے لوگ .... جنکا مزاج اور مذاق اپنا اپنا.... مذہب اپنا اپنا .... عقیدے اپنے اپنے .... زبان اپنی اپنی اور سوچ اپنی اپنی .... اس کے باوجود ہم نے زندگی میں پہلی مرتبہ انسانوں میں اپنائیت بھی پائی خلوص بھی اور محبت بھی .... ایسا منظر ہماری مسجدوں میں آخر کیوں نظر نہیں آتا؟ ہمارا دین تو امن اور سلامتی' محبت اور بھائی چارے کا دین ہے .... پھر یہ شرپسند عناصر کہاں سے آن ٹپکے؟ جنھوں نے مذہب اور مسجد دونوں پر قبضہ کر لیا ہے اور وہ قبضہ ان سے اب پلس (پولیس) بھی نہیں چھڑا سکتی۔ کیونکہ پلس تو ہمیشہ قابض کا ساتھ دیتی ہے۔

مندر سے واپسی پر اپنے جوتوں کو جوں کا توں پایا تو مجھے یقین آیا کہ واقعی جاپان میں چوری نہیں ہوتی ہے۔ چور بھی نہیں ہوتے۔ بھکاری بھی نہیں ہوتے۔ اور اگر آپ کی کوئی چیز گم ہو جائے تو مل بھی جائے گی۔ کیونکہ حکومت نے ہر شہر میں تلاش گمشدہ کے دفاتر کھول رکھے ہیں۔ جہاں ہر گواچی ہوئی چیز مل جاتی ہے ادھر ہمارے معاشرے میں چینی انجینئرز اور جاپانی سیاح تک گم ہو جاتے ہیں۔ مگر جاپان میں جس جاپانی کو جو چیز جہاں سے ملے گی وہ اس دفتر میں جمع کرا دے گا۔ البتہ گواچا ہوا لونگ' لٹی ہوئی عصمت اور کھوئی ہوئی عزت ان دفتروں میں نہیں مل سکتی۔ میرا اندازہ ہے جاپان میں جوتوں کا کاروبار ہرگز نہیں چل سکتا۔ کیونکہ جاپانیوں کو جوتے اتارنے کی بہت بری عادت ہے۔ گھروں میں جوتے وہ نہیں پہنتے۔ مندروں میں جوتا

وہ نہیں پہنتے، کوئی مذہبی رسم ہو تو جوتے وہ اتار دیتے ہیں۔ پھر جوتوں کی چوری بھی وہاں نہیں ہوتی۔ کہتے ہیں کہ جب ۱۸۷۱ء میں ٹوکیو سے یوکوہاما تک ریل گاڑی شروع ہوئی تو ریلوے حکام نے افتتاحی سفر کے لئے معزز شہریوں اور افسران بالا کو مدعو کیا۔ حسب عادت جاپانیوں نے شمباشی ریلوے سٹیشن کے پلیٹ فارم پر اپنے جوتے اتار کر ٹرین میں قدم رکھا۔ جب یوکوہاما میں گاڑی رکی تو ظاہر ہے اس پلیٹ فارم پر ان کے جوتے موجود نہ تھے۔ چنانچہ انہوں نے ننگے پاؤں ہی اس خصوصی تقریب میں حصہ لیا۔ واپس ٹوکیو پہنچے تو اسی پلیٹ فارم سے جوتے پہنے اور اپنے اپنے گھروں کو لوٹ گئے۔

میجی مندر سے نکلتے نکلتے شام ڈھل چکی تھی ویسے بھی درویش دوم اور مجھے شام کا شدت سے انتظار تھا تاکہ ہم دونوں ہوٹل پہنچ کر درویش اول کی گت بنا سکیں۔ مگر جب ان دونوں سے مندر کے باہر ملاقات ہوئی تو درویش دوم کی دھمکی کے سبب درویش اول موم اور مس کاتو موم بتی بنی ہوئی تھی۔ اس نے فوراً ہی ایک جاپانی ریستوران میں روایتی کھانے کی دعوت دیدی۔ جو ہماری سیر ہڑتال ختم کرنے کے لئے کافی تھی۔ گو مجھ پر کمینگی کا دورہ ابھی باقی تھا۔ لیکن کھانا بہرحال میری بھی کمزوری ہے۔

کھلے آسمان تلے ایک وسیع پارک میں یہ ریستوران واقع تھا۔ اس پارک کی خاص بات جو اب تک مجھے یاد ہے وہ یہ ہے کہ وہاں ہر سو جگنو ہی جگنو چمک دمک رہے تھے۔ اور جگنو بھی ہزاروں کی تعداد میں۔ جاپان میں ہر شے کی فراوانی کا احساس بہت شدت سے ہوتا ہے۔ مخلوق دیکھیں تو شہد کی مکھیوں کی طرح ہر جانب بھنبھناتی دکھائی دیتی ہے۔ سڑکوں پر کاریں دیکھیں تو وہ چیونٹیوں کی طرح نہ ختم ہونی والی قطاروں میں حد نظر تک پھیلی دکھائی دیتی ہیں' اب اس پارک میں جگنو دیکھے تو وہ بھی سیاہ رات کے سینے پر چنگاریوں کی بارات بنے دکھائی دیئے۔ اس رستوران میں ہر میز خود کفیل کچن تھا۔ یعنی میز پر گیس کا چولھا اور ہر چولھے پر ابلتے تیل کی کڑاہی اور کچا

راشن۔ راشن میں سبزیاں بھی تھیں' گوشت بھی اور مچھلیاں بھی۔ ان مچھلیوں میں دو ایسی قسم کی مچھلیاں بھی تھیں جو خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان میں ایک تو سوشی مچھلی تھی۔ جسے کڑاہی میں ابلتے سویابین کے تیل میں پکانے کی چنداں ضرورت نہ تھی۔ بلکہ بگلے کی طرح اسے کچا ہی نگلنا تھا۔ درویش اول تو سوشی مچھلی آنکھ جھپکائے بغیر ہی نگل گیا۔ درویش دوم نے وہ مچھلی نگلی تو ضرور مگر شکل ایسی بری بنائی کہ اسے دیکھنے کے بعد مجھ میں تو وہ مچھلی نگلنے کی ہمت نہ رہی۔ چنانچہ میں نے اپنی میزبان سے یہ بہانہ کر کے جان چھڑائی کہ میرے مذہبی عقیدے کے لوگ مچھلی نہیں کھاتے۔ جس پر مس کاتو نے حیران ہو کر پوچھا۔ "کیا تم مسلمان نہیں؟" "جی مسلمان تو ہوں مگر ...." میں مسلمانوں کے مختلف فرقوں کے بارے میں بتانا ہی چاہتا تھا کہ درویش دوم نے عقلمندی کا ثبوت دیتے ہوئے میری بات کاٹ کر مس کاتو کا دھیان میز پر رکھے راشن میں لگا دیا۔ مس کاتو نے دوسری مچھلی کی تعریف سنائی تو دونوں درویشوں کے پسینے چھوٹ گئے۔ "یہ جاپان کے شمالی سمندروں کی مچھلی ہے .... جو یہاں کی لذیذ ترین مچھلی سمجھی جاتی ہے .... البتہ اس مچھلی کو کھاتے وقت یہ بات جان لینا ضروری ہے کہ لاکھوں میں سے کسی ایک کے پتے کا زہر رہ جاتا ہے .... جسے کھانے سے یہ مچھلی کھانے والا میز پر ہی دم توڑ دیتا ہے ...." درویش اول کو تو اپنے نئے نویلے عشق کا بھرم رکھنا تھا۔ مگر درویش دوم پر تو قیامت ٹوٹ پڑی۔ کیونکہ نہ وہ مچھلی کھانے سے انکار کرسکتا تھا اور نہ ہی مچھلی کھانے کا رسک لے سکتا تھا۔ ویسے درویش اول کی خنداں پیشانی پر بھی خوف کے موتی جگنو بن کر چمکنے لگے ۔ میں نے اپنی رقابت کا بدلہ لینے کے لئے اپنے حصے کی وہ مشکوک مچھلی بھی درویش اول کی پلیٹ میں ڈال دی۔ جس پر درویش اول نے مجھے ایک لچھے دار سرائیکی گالی سے نوازا اور میز کے نیچے سے کک بھی لگانے کی کوشش کی جو درویش دوم کو لگی۔ درویش دوم نے جوابی حملہ کرتے ہوئے اسے ایک پشتو "پھکڑ" سنایا۔ مگر مس کاتو نے ان دونوں کی دشواریاں دور کر دیں۔ اس نے وہ مچھلی ہٹا کر گوشت کے ٹکڑے سلاخوں میں پروئے اور ابلتے تیل میں

ڈال دیئے۔ میں تو اپنے مذہبی عقیدے کا سہارا لیکر ٹماٹر کھیرے اور دوسری سبزیاں تل کر کھاتا رہا۔ کیونکہ ان میں نہ پتا ہوتا ہے اور نہ زہر۔ مگر رقابت کا زہر میری رگ رگ میں گھل رہا تھا اور میں متواتر گیس کا چولہا پھٹنے کی دعائیں مانگتا رہا۔ مگر آگ جلتی رہی' تیل ابلتا رہا' گوشت پکتا رہا' درویش کھاتے رہے۔ چولہا سلامت رہا۔ چولہا سلامت رہے۔ دوست زندہ رہیں اور میں شرمندہ رہوں۔

آدھی رات کا سماں تھا۔ درویش دوم کے خوفناک خراٹے ہمارے مختصر سے کمرے میں گونج رہے تھے۔ میں مس کاتو کی بے وفائی کے کرب میں کروٹیں بدل رہا تھا کہ ہمارے دروازے پر دستک ہوئی۔ میرے خوش فہم ذہن نے لمحے بھر کے لئے سوچا کہ شاید مس کاتو ہوگی۔ میں نے لپک کر دروازہ کھولا تو سامنے ایک سہما سہما سا جاپانی کھڑا تھا۔ اس نے اپنی شکستہ انگریزی اور اشاروں سے بتایا کہ ہمارے کمرے سے اٹھتے ہوئے ہنگامے نے اس کی نیند اچاٹ کر کے رکھ دی ہے۔ درویش دوم کے خراٹے تو صرف کمرے تک ہی محدود تھے۔ البتہ جب وہ اپنے ڈیڑھ فٹ چوڑے پلنگ پر کروٹ بدلتا تو اسکی بھرپور ٹانگ ٹکرانے سے مہین سی دیوار بھی ہل جاتی اور دوسرے کمرے میں لیٹا پڑوسی بھی۔ چنانچہ اس معصوم جاپانی کی خاطر میں نے اپنے تکیے درویش دوم کے پلنگ سے لگی دیوار کے ساتھ چن دیئے تاکہ اسکی ٹانگ ٹکرانے سے نہ دیوار لرزے اور نہ جاپانی۔

جاپان میں ویسے تو چار ہزار کے لگ بھگ چھوٹے بڑے جزیرے ہیں۔ جن میں چند ایک کے لئے جذباتی جھگڑا تو انہوں نے روس کے ساتھ بھی کر رکھا ہے کہ روس نے وہ جزیرے دوسری جنگ عظیم میں جاپانیوں کی شکست کے بعد ان سے ہتھیا لئے تھے۔ جو وہ یقیناً روس سے واپس بھی لے لیں گے' چاہے انہیں وہ خریدنے ہی پڑیں۔ مگر درحقیقت جاپان میں کام کے چار ہی جزیرے ہیں جن پر پورا ملک آباد ہے۔ اور ان چار جزیروں میں بھی کوئی سو کلو میٹر کا وہ صنعتی علاقہ ہے جس میں پورے ملک کی دوتہائی آبادی سمائی ہوئی ہے۔ آبادی کے اس حیرت کدے کو دیکھنے کی خاطر ہم نے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ٹوکیو سے اوساکا کے لئے ہوائی سفر ترک کر کے بلٹ ٹرین کا ٹکٹ کٹوایا۔ مگر ہماری روانگی میں تو ابھی چوبیس گھنٹے باقی تھے اور وہ چوبیس گھنٹے ہمارے لئے قیامت کی گھڑیاں بن گئے۔

ہماری گائیڈ مس کاتو گنسزا میں یاماہا میوزک سٹور پر کام کرتی تھی۔ چونکہ اسکی چھٹیاں ختم ہوچکی تھیں اس لئے اسے کام پر جانا تھا' مگر اپنے بھونڈے عاشق درویش اول سے ملنا بھی ضرور چاہتی تھی۔ اس لئے اس نے ہمیں لالچ دیا کہ اگر ہم لوگ اس کے سٹور پر آئیں گے تو وہ ہمیں پاکستانی گانے کی کیسٹ سنوائے گی۔ کچھ عرصہ انسان دیس سے دور رہے تو اپنی زبان میں گالیاں بھی اچھی لگتی ہیں۔ وہ تو پھر گانے سنوانے کا وعدہ کر رہی تھی۔ اور وہ وعدہ اس کا سچا بھی تھا۔ کیونکہ یاماہا کمپنی والوں نے ایک مرتبہ انٹرنیشنل سانگ فیسٹیول کروایا تھا' جس میں ملکہ ترنم نور جہاں نے پاکستان کی نمایندگی کی تھی۔ اور انہوں نے لال شہباز قلندر کی دھمال لہک لہک اور لچک لچک کر گائی تو ہال میں بیٹھے جاپانی وجد میں آگئے تھے۔ یاماہا سٹور میں وہ گانا سن کر ہم لوگ بھی وجد میں آگئے اور وطن کی یاد ستانے لگی۔ مگر درویش اول کے پاؤں میں عشق کی زنجیر تھی۔ جس کا وزن لحہ بہ لحہ بڑھتا چلا جا رہا تھا اور لمبائی لحہ بہ لحہ گھٹتی چلی جا رہی تھی جو بڑے ہی خطرے کی بات تھی۔ کیونکہ پردیس میں کئے گئے عشق اکثر جان لیوا ہوتے ہیں' اور عشق بھی جاپان میں .... جاپانی لڑکی کے ساتھ .... جو ہارا کیری یعنی خود کشی کو جدائی پر ترجیح دیتی ہیں۔ خیر ابھی تو خود کشی کا کوئی خطرہ نہ تھا۔ کیونکہ درویش اول یاماہا سٹور میں ایک بزنس مین کے روپ میں موجود تھا' جو پاکستان میں جاپانی میوزک کا سامان امپورٹ کرنے کی غرض سے بزنس ٹرپ پر جاپان میں آیا تھا۔ چونکہ مس کاتو اس کے اس ڈرامے میں برابر کی شریک تھی' اس لئے اس نے سٹور کے مینجر کو درویش اول کے دربار میں حاضر کر رکھا تھا۔ بزنس کے لالچ میں یاماہا سٹور کے مینجر نے درویش اول کو کھانے کی دعوت دی جس میں ظاہر ہے مس کاتو بھی شامل تھی۔ مگر ہم دونوں کا اس دعوت سے پتا کٹ گیا۔ جس پر درویش دوم نے خوب پیچ و تاب کھائے۔

جاپان میں بزنس کرنے کا یہ بہت قدیم اور اچھوتا اصول ہے کہ وہ غیر ملکی گاہکوں کی بے شرمی کی حد تک خدمت کرتے ہیں۔ جسکے لئے انکی کمپنیاں بھاری رقمیں مخصوص کرتی ہیں۔ جاپانی بزنس مین خود بھی جب کسی دوسرے ملک میں تجارت کے لئے جاتے ہیں تو اسی قسم کی خدمات کی توقع رکھتے ہیں۔ اس قسم کی خدمت کو وہاں بزنس کا اہم جزو سمجھا جاتا ہے۔ چونکہ اس مخصوص خدمت کے لئے باقاعدہ تربیت یافتہ لڑکیوں کی ضرورت ہوتی ہے' اس لئے روایتی گیشا کی اہمیت اور بھی بڑھ گئی ہے۔

شمشیر و سناں اول طاؤس و رباب آخر

علامہ اقبال کا یہ مصرع دنیا کی ہر قوم پر صادق آتا ہے۔ جاپان میں جب شوگن اور سامرائی جنگجو بہادروں کا دور تھا تو انکی دلجوئی کے لئے گیشا یعنی ہنرمند خاتون کی روایت پڑی اور وہ روایت اب تک جوں کی توں باقی ہے۔ کم سن بچیاں' ماں باپ کی غربت یا کسی اور ستم کا شکار ہو کر گیشا گھروں تک پہنچ جاتی ہیں۔ جہاں تجربہ کار مماسین انہیں موسیقی' سنگیت' رقص' رہن سہن' چال ڈھال اور دوسرے دلجوئی کے فنون لطیفہ سے آراستہ کرتی ہیں۔ تربیت کے دوران انہیں مائیکو کہا جاتا ہے۔ ہمارے لئے گیشا کوئی نئی چیز نہیں کیونکہ ہماری تہذیب کی طوائف کو بھی انہی حالات میں اور اسلوب پر تربیت دی جاتی ہے۔ اصولی طور پر نہ تو گیشا جسم فروش ہوتی ہے اور نہ ہی طوائف۔ دونوں ہی مردوں کی دلجوئی کے فن میں یکتا ہوتی ہیں۔ مثلاً" جاپان کی روایتی ٹی سرمنی یعنی چائے پینے کو ایک خوبصورت مظاہرے اور شو میں بدل دیا گیا ہے۔ چائے تو بندہ بھا شیدے کے ہوٹل پر بھی پی سکتا ہے۔ مگر جب گیشا کے ہاتھ سے چائے کا پیالہ ملے تو چائے امرت بن جاتی ہے۔ درحقیقت چائے تو وہی کمینی سی چائے ہے مگر جب اسے جاپان کی ٹی سرمنی میں پیش کیا جاتا ہے تو دلہن کی طرح .... ناز و ادا کے ساتھ۔ ٹی سرمنی مہمانوں کے مجمع میں نہیں کی جاتی بلکہ چند مہمانوں کے لئے علیحدہ علیحدہ انتظام کیا جاتا ہے تاکہ ہر ایک کی پرائی ویسی بھی محفوظ رہے اور خصوصی توجہ بھی دی جا

سکے۔ تاتا مائی، چٹائی کا فرش اور شوجی یعنی موی کاغذ کی دیواریں .... کیمونو میں ملبوس .... چہروں پر سفید میک اپ کی اتنی موٹی تہیں کہ جلد پورسلین کی طرح دکھائی دیتی ہے .... بال بھی کچھ اس انداز سے بنائے جاتے ہیں گویا وہ بال نہ ہوں بلکہ خوبصورت تاروں کا جال ہو جس میں رنگ برنگ پھول اور ربن سجے ہوں .... ان کاغذ کی دیواروں میں جب گیشا آتی ہے تو ہوا کے جھونکے کی طرح .... ہر سو خوشبو بھی پھیل جاتی ہے اور رنگ بھی بکھر جاتے ہیں .... چینکوں کی چھنک .... پیالوں کی کھنک .... دھیمے لہجے میں چہک .... بس اک سماں سا بندھ جاتا ہے' اور یہی اس سرمنی کا حسن ہے۔ کچھ یہی ماحول طوائف کے کوٹھے پر بھی ہوتا ہے۔ پان تو مولا بخش بھی بیچتا ہے .... جہاں للاریوں کی طرح رنگے ہاتھ اور کتھے سے خون آلود جبڑوں والے لوگ آپکو پان تھماتے جاتے ہیں۔ مگر وہی پان جب طوائف پیش کرتی ہے .... تو چاندی کی طشتری .... گلاب کی پتیوں میں سجے پان کے پتے .... چاندی کے ورق میں لپٹی الائچیاں .... اور پکاسو کی پینٹنگ کی طرح رنگوں کی قوس قزح بناتے پان مسالے .... جھکی جھکی سیاہ پلکیں .... مہندی میں رنگا .... زیور میں سجا .... تراشا سا ہاتھ جب آداب بجا لا کر پان پیش کرتا ہے تو .... سماں تو بندھ جاتا ہے مگر پان بہرحال کوئی اتنی رومینٹک شے بھی نہیں .... کیونکہ پان چبانے سے آپکا خون آلود دہن نہ مسکرانے کے قابل رہتا ہے اور نہ کھانے کے۔

جاپان دنیا کا مہنگا ترین ملک .... ٹوکیو جاپان کا مہنگا ترین شہر اور گنزا اس شہر کا مہنگا ترین بازار ہے۔ یہاں زمین سنٹی میٹرز کے حساب سے بکتی ہے۔ لیکن اس مہنگائی کے باوجود یہاں ایسے جنرل سٹور بھی ہیں جو ایکڑوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ گو ان کا پھیلاؤ لمبائی چوڑائی کے بجائے اونچائی میں ناپا جاتا ہے۔ ایسے بازار میں تو ونڈو شاپنگ کرنے سے ہی دل بیٹھ بیٹھ جاتا ہے' مگر ہمارا شیر شاپنگ درویش دوم اس مہنگائی کی آگ میں بے خطر کود گیا اور کودنے سے پہلے مجھے ہوٹل پہنچ کر انتظار کرنے کا حکم نامہ جاری کر گیا۔ اس سفر میں پہلی مرتبہ میں نے بھی بغاوت کر دی اور فیصلہ کیا کہ ہوٹل جا کر انتظار تو ہرگز نہ کروں گا۔ چنانچہ میں نے اپنے ایک پرانے دوست سپیڈی سے فون پر رابطہ کیا اور حیرت کی بات ہے کہ وہ رابطہ ہو بھی گیا اور اس سے بھی بڑی حیرت کی بات تھی کہ سپیڈی نے سب کام چھوڑ چھاڑ کر مجھ سے ملنے کا وعدہ بھی کر لیا۔ اسکا اصل نام کیا تھا یہ تو کوئی بھی نہ جانتا تھا۔ کیونکہ اسکی سبک رفتاری کے سبب اسے یہ نام ملا تھا اور اب یہ نام اس سے اس طرح چپکا تھا کہ نہ تو اسے اس نام سے چھٹکارا مل سکتا تھا اور نہ ہی سپیڈ سے۔

سپیڈی ہماری طرح لاہور میں تو لفنگا ہی تھا مگر ٹوکیو میں وہ بڑی کام کی شے بن گیا۔ جاپان پہنچتے ہی سب سے پہلے تو اس نے ایک عدد جاپانی بیوی سنبھالی جو اس ملک میں باعزت زندگی گزارنے کے لئے ضروری بھی ہے اور مجبوری بھی ہے۔ کیونکہ جاپانی لڑکی سے اگر ایک مرتبہ آنکھ مٹکا ہو جائے تو وہ بڑے کو بڑے کے گھر تک ہی پہنچا کر لوٹتی ہے۔ ہماری لڑکیوں کی طرح ٹسوے بہا کر کسی اور کی ڈولی میں نہیں بیٹھ جاتی۔ جاپانی لڑکیوں کی اسی خصلت کے سبب میں درویش اول کے انجام سے خوفزدہ تھا۔ کاروبار کے سلسلے میں سپیڈی نے طلاق شدہ یعنی ریکنڈیشنڈ کاروں کا کام سنبھالا جو پاکستان میں عزت بحال کرنے کے لیے اشد ضروری تھا اور سچ پوچھیں تو مجبوری بھی تھا۔ کیونکہ سال میں ایک آدھ مرتبہ لاہور کے فٹ پاتھوں پر چکر لگائے بغیر اسکا گزارہ نہ تھا۔ اور یہاں قدم قدم پر کم بخت قرض خواہوں نے ڈیرے لگائے ہوئے تھے۔ چنانچہ اس نے اپنی ہی طرح کے دوسرے پاکستان سے بھگوڑے نوجوانوں کا ایک لشکر جمع کیا اور انہیں جاپان کے شہر شہر.... برائی کی طرح پھیلا دیا۔ وہ لوگ پہلے تو خستہ حال کاروں کو مختلف بوچڑ خانوں یعنی کباڑ خانوں سے اکٹھا کرتے ہیں۔ پھر پرزہ پرزہ جوڑ کر اس قابل بنا دیتے ہیں کہ وہ ڈھانچہ کار کہلا سکے۔ مگر جاپانی حکومت نے بھی کچی گولیاں نہیں کھیلیں۔ ویسے بھی تو کہتے ہیں نہ کہ ساحلوں پر آباد قومیں یا تو قزاق ہوتی ہیں یا تاجر۔ مگر جاپانیوں نے تجارت میں قزاقی کی ہے۔ وہ اس طرح کہ پہلے تو انہوں

نے اپنی کچرا نما کاروں کو بیچ کر ڈھانچے اٹھوانے کا مفت بندوبست کر لیا اور اس کے بعد یہ پابندی بھی لگا دی کہ کوئی گاڑی انسپکشن کے بغیر باہر نہیں بھیجی جاسکتی۔ چنانچہ سپیڈی جیسے سوداگروں کو مجبوراً" گاڑیاں ریکنڈیشن کرنی پڑیں اور اس طرح جاپانیوں نے کاروں کے فاضل پرزے بیچنے کا پکا پکا انتظام کر لیا۔ ریکنڈیشن ہونے کے بعد یہ گاڑیاں جاپان کی مختلف بندر گاہوں میں پہنچا دی جاتی ہیں۔ اکثر پاکستانی نوجوان تو اسی کام پر مامور ہیں۔ یعنی دن رات گاڑیاں چلاتے ہیں' گاڑیوں میں جاگتے ہیں اور گاڑیوں میں سوتے ہیں۔ جاپانی بندر گاہوں سے یہ گاڑیاں سیدھی دوبئی کا رخ کرتی ہیں' جہاں انہیں مسلمان کیا جاتا ہے۔ یعنی پاکستانی مزدوروں کے نام کر دی جاتی ہیں اور پھر گفٹ سکیم کے تحت پاکستان کی جانب ہچکولے کھاتی چل پڑتی ہیں۔ کسٹمز کی سفید دیوار کو رشوت کی کمند سے پار کرنا تو کوئی مشکل کام نہیں ... بچہ بچہ کرسکتا ہے۔ چنانچہ کراچی اور لاہور کے شوروموں میں جو بیوہ دلہنوں کی طرح گرد و غبار کی چادر میں منہ چھپائے گاڑیاں دکھائی دیتی ہیں وہ سپیڈی اور اس جیسے دوسرے سوداگروں کی تین چار ماہ کی انتھک محنت کے بعد یہاں تک پہنچتی ہیں اور ہاتھوں ہاتھ اٹھالی جاتی ہیں۔ اس طرح پاکستان میں بے کار پاکستانیوں کو گاڑیاں ملتی رہتی ہیں اور جاپان میں بیکار پاکستانیوں کی گاڑیاں چلتی رہتی ہیں

اس سفر میں یہ پہلا موقع تھا کہ تینوں درویش ایک دوسرے سے اس بے رخی سے جدا ہوئے کہ نہ ہی واپسی کا وقت بتایا اور نہ ہی دوبارہ ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ ویسے سفر طویل ہو جائیں تو تمام تر انسانی خود غرضیاں اور بے دردیاں کھل کر سامنے آجاتی ہیں اور شرافت کے آنگن میں چھپی کمینگیاں بے نقاب ہو جاتی ہیں۔ شاید سفر کی صعوبتیں ہم تینوں کے اعصاب پر اثر انداز ہو گئی تھیں' اور یہی وجہ تھی کہ ہم تینوں نے اپنی اپنی راہیں اختیار کیں اور ایک دوسرے سے جدا ہونے پر خوش تھے۔

گو میری خوشی کا سبب تو سپیڈی سے ملاقات بھی تھی۔ لیکن اس سے ملاقات ہونے پر خاصی مایوسی ہوئی۔ کیونکہ میں نے تو سوچ رکھا تھا کہ سپیڈی کسی ایسی سپورٹس کار میں سے اترے گا جسکا لشکارا جائے گا گلی گلی اور دوسرے درویش جلیں گے گھڑی گھڑی۔ مگر سپیڈی تو ہمیشہ کی طرف فٹ پاتھ کا شہزادہ نکلا۔ چنانچہ اپنی مایوسی کا اظہار کرتے ہوئے میں نے اس سے کہا۔ "یار سپیڈی لاہور کے فٹ پاتھوں نے تیرے ہاتھ پاؤں سے تنگ آکر بھوک ہڑتال کر دی تھی' اب ٹوکیو کی فٹ پاتھوں پر تو رحم کرو"۔ سپیڈی نے حسب عادت دیرینہ بڑے ہی رازدارانہ انداز میں کھسر پھسر کرتے ہوئے میرے کان میں گاڑی نہ لانے کی کوئی وجہ بیان کی جو گنڑا کے شور و غل میں بالکل پلے نہ پڑی۔ لیکن جان چھڑانے کیلئے میں نے فوراً اطمینان کا اظہار کر دیا اور ہم دونوں نے خالصتا" پنجابی انداز میں ملاپ کیا۔ یعنی پسلی توڑ "جپھہ' اور مجمع گیر پرسش احوال .... جس سے دل کی بھڑاس بھی نکل جاتی ہے اور پھیپھڑے کمزور ہوں تو سانس بھی۔ ہماری ملاقات ختم ہوئی تو ہم دونوں سہمے سہمے جاپانیوں کے گھیرے میں تھے۔ جن کی آنکھوں کی لکریں عینکوں کے شیشے کی دیوار کے پیچھے خوف سے مزید ترچھی ہو گئی تھیں۔ ہم نے

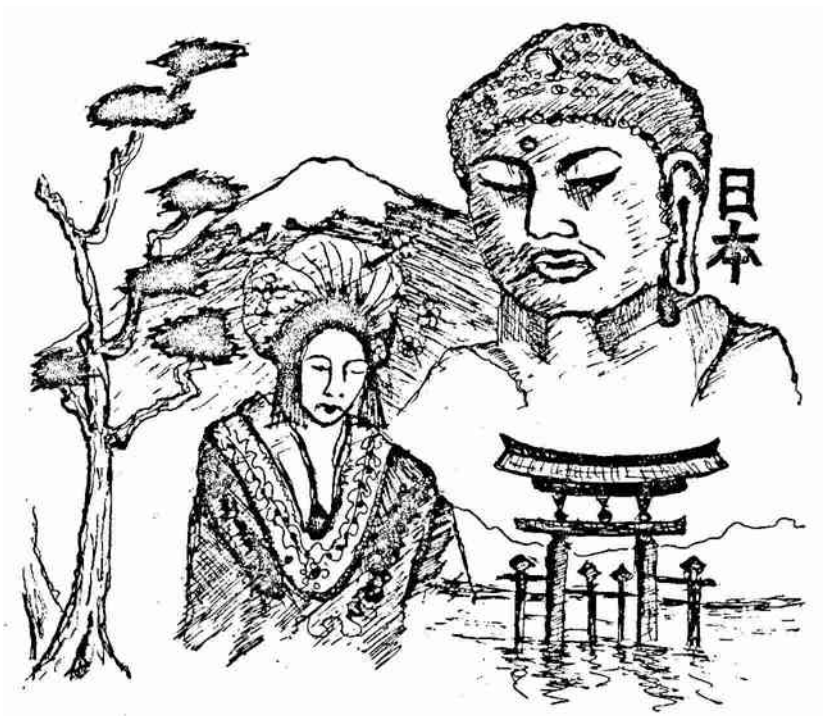

حیران و پریشان جاپانیوں کا گھیرا توڑا اور گنزا کے رنگوں میں گم ہو گئے۔

سالوں' مہینوں کی جدائی کے فاصلے ہم نے گھنٹوں میں طے کئے تو ایک ریستوران کا رخ کیا۔ سیاحوں کی سہولت کے لئے ریستوران والے شوونڈو میں ہر اس خوراک کا پلاسٹک ماڈل سجا دیتے ہیں جو اس ریستوران میں ملتی ہے - وہ ماڈل اس ہنر مندی سے بنائے جاتے ہیں کہ اصل نقل کا امتیاز ختم ہو جاتا ہے۔ اور کچھ عجب نہیں کہ اگر شوونڈو کے شیشے مضبوط نہ ہوں تو بھوک سے اندھے گاہک خوراک کے ماڈل کو ہی منہ مار دیں۔ ریستوران میں داخل ہونے کے بعد میز کی الاٹ منٹ کا باقاعدہ انتظار کرنا پڑتا ہے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ وہ لوگ جاپانیوں کو غیر ملکی گاہکوں کے مقابلے میں بہتر میز بھی دیتے ہیں اور بہتر سروس بھی۔ اسی طرح مصری بھی اپنے ہم وطنوں کو غیر ملکیوں پر ترجیح دیتے ہیں اور ہمیشہ اپنے ہم وطن کا ساتھ دیتے ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ قاہرہ میں مَیں نے ایک ریڑھی والے سے تربوز خریدا۔ گو مصری تربوز مصری کی طرح میٹھے ہوتے ہیں مگر اتفاق سے وہ تربوز پھیکا تھا۔ مَیں تو تربوز چکھنے کے بعد اپنی رائے کا اظہار کر رہا تھا مگر ریڑھی والا بغیر چکھے ہی بضد تھا کہ تربوز میٹھا ہے۔ مصریوں کو بھی پاکستانیوں کی طرح مجمعے لگانے کا شوق ہے' چنانچہ چند ہی لمحوں میں ہمارے گرد راہگیروں کا ہجوم تھا۔ اور تعجب کی بات ہے کہ بغیر چکھے ہر مصری بضد تھا کہ تربوز میٹھا ہے۔ چنانچہ ہم نے کھسیانا سا ہو کر ان کی ہاں میں ہاں ملائی اور پھیکے تربوز کو میٹھا مان کر لے گئے۔ سپیڈی چونکہ جاپانیوں کا داماد تھا اور انکی زبان بھی جانتا تھا چنانچہ بغیر طویل انتظار کے ہمیں میز بھی مل گیا اور پلاسٹک میں بند تولیہ اور پانی کا گلاس بھی۔ ٹوکیو کا موسم بھی کراچی کی طرح گرم اور تر یعنی مرطوب ہوتا ہے جسکے سبب چلنے پھرنے سے آدمی ادھ موا سا ہو جاتا ہے' اسی لئے گاہکوں کو تازہ دم کرنے کے لئے ریستوران والے خوشبودار گیلا تولیہ اور ٹھنڈے پانی کا گلاس تو فورا ہی مہیا کرتے ہیں۔

چاپ سٹک سے کھانا کھانا میرے لئے تو بڑا ہی صبر آزما کام تھا۔ البتہ سپیڈی نے کمال مہارت حاصل کر لی تھی۔ تسبیح کے منکوں کی طرح وہ تو چاول کا ایک ایک دانا چاپ سٹک کی مدد سے ہوا میں لہراتا اور وہ چاول کے دانے قطار در قطار خود بخود اس کے منہ میں پہنچ جاتے' گویا اسکے منہ میں مقناطیس لگا ہو۔ ادھر ہم تھے کہ چاول' چاپ سٹک اور انگلیوں کی کشمکش کا شکار تھے۔ جب منہ کھولتے تو چاول نہ پہنچتے اور جب کبھی ایک آدھ دانہ چاول کا اٹھتا تو جبڑے تھکنے کی وجہ سے منہ بند ہو جاتا۔ چنانچہ چاپ سٹک کو سمیٹ کر ہم نے سوونیر کے طور پر رکھ لیا اور پنجوں سے پلیٹ پر دھاوا بول دیا۔ اب کیا مجال کہ چاول کا ایک دانہ بھی ہمارے ہاتھ سے بچ نکلتا .... لمحے بھر میں پلیٹ خالی تھی اور پیٹ فل ....

پیٹ بھر جائے تو طبیعت میں فتور آنا یقینی ہے۔ چنانچہ میں نے باتوں باتوں میں جاپان کی رنگین راتوں کا تذکرہ کیا۔ سپیڈی پاکستانی مہمانوں کی خصلت سے اچھی طرح واقف تھا کہ ہم لوگ صرف دکھاوے کے لئے شرافت کے لبادے اوڑھتے ہیں' اسلام کے مائین بورڈ لٹکا کر مذہب کی ہٹی چمکاتے ہیں اور موقع پاتے ہی خونخوار بھیڑیئے بن جاتے ہیں۔ کیونکہ یہی ہمارا اصلی روپ اور قومی مزاج ہے۔ اسی لئے سپیڈی نے میری فتور پسند طبیعت کی تسلی کے لئے کہا۔ "یار غم نہ کرو۔ آج رات تمہیں فل عیاشی کرواؤں گا .... میں تمہاری بھابی کو بتا آیا ہوں کہ پاکستان سے میرا جگری یار آیا ہے۔ اس لئے کل صبح ہی گھر لوٹونگا۔" جاپانی بھابی نے پاکستانی جگری یاروں کے بارے میں کیا سوچا ہوگا؟ لمحہ بھر کے لئے میں نے سوچا۔ مگر میرے قومی کردار نے فورا ہی میرے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے تسلی دی۔ "پاکستانیوں کے بارے میں وہ جو بھی سوچتی ہے سوچنے دو۔ تمہاری صحت پر بھلا کیا اثر پڑتا ہے .... تم اپنا الو سیدھا کرو اور جاپان سے چلتے بنو۔" گنزا کے شور کے باوجود ایک اور سوچ نے میرے ضمیر کے دروازے پر ہلکی سی دستک دی۔ "شرم کرو! تمہاری ذاتی خود غرضی تمہیں ملک کی عزت سے زیادہ عزیز ہے کیا؟" میرے خوابیدہ ضمیر نے انگڑائی لی اور کروٹ بدل کر سو گیا اور میرے قدم نصیحتوں کو روندتے' گناہوں کی منزل کی طرف بڑھتے بڑھتے شنجوکو سٹیشن

تک جا پہنچے۔

ٹوکیو کا شنجوکو' زمین دوز ریلوے سٹیشن دنیا کا مصروف ترین ریلوے سٹیشن ہے۔ ایک اندازے کے مطابق اسکے پلیٹ فارم ہر صبح دفتر کھلنے سے پہلے اور شام دفتر بند ہونے کے بعد چھتیس لاکھ مسافروں کی گزرگاہ ہوتے ہیں - ویسے بھی ٹوکیو کے بارے میں مشہور ہے کہ چھٹی کے دنوں کے علاوہ اس شہر کی آبادی دن کے وقت دگنی ہو جاتی ہے' کیونکہ گردونواح میں میلوں دور بسنے والے لوگ ٹرینوں پر تین تین گھنٹوں کی مسافت طے کر کے ہر صبح ٹوکیو آتے ہیں اور کام ختم کر کے ہر شام اپنے گھروں کو لوٹ جاتے ہیں۔ اسی لئے ٹرینیں سارڈین مچھلی کے ڈبوں کی طرح ہر وقت کھچا کھچ بھری رہتی ہیں۔ اور ڈبے کی چھت سے لٹکے ہینگروں کو تھامے لوگ اونگھتے اونگھتے سفر جاری رکھتے ہیں۔ کام سے تھکے جسم .... مردانہ اور زنانہ جسم .... بے حس اور بے حرکت جسم .... ایک دوسرے سے ٹکراتے جاتے ہیں اور یہ زندہ لاشیں صرف اسی وقت حرکت میں آتی ہیں جب ان کے مخصوص ریلوے سٹیشن آتے ہیں۔ اس صنعتی ملک کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ یہاں انسان کل پرزوں کی طرح کام کرتے ہیں اور اس شدت سے کام کرتے ہیں کہ اب وہاں کاروشی کا مہلک مرض پھیل گیا ہے جس سے تقریباً" دس ہزار اموات ہر سال واقع ہوتی ہیں۔ اور ان اموات میں دن بدن اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ کیونکہ یہ بیماری وہاں لا علاج ہو گئی ہے۔ کاروشی کا مرض کام کی شدت کے سبب پھیلتا ہے اور اس کے مریض سالانہ تین سے ساڑھے تین ہزار گھنٹے کام کرتے ہیں۔ جبکہ امریکہ میں کام کرنے کی سالانہ اوسط اٹھارہ سو گھنٹے اور یورپ میں پندرہ سو گھنٹے ہے۔ پاکستان میں کاروشی کے مہلک مرض کا کوئی خطرہ نہیں۔ گو ہمارے کارندے جاپانیوں کے اس سالانہ ہدف سے کہیں زیادہ کام کرنا چاہتے ہیں' مگر ہمارے ہاں شادی بیاہ' موت جنازے' روزہ نماز' عید بکر عید' بڑے افسروں کی خاطر مدارات اور بجلی' گیس کے بل چکانے میں اتنا وقت بسر ہو جاتا ہے کہ ڈیوٹی پوری کرنے کے لئے سالانہ صرف چھ سات سو گھنٹے ہی بچتے ہیں - جن میں سے یونین کے اہم کاموں کے لئے بھی وقت نکالنا پڑتا ہے اور ہڑتالیں بھی کرنی ہوتی ہیں ....

سینزوکو میں جسموں کا جمعہ بازار سا سجا تھا۔ مگر ٹوکیو بہرحال بنکاک نہیں۔ یہاں سب کاروبار تو بنکاک والا ہی ہوتا ہے مگر شوجی یعنی موی کاغذ کی دیوار کے پیچھے' تاکہ گاہکوں کے راز صیغہ راز میں رہیں۔ اونچے گیشا گھروں میں تو اس بات کا اس حد تک خیال رکھا جاتا ہے کہ کوئی گاہک نہ اسوقت تک گیشا گھر میں داخل ہو سکتا ہے اور نہ ہی گھر سے باہر نکل سکتا ہے جب تک گیشا گھر کی انتظامیہ یہ یقین نہ کر لے کہ دو مہمانوں کا آمنا سامنا نہیں ہوگا۔ اسی لئے تو ایسے گیشا گھروں میں ایک شام گزارنا پجیرو گاڑی کی قیمت سے کہیں زیادہ ہے۔ اور ایسی جگہوں میں داخلے کے لئے یہ بھی لازمی ہے کہ آپ کسی جاپانی کے مہمان ہوں اور جاپانی بھی ایسا کہ جو کسی بڑی سی کمپنی میں بڑے سے عہدے پر فائز ہو۔ کیونکہ یہ جگہیں عام تام جاپانی کی پہنچ سے باہر ہیں۔ جاپانی عام ہو یا خاص' ہوتا بہت عیاش ہے۔ وہاں مرد کو سات خون معاف ہیں۔ ہر جاپانی جس کی جیب گرم ہو اور سانس چلتی ہو وہ داشتہ رکھتا ہے۔ کیونکہ رکھیل رکھنا وہاں قابل فخر بات ہے۔ جاپانی میاں بیوی ڈبل بیڈ پر اکٹھے نہیں سوتے۔ شاید اس لئے کہ جب تک میاں شراب اور شباب خانوں سے واپس لوٹتے ہیں' بیویاں طویل انتظار کے کرب سے گزر کر نیند کی گولیوں سے ڈر کر کے غافل سو جاتی ہیں۔ بہرحال جاپانی مردوں کے مقابلے میں انکی بیویاں بہت وفاشعار ہوتی ہیں۔

شوگن نامی اس گیشا گھر میں سپیڈی کی بڑی عزت تھی اور عزت ہوتی بھی کیوں نا! کیونکہ اپنی عزت بچانے کی خاطر سپیڈی کو ہر لاہوری جگری یار کو یہاں لانا پڑتا تھا۔ پھر لہوریوں کی تو یہ خصلت ہے کہ مطلب کے لئے جگری یار اور مطلب نکلتے ہی یار مار بن جاتے ہیں۔ ادھر جاپانیوں کی یہ روایت ہے کہ اپنے پرانے گاہکوں کی ہر حال میں بڑی عزت کرتے ہیں۔ چنانچہ سپیڈی جب وہاں کے کسی ملازم سے بات کرتا تو وہ ملازم پہلے ادب سے زمین پر بیٹھ جاتا اور پھر آنکھیں جھکائے جھکائے اس سوال کا جواب دیتا۔ اسی طرح جو دو گیشا لڑکیاں ہماری خدمت میں آئیں وہ بھی سپیڈی سے

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

ایسے ملیں جیسے گڑھی شاہو سے مائیگریٹ کر کے آئی ہوں۔ انکا لباس اور میک اپ تو پکا پکا گیشا والا تھا البتہ نہ جلد جاپانی تھی اور نہ شکلیں۔ ویسے نہ تو ان دونوں کی جلد میں کوئی خرابی تھی اور نہ ہی شکلوں میں۔ بلکہ ہلدی رنگت جاپانی جلد اور ترچھی لکیروں سی آنکھوں والی جاپانی بیبیوں سے تو یہ بیساں کہیں زیادہ خوبصورت تھیں۔ اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ یہ دونوں جاپانی لڑکیوں کے برعکس بھرپور جسم بھی رکھتی تھیں۔ سپیڈی نے انکشاف کیا کہ وہ دونوں لڑکیاں فلپائین کی رہنے والی تھیں۔ بلکہ اکثر گیشا گھروں میں اب غیر ملکی لڑکیاں ہی کام کرتی ہیں۔ کیونکہ جاپانی قوم بھی ہماری طرح دہرے سٹینڈرڈ کی قائل ہے۔ وہاں کے مرد خود تو غیر ملکی لڑکیوں کو جاپانی لڑکیوں پر ترجیح دیتے ہیں لیکن یہ نہیں برداشت کرتے کہ جاپانی لڑکیاں غیر ملکی مردوں سے ملیں جلیں۔ چنانچہ اصل جاپانی گیشا صرف ان مخصوص جگہوں پر کام کرتی ہیں جہاں تک صرف جاپانیوں کی رسائی ہے۔ گیشا تو گیشا جاپانی مرد تو یہ بھی بڑی مشکل سے برداشت کرتے ہیں کہ کوئی غیر ملکی مرد جاپانی لڑکی سے شادی کر لے۔ اور ایسی شادیوں میں اکثر پنجابی فلموں کے سین دہرائے جاتے ہیں۔ "اوئے! ایہہ شادی نئیں ہو سکدی ...."

"ککڑ کی بانگ ویلے' سپیڈی کے ہمراہ واپس ہوٹل پہنچا تو دیکھا کہ میرے بستر پر درویش دوم کی شاپنگ کا سامان سجا ہوا تھا اور وہ خود اپنے بستر سے اور کمرے سے غائب تھا۔ میں نے پریشان ہو کر درویش اول کے کمرے میں فون کیا تو وہاں سے درویش دوم نے جواب دیا ۔ جواب کیا دیا فوراً وہاں پہنچنے کا حکم دیا۔ چنانچہ میں نے سپیڈی کو ساتھ لیا اور فل سپیڈ سے درویش اول کے کمرے میں پہنچے تو وہاں نقشہ ہی کچھ اور تھا۔ درویش اول دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا اور اسکے پہلو میں مس کاتو زلفیں پھیلائے منہ لٹکائے بیٹھی تھی اور ان دونوں کی آنکھوں سے آنسوؤں کی آبشاریں رواں تھیں۔ درویش دوم کے سپاٹ چہرے پر خوف و پریشانی کی حکمرانی تھی۔ میں نے اپنی بٹن نما آنکھوں سے سوالیہ اشارہ کیا تو وہ مجھے کمرے سے باہر لے گیا۔

سپیڈی کو نظر انداز کرتے ہوئے درویش دوم نے کہا۔ "یار ہم لوگ بڑی مصیبت میں پھنس گئے ہیں۔ وہ لڑکی تو بالکل پاگل ہے .... اس نے دھمکی دیدی ہے کہ وہ درویش اول کو کسی قیمت پر بھی ٹوکیو سے نہیں جانے دیگی...." "او ہو' تو اس میں پریشانی کی کیا بات ہے یار .... درویش اول کو اسی لڑکی کے پاس چھوڑ جاتے ہیں .... ہم اس صورت کا ماڈل ڈیرہ غازی خان سے اور منگوا لیں گے ...." میں نے لاپروائی سے کہا۔ مگر درویش دوم کسی قسم کے مزاح کے موڈ میں ہرگز نہ تھا۔ چنانچہ اس نے ڈانٹتے ہوئے کہا۔ "بیوقوف کسی وقت تو عقل بھی استعمال کر لیا کرو .... اصل مسئلہ اس کو چھوڑنے کا نہیں ہے۔ اس ایڈیٹ نے جذباتی ہو کر مس کاتو سے وعدہ کر لیا ہے کہ وہ دونوں مل کر ہارا کیری یعنی خودکشی کریں گے .... اور انہوں نے یہ فیصلہ بھی کر لیا ہے کہ جس بلٹ ٹرین پر ہم لوگ اوساکا کے لئے سفر کرنے والے ہیں وہ دونوں اسی ٹرین کے نیچے آکر ہارا کیری کریں گے۔" میں نے تو اللہ کا شکر ادا کیا کہ مس کاتو کو درویش اول سے عشق ہوا' کہیں میری کوشش کامیاب ہو جاتی تو ان دونوں درویشوں نے خود ہی مجھے ٹرین کے نیچے دھکیل دینا تھا۔

سپیڈی نے درویش دوم کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "فکر کی بات نہیں یار۔ اس طرح کے ڈرامے تو یہاں روز ہوتے ہیں۔ ابھی مسئلہ حل کر دیتا ہوں۔" گو سپیڈی خود ہارا کیری کے ہاتھوں شکست کھا کر جاپانی لڑکی سے شادی کر بیٹھا تھا' مگر اب وہ اتنا ہوشیار ہو گیا تھا کہ ایسے کئی مسئلے ایک ہی جھٹکے میں حل کر سکتا تھا۔ چنانچہ کچھ ایسا ہی ہوا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی سپیڈی نے جاپانی زبان کا جاپانی زن پر حملہ کیا اور ہوٹل کے کمرے کو پانی پت کے رن میں بدل دیا۔ وہ غم میں ڈوبی افسردہ لڑکی جنگلی بلی کی طرح سپیڈی پر ہوائی وار کرنے لگی۔ درویش اول کاٹھ کا الو بنا کبھی سپیڈی کو دیکھتا اور کبھی مس کاتو کو۔ اسکی آنکھوں سے بہتی آبشاریں جو یقیناً ہارا کیری کے خوف سے جاری تھیں' بند ہو گئیں اور اس نے ہمارے ساتھ جانے کے لئے سامان سمیٹنا شروع کیا۔ سپیڈی اور مس کاتو کی دھواں دھار جنگ سرد پڑتی گئی اور جب تک ہم تینوں

ٹیکسی میں بیٹھ کر ریلوے سٹیشن کی طرف روانہ ہوئے تو جدائی کے غم میں ہارا کیری کرنے والی بی بی کا ایک ہاتھ سپیڈی کے ہاتھ میں تھا اور دوسرا ہاتھ ہلا ہلا کر ہمیں الوداع کہہ رہی تھی۔

شکانسین بلٹ ٹرین دو سو کلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے راہ آہن پر گولی کی طرح اوساکا کی جانب دوڑتی چلی جا رہی تھی۔ درویش اول قد آدم کھڑکی کے سامنے آرام دہ سیٹ پر بھی بے چین سا لگ رہا تھا۔ اس جاپانی جٹی نے اسکے ایسے چھکے چھڑائے تھے کہ اسکی سب رنگین مزاجی خاک میں ملا دی۔ شاید اسی لئے وہ کمپارٹمنٹ میں سجی بسی رنگینیوں کی نسبت کھڑکی کے باہر آلودگی میں بسے شہر ٹوکیو کو تکتا جا رہا تھا۔ جسکی اژدہا نما عمارتیں بڑی تیزی سے پیچھے ہی پیچھے چلی جا رہی تھیں۔ درویش دوم ایک سردار جی کے پہلو میں فٹ تھا۔ یہ سردار جی بھی بڑے جفاکش ہوتے ہیں۔ دنیا کے ہر کونے میں ملتے ہیں اور ہر حال میں ملتے ہیں۔ اس سفر میں سردار جی اور درویش دوم کا ملاپ بھی بہت خوب تھا۔ کیونکہ دونوں ہی بالوں کے بادشاہ تھے۔ گویا اس سیٹ پر بالوں کا ایک جنگل سا اگا ہوا تھا۔ ادھر بیچارے جاپانی مرد ٹھہرے بے بال و پر۔ ان کے لئے یہ دونوں بہت بڑا عجوبہ تھے اور مجھے یقین ہے کہ اگر ان کی نمائش کا خاطر خواہ بندوبست کر لیا جائے تو ہم سب مال سے مالا مال ہو جائیں۔ میرے سامنے والی سیٹ پر کیمونو میں ملبوس ایک معمر خاتون تھی۔ جسکی وراڑ نما آنکھیں پیپر ویٹ جیسے دبیز شیشوں کے پیچھے مسلسل حیرانی کا مظہر تھیں۔ ان آنکھوں میں حیرانی' حیران کن ہرگز نہ تھی۔ کیونکہ ان آنکھوں نے ۱۹۲۳ء کا زلزلہ اور اس زلزلے کے سبب آگ اور آگ میں تڑپتی جوانیاں اور راکھ میں ڈھکا ٹوکیو دیکھا ہوگا۔ ۱۹۴۶ء میں شہنشاہ ہیرو ہیٹو کو بھگوان سے انسان بنتے دیکھا ہوگا۔ ۱۹۴۵ء میں ہیرو شیما اور ناگا ساکی پر ایٹم بم کی تباہی کا منظر دیکھا ہوگا۔ وحشی امریکنوں کو ۱۹۵۲ء تک جاپان کی نازک تہذیب کو کچلتے دیکھا ہوگا اور اب جاپان کی بلٹ ٹرین میں جاپانی معیشت کا چڑھتا سورج دیکھ رہی ہوگی۔ میں نے ان دور اندیش نگاہوں کی طرف دیکھا اور احترام سے اپنی نگاہیں جھکا لیں۔ ویسے ان جاپانیوں کی عمر کا صحیح اندازہ لگانا بڑا ہی مشکل کام ہے۔ کیونکہ بڑھاپے کی دو چیزیں تو جاپانیوں کو ورثے میں ملتی ہیں۔ پہلی عینک' جو بچہ پیدا ہوتے ہی اسکے کان میں اذان سنانے کی بجائے اسکی آنکھوں پر چڑھا دی جاتی ہے اور دوسری جھکی جھکی کمر' جو دن بھر نیم رکوع کی حالت میں رہنے کے سبب کمان بن جاتی ہے۔ یوں جب بچے' بوڑھے اور جوان عینک لگائے کمر جھکائے پھر رہے ہوں تو صحیح عمر کا اندازہ بھلا کیونکر ہو سکتا ہے۔ یہ چھتریاں اور عینکیں تو ہر جاپانی کا اٹوٹ انگ سا بن کر رہ گئی ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اگر کوئی جاپانی شاعر یہ شعر کہتا

چند تصویر بتاں چند حسینوں کے خطوط
بعد مرنے کے مرے گھر سے یہ ساماں نکلا

تو یوں کہتا:

چند ٹوٹی چھتریاں اور چند عینک کے فریم
بعد مرنے کے مرے گھر سے یہ ساماں نکلا

اس ڈبے میں بڑی بی' سردار جی اور تین درویشوں کے علاوہ تیس چالیس جاپانی طلبہ کا ایک گروپ بھی سفر کر رہا تھا۔ جن کی ٹی شرٹوں پر فوجی سان یعنی "کوہ فوجی" کی تصویر اس بات کی علامت تھی کہ وہ سب اس مقدس پہاڑ کی یاترا پر روانہ تھے۔ ان طلبہ سے مجھے تو سخت مایوسی ہوئی۔ بھئی انہوں نے نہ ہمارے طلبہ کی طرح ہلڑ بازی کی' نہ شور شرابہ کیا اور نہ ہی دھینگا مشتی کی۔ بس فوجی سان کے بارے میں کتابیں پڑھے جا رہے تھے اور خاموش تھے۔ کہاں ہمارے جواں مرد اور زندہ دل طلبہ' کسی ڈبے میں اگر مٹھی بھر آجائیں تو تہلکہ سا مچ جاتا ہے۔ اور اگر خوش قسمتی سے وہ طلبا سندھ کی یونیورسٹی کے ہوں تو ڈبہ تو کیا پوری ٹرین میں انکی آمد کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل جاتی ہے۔ کیونکہ انکی زندہ دلی اور جوانمردی کا شکار بچے بھی ہوتے ہیں' بوڑھے بھی' ریلوے حکام بھی اور خوانچہ فروش بھی۔ بغیر ٹکٹ سفر کرنا تو خیر انکا پیدائشی حق ہے۔ مگر دوسرے مسافروں کی ریزرو سیٹوں پر قبضہ جمانا' ڈائننگ کار سے مفت کھانا

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کھانا اور جوان لڑکیوں سے دل لگی کرنا بھی انہوں نے اب اپنے حقوق میں شامل کر لیا ہے۔ انکے ان پسندیدہ مشاغل کی زد میں ہر وہ مسافر ہوتا ہے جو سندھ سے گزر کر کراچی جاتا ہے۔ مگر اس نیک کام میں پنجاب کے طلبہ بھی کسی سے کم نہیں۔ لاہور کی یونیورسٹیاں اور کالج جو ایک زمانے میں اچھی تعلیم کے علاوہ اعلیٰ تربیت دینے' مباحثے' ڈرامے' سپورٹس اور میوزک کانسرٹ کرانے کے لئے مشہور تھے اب علم و ادب کے وہ گہوارے کمانڈوز کیمپ سے بن کر رہ گئے ہیں۔ ہوسٹل' جہاں معصوم شرارتوں سے قہقہے ابلتے تھے اب ایمونیشن ڈپو بن گئے ہیں۔ جہاں طلبہ کتابیں اور نوٹس بدلنے کی بجائے کلاشن کوف اور ہینڈ گرنیڈ بدلتے ہیں۔ ان طلبہ کی جب ایک بس بھی لاہور شہر کا رخ کرتی ہے تو مال روڈ پر ٹریفک بھی بند ہو جاتا ہے اور لوگوں کا کاروبار بھی۔ جب یہ ہونہار طلبہ اپنی کاروائی کے بعد اپنی اپنی کمینگاہوں یعنی ہوسٹلوں کو لوٹتے ہیں تو شہر میں ہر سو جلتے ٹائیروں کی بدبو اور دھواں پھیلا ہوا ہوتا ہے۔

یوکوہاما ٹوکیو کی بندر گاہ بھی ہے اور جاپان کا دوسرا بڑا شہر بھی۔ مگر ہماری بلٹ ٹرین اتنے بڑے شہر سے تیر کی طرح پار ہو گئی اور ہمیں خبر تک نہ ہوئی۔ ویسے خبر ہو بھی جاتی تو ہم یوکوہاما کا بھلا کیا بگاڑ لیتے۔ دنیا کے سبھی صنعتی شہر تقریباً" ایک سے ہی ہوتے ہیں۔ بس اونچی اونچی سرد عمارتیں۔ کسی ایک کو دیکھ لیا جائے تو بس کافی ہے۔ البتہ اونچے سرد کوہ فُوجی کو ایک نظر میں ضرور دیکھنا چاہتا تھا۔ مگر جس رفتار سے ہماری گاڑی چلتی چلی جا رہی تھی مجھے خدشہ تھا کہ کہیں ہم آنکھ جھپکیں اور پہاڑ اوجھل نہ ہو جائے۔ لیکن کوہ فُوجی یوں اوجھل ہونے والی چیز نہیں۔ کیونکہ اسکی ۱۲۳۸۸ فٹ اونچی تکون نما چوٹی دور دور سے دکھائی دیتی ہے اور پھر بلٹ ٹرین بھی تو اس مقدس پہاڑ کے قدموں کو چھو کر گزرتی ہے۔

دنیا کی اکثر قوموں نے اپنے قومی نشان اور نشانیاں خود تعمیر کی ہیں۔ جو ان ملکوں کی پہچان بن گئی ہیں۔ مثلاً" آسٹریلیا کا اوپیرا' ہندوستان کا تاج محل' مصر کے احرام' فرانس کا ایفل ٹاور' امریکہ کا سٹیچو آف لبرٹی' اٹلی کا کولوسیم' برطانیہ کا ہاؤس آف پارلیمنٹ' چین کی دیوار' تھائی لینڈ کے پگوڈے' اور ہمارا بے ڈھب سا مینار پاکستان جو ہماری قومی بد ذوقی کا مظہر ہے۔ جیسا کہ ہماری اکثر سرکاری اور نو دولتیوں کی نجی عمارتیں ہوتی ہیں۔ جنکا' اپنے بنانے والوں کی طرح نہ ماضی سے رشتہ ہوتا ہے نہ حال کی ضرورت پوری کرتی ہیں اور نہ ہی مستقبل کے تقاضوں پر پوری اترتی ہیں۔ ان سب قوموں اور ملکوں کے برعکس جاپان نے قومی نشان کے طور پر کوہ فُوجی کا انتخاب کیا جو کہ قدرت کا ایک خوبصورت شاہکار ہے۔ ویسے دنیا کے تمام کوہ کنوں کا متفقہ فیصلہ ہے کہ دنیا کا خوبصورت پہاڑ اور حسین ترین چوٹی' راکا پوشی ہے جو پاکستان میں شاہراہ ریشم پر واقع ہے۔ گو یہ پہاڑ بقلم خود تو وادی نگر میں ہے مگر اس کے نظاروں پر وادی ہنزہ کا قبضہ ہے۔ راکا پوشی کو پہاڑوں کا تاج محل بھی کہا جاتا ہے اور تاجوں کا گوہر بھی۔ کوہ فُوجی کی طرح اس چوٹی کی خوبی یہ ہے کہ اسے چاہے ہنزہ کی رانی عتیقہ کے محل کی کھلی کھڑکی سے دیکھا جائے یا وادی ہنزہ کے کسی گڈریے کے بند کواڑوں کی دراڑوں سے' اپنے حسن کی رعنائی میں کنجوسی نہیں کرتی۔ چاندنی رات میں پگھلی چاندی کا ایک دریا ہے جو ۷۷۸۸ میٹر کی بلندی سے بہتا ہوا دکھائی دیتا ہے اور دریائے ہنزہ میں غرق ہو جاتا ہے۔

جاپان کا کوہ فُوجی اور پاکستان کا فُوجی دنیا کی نظر میں تو ایک ہیں۔ دونوں ہی سچ کی طرح ہمیشہ سے قائم و دائم ہیں اور رہیں گے۔ جاپانی چاہے چاند پر چلے جائیں' اور وہ یقیناً چلے جائیں گے۔ اور پاکستانی بھلے زمین دوز ہو جائیں (اور اپنی حرکتوں کے سبب یقیناً ہو جائیں گے)۔ مگر نہ وہ کوہ فُوجی سے پیچھا چھڑا سکتے ہیں اور نہ یہ فُوجی سے جان بچا سکتے ہیں۔ فُوجی اور فُوجی دونوں ہی اپنی اپنی جگہ ان قوموں کی قسمت پر قدرت کا اٹل فیصلہ بن کر چھائے ہوئے ہیں۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ ابھی تک پاکستانیوں نے فُوجی کو اپنا قومی نشان بھلا کیوں نہیں بنایا؟

ایک جاپانی کہاوت ہے کہ کوہ فُوجی کی چوٹی پر ایک مرتبہ بھی نہ جانے والا احمق ہے اور دو مرتبہ جانے والا احمق ترین۔ ہمارے ڈبے میں سفر کرنے والے طلبہ کی

طرح دوسرے لاکھوں جفاکش کوہ کن یعنی کوہ پیما جو ہر سال فوجی کی چوٹی کو سر کرنے آتے ہیں خدا خبر وہ احمق کہلانے سے بچنے کے لئے آتے ہیں یا احمق ترین کہلوانے کے لئے۔ مگر یہ اس آتش فشاں پہاڑ کا طلسم ہے جو کوہ پیماؤں کو دیوانہ وار اپنی طرف کھینچ لاتا ہے۔ اسکا آتشیں لاوا بس آخری مرتبہ ۱۷۰۷ء میں پھوٹا تھا۔ اسکے بعد ہلکی پھلکی گیدڑ بھبکی کے علاوہ یہ پہاڑ کبھی آپے سے باہر نہیں ہوا اور اس نے اپنے آتشیں جذبات کو اپنے جسم پر جمی برف کی تہوں تلے صدیوں سے دبا رکھا ہے۔ شاید اس پہاڑ کی یہی شرافت ہے جسکے سبب شنتو مذہب کے لوگ اس پہاڑ پر عبادت گزاری کے لئے آتے ہیں۔ بدھ مت کے لوگ یہاں اپنے جسم کو پاکیزہ کرنے کے لئے آتے ہیں اور عام کوہ کن اسکے ارد گرد پھیلی ہوئی پانچ جھیلوں، آبشاروں، گھنے جنگلوں، آلودگی سے پاک فضا اور چڑھتے سورج کے نظارے کرنے کے لئے آتے ہیں۔ اللہ جانے کوہ فوجی کی چوٹی سے چڑھتے سورج کے نظارے کیسے ہونگے؟ ہم نے تو کبھی اپنی خواب گاہ سے بھی چڑھتا سورج نہیں دیکھا۔ البتہ ڈوبتے سورج ہم نے سینکڑوں دیکھے ہیں۔ اپنے ملک میں تو صبح شام ڈوبتے ہیں۔

کوہ فوجی آیا۔ اس نے اپنے حسن کا فریب دیا اور گزر گیا۔ ویسے بڑی ہی عجیب بات ہے کہ کوہ فوجی تو اپنے حسن کا فریب دے کر گزر جاتا ہے، مگر ہمارا فوجی تو امید کا فریب دیکر نہیں گزرتا، بلکہ ٹک جاتا ہے۔

ہم سفروں اور دوستوں میں زندہ دلی نہ رہے تو سیاحت تھکاوٹوں اور اداسیوں کی گھاٹیوں میں اتر جاتی ہے۔ ہم تینوں بھی شاید اسی قسم کے مرض کا شکار ہوگئے تھے۔ ہمارا میر کارواں، درویش اول قد آدم کھڑکی کے شیشے سے "سریش" تھا اور خاموش تھا۔ درویش دوم کو سردار جی سے کسی بحث مباحثے میں گتھم گتھا تھا مگر اس کی نہ گپ شپ میں جان تھی اور نہ قہقہوں میں قوت۔ ان دنوں کی خاموشی اور اداسی نے میرا فیوز اڑا دیا تھا اور مجھے کنفیوز بھی کر دیا تھا۔ اسی خاموشی اور اداسی میں شہر آتے رہے شہر جاتے رہے اور آخر کوئی پونے تین گھنٹے کی مسافت کے بعد جاپان کے قدیم دارالحکومت کیوٹو پہنچے۔ کیوٹو کو جاپان کی قدیم تہذیب و تمدن کا ایک زندہ و تابندہ عجائب گھر کہا جا سکتا ہے۔ اس شہر میں پندرہ سو بدھ مندر دو سو شنتو مندر، شاہی محل، عجائب گھر اور جاپانی باغات کی ایک کثیر تعداد ہے۔ اور یہ جاپان کا واحد شہر ہے جسکی حفاظت کے لئے دوسری جنگ عظیم میں امریکی دانشوروں نے امریکی فضائیہ سے درخواست کی تھی کہ اس شہر پر بم نہ برسائیں۔ مگر ہماری بدذوقی کا یہ عالم تھا کہ ہم لوگوں نے اس شہر کے پلیٹ فارم پر قدم تک نہ رکھا۔ بس منہ پھلائے بیٹھے بیٹھے کھڑکی میں سے باہر جھانکتے رہے اور ٹرین کے چلنے کا انتظار کرتے رہے۔ ٹرین چلی تو پلک جھپکتے ہی شن اوشاکا یعنی اوساکا کے جدید ریلوے سٹیشن جا پہنچی اور اوساکا پہنچنے پر پتہ چلا کہ اب ہم تین کی جگہ چار درویش بن گئے تھے۔ کیونکہ درویش دوم نے سردار جی کو بھی اپنے ساتھ نتھی کر لیا تھا۔ کمپیوٹر دماغ درویش دوم کی ہر حرکت میں برکت ہوتی تھی۔ چنانچہ جونہی ہم تینوں اپنی افسردہ لاشوں کو گھسیٹتے ہوئے ریلوے سٹیشن کے باہر نکلے تو درویش دوم کی اس بابرکت حرکت کا اندازہ ہو گیا۔ دراصل سردار جی، درویش اول جیسا جعلی بزنس مین نہیں بلکہ سچ مچ کا بزنس مین تھا جو ہندوستان سے کھیلوں کا سامان جاپان کو ایکسپورٹ کرتا تھا۔ ادھر ریلوے سٹیشن پر جاپانی کمپنی کا نمائندہ اسکے انتظار میں تھا۔ چنانچہ جاپانی میزبان مسٹر ماری مورا نے سردار جی کے ساتھ ساتھ ہمیں بھی ہاتھوں ہاتھ لیا۔ سامان اپنی پجیرو میں فٹ کیا اور ہوٹل کی جانب چل دیا۔ دوران سفر خدا جانے ان بالوں کے بادشاہوں کے درمیان کیا معاہدہ ہوا کہ ہوٹل پہنچتے ہی ہم لوگوں کو دو کمرے مل گئے۔ ایک میں درویش دوم اور سردار جی ٹھہر گئے اور دوسرے میں درویش اول اور میں!

اوساکا کے ارد گرد ہرے بھرے چھوٹے چھوٹے پہاڑ، شہر کے سینے کو تیر کی سیدھ میں چیرتے ہوئے۔ ایکسپریس وے اور کروٹیں بدلتا دریائے یودو۔ اس صنعتی شہر کا محاصرہ کئے تیس ہزار کے لگ بھگ فیکٹریاں ہیں جن کی چمنیاں دن رات دھواں اگلتی رہتی ہیں۔ پھر شہر بھی کیا، بس سٹیل، کانکریٹ اور کانچ کے بنے، آسمان کو چھوتے سرد مقبروں کا ایک وسیع گورستان ہی تو ہے جس میں گرے سوٹوں کے کفن پہنے، بریف کیس اٹھائے ایک مخلوق آباد ہے۔ جس کو خدا خبر کس جنم کے گناہوں کی سزا ملی ہے کہ وہ دن رات

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

فلپائنز

دولت کی جستجو میں دگر گوں رہتی ہے اور بے چین ہے۔ اداس درویشوں کو ایسے شہر میں بھلا کیا سکون ملنا تھا۔ مگر جاپان میں آخری اداس شام تو بہرحال گزارنی ہی تھی۔ شام ڈھلی تو ہمارے دروازے پر دستک ہوئی۔ درویش اول ابھی تک اپنے بستر پر نڈھال تھا۔ میں نے دروازہ کھولا تو درویش دوم اور درویش چہارم یعنی سردار جی بھرپور تیاری میں تھے جو ہمیں بھی اپنے ہمراہ لے جانے کو آئے تھے۔ مگر درویش اول نے جانے سے انکار کر دیا' اور میں نے بھی اوساکا کی شام اسکے نام کر دی۔ چنانچہ وہ بستر پر اوندھے منہ لیٹا رہا اور میں کمرے کی کھڑکی سے باہر کے نظارے کرتا رہا اور اسے کوستا رہا۔ سردار جی کے بزنس پارٹنر کی گاڑی نے ہمیں اوساکا کے ہوائی اڈے پر پہنچایا اور ہم ٹرالیوں پر اپنا سامان گھسیٹتے ہوئے سیدھے جاپان ایئرلائنز کے کاؤنٹر پر جا پہنچے تو احساس ہوا جیسے ٹیلا جانے والا وہ جہاز مسافروں کے لئے نہ ہو بلکہ کارگو' یعنی سامان کے لئے ہو۔ وہاں ہر طرف خاکی گتوں کے ڈبوں کے انبار تھے۔ جن میں ٹیلیویژن' وی سی آر' کیسٹ پلیئر اور دوسرا بجلی کا گھریلو سامان بھرا رکھا تھا اور مسافروں کی ایک ٹیڑھی میڑھی قطار تھی جو حد نظر تک پھیلی ہوئی تھی۔ یہ قطار فلپینیوں نرسوں' خادماؤں' طوائفوں اور دلالوں کی تھی جو روزی کی تلاش میں اپنے وطن سے جاپان آتے ہیں۔ دن رات جسمانی اور جنسی مشقت کرتے ہیں اور جو کچھ کماتے ہیں اسے کاغذ کے نوٹو کے بجائے بجلی کے سامان میں بدل کر وطن لے جاتے ہیں تاکہ وہاں پہنچ کر اس سامان کو دگنے داموں بیچ سکیں اور اس طرح اپنی مشقت سے کمائی ہوئی دولت کو دوگنے سے چوگنا کر سکیں۔ شاید اسی لئے ان لوگوں کے لئے ایئر لائین والوں نے ایک مخصوص کاؤنٹر کھول رکھا تھا تاکہ فاضل سامان کا ان سے مزید کرایہ وصول کر سکیں۔ دو گھنٹے کے انتظار کے بعد جہاز ہوا میں بلند ہوا۔ ہم نے جاپانی میں "سایو نارا" یعنی الوداع کہا اور فلپائین کا نقشہ پھیلا لیا۔

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

فیلا کے ہوائی اڈے پر اترے تو درویش دوم کا چہرہ اتر گیا مگر میری خوشی کی انتہا نہ رہی۔ کیونکہ درویش دوم کا بھاری اور بھدا سوٹ کیس گم ہو گیا تھا۔ جس سے میری جان کا بوجھ بھی ہلکا ہو گیا اور دل کا بھی ـــــ لیکن اس خوشی کا اظہار میں کھلے بندوں ہرگز نہیں کر سکتا تھا۔ کیونکہ درویش دوم کی سفر بھر کی شاپنگ اس گم شدہ بیگ میں موجود تھی علاوہ ازیں شاپنگ میں اس کی جان تھی۔ چنانچہ ایک جانب شاپنگ کے اس صدمے سے بے جان درویش دوم اور دوسری جانب عشق سے گھائیل درویش اول 'دو سوگوار درویشوں کے بیچوں بیچ میں بھلا خاک مسرت کا مظاہرہ کر سکتا۔ مگر فیلا شہر ہی ایسا ہے کہ یہاں ہر غم کا مداوا ہو جاتا ہے۔ چنانچہ درویش اول کے زخموں کو بھرنے کے لئے فیلا کی "فیاریں" بڑی ہی کار آمد ثابت ہوئیں اور چند ہی لمحوں میں اس کی چال بھی بدل گئی اور چلن بھی ـــــ رہا درویش دوم تو اس کے غم کا فوری مداوا کرنے کے لئے جاپان ایئر لائینز کے عملے نے اسے کیش ڈالر تھما دیئے ـــــ اور یہ وعدہ بھی کر لیا کہ اس کا گم شدہ بیگ بھی فوری تلاش کر کے اس کی جائے رہائش تک پہنچا دیا جائے گا ـــــ دراصل "آیاٹا" یعنی انٹرنیشنل ایئر ٹرانسپورٹ ایسوسیشن کے قوانین کے مطابق اگر دوران سفر کسی مسافر کا سامان گم ہو جائے تو سامان گم کرنے والی ہوائی کمپنی پر لازم ہوتا ہے کہ مذکورہ مسافر کی سہولت کے لئے اسے بنیادی اشیا یعنی "شیو" وغیرہ کا سامان خریدنے کے لئے پچاس ساٹھ ڈالر کے لگ بھگ کیش دے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

دیا جائے اور بعد میں سامان ملنے کی صورت میں گم شدہ سامان مسافر کی جائے رہائش تک پہنچایا جائے۔ بدقسمتی سے نہ تو زیادہ تر مسافر اس قانون سے واقف ہیں اور نہ ہی زیادہ تر ہوائی کمپنیاں مسافروں کو ان کا جائز حق دینا چاہتی ہیں۔ گو اس حق تلفی کا شکار صرف تیسری دنیا کے مسافر ہی ہوتے ہیں۔ کیونکہ نہ تو وہ اپنا حق مانگنا جانتے ہیں اور نہ ہی اس حق کو حاصل کرنے کے لئے قربانی دینا چاہتے ہیں۔ جونہی درویش دوم کی جیب میں کیش آیا اور درویش اول کی نظر میں عیش آیا تو وہ دونوں "نارمل" ہو گئے اور مجھ پر برس پڑے کہ میں نے "اوساکا" میں سامان دیتے وقت ضرور کچھ نہ کچھ گھپلا کیا ہوگا--- وہ مجھ پر کیا برسے کہ ہم سب پر بادل برس پڑے--- فیلا میں بادل بجلی اور برسات اکثر اوقات آنکھ مچولی کھیلتے دکھائی دیتے ہیں۔ کبھی کبھی تو ان کا یہ کھیل اس قدر شدید ہو جاتا ہے کہ سمندر بھی ان کے ساتھ شامل ہو کر طوفان برپا کر دیتے ہیں۔ اور ہر سو تباہی مچا دیتے ہیں۔ ان جوار بھاٹوں کی زد میں فیلا کی سربفلک جدید عمارتیں بھی ہوتی ہیں اور ٹین کی چھتوں والے جھونپڑے بھی --- تانبہ بدن پستہ قد حسینائیں بھی ہوتی ہیں اور دراز قامت ناریل کے پیڑ بھی --- یہ ناریل کے پیڑ فلپائینز کی سات ہزار ایک سو جزیروں کی اس سرزمین کے ایک چوتھائی حصے پر قابض ہیں اور یہاں کے لوگوں کی معیشت میں وہی افضل مقام رکھتے ہیں جو تیل دریافت ہونے سے پہلے صحرائے عرب میں کھجور کے پیڑ کا مقام تھا۔ ایک زمانے میں تو یہاں جب کسی کے گھر میں بچہ پیدا ہوتا تو گھر والے ایک ناریل کا پیڑ لگا دیتے۔ جس کی آمدنی سے اس بچے کی پرورش بھی ہو جاتی اور تعلیم و تربیت کا خرچہ بھی نکل آتا۔ گو اب ناریل کو ان کی معیشت میں وہ اہمیت تو نہیں۔ مگر پھر بھی ناریل کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ کیونکہ فلپائینز میں حد نگاہ تک چار سو صرف ناریل ہی ناریل دکھائی دیتے ہیں۔ اور ناریاں ہی ناریاں نظر آتی ہیں۔ جنہوں نے اپنی معیشت سنوارنے کے لئے ناریل کے پیڑ کی جگہ سنبھال لی ہے۔

ہوائی اڈے کے احاطے کے باہر برکھا کی بوچھاڑ اور اندر ناریوں کی یلغار --- مختلف ہوٹلوں کی نمائندہ بیبیاں۔ ہر اک اپنے اپنے ہوٹل کے گن گا رہی تھی اور

دلفریب ترغیبوں سے اپنے ہوٹل میں قیام پر آمادہ کر رہی تھی۔ درجنوں سیلز گرلز اور تین درویش۔ ان کی بے رحم جوانیاں اور ہمارے رحم دل۔ ان کا دل توڑنا بھلا کیسے برداشت کر سکتے تھے --- بارہا جی چاہا کہ اپنے ٹکڑے ٹکڑے کر کے ان کے حوالے کر دیئے جائیں تاکہ ان میں سے کوئی بھی مایوس نہ لوٹے۔ مگر میرے اس فیصلے پر عمل کرنے سے پہلے ہی درویش اول نے اپنا فیصلہ سنا دیا اور ایک حسینہ کی شیطانی اداؤں کا شکار ہو کر فیلا مڈ ٹاؤن ہوٹل میں ٹھہرنے کا اعلان کر دیا۔ مجھے یقین تھا کہ اس فیصلے سے مایوس ہو کر دوسری ناریاں یا تو جذبہ انتقام سے ناگن بن جائیں گی اور یا غم سے گھائل ہو جائیں گی ..... مگر ایسا کچھ نہ ہوا۔ وہ جوں کی توں ہشاش بشاش دوسرے گاہکوں کے اردگرد تتلیوں کی طرح پھڑ پھڑانے لگیں۔ ادھر دونوں درویش اپنے ہینگر نما کندھے اس شعلہ بدن سے ٹکراتے ٹکراتے فیلا مڈ ٹاؤن ہوٹل کی "کوچ" کی طرف چل دئے اور میں نے سامان گھسیٹتے گھسیٹتے ان کے پیچھے پیچھے کوچ کی۔ ہمیں "کوچ" میں دھکیل کر وہ ظالم اداکندھے مٹکاتی ایر پورٹ کی جانب لوٹ گئی۔ کیونکہ ابھی ہوٹل کے لئے گاہک بھی اور گھیرنے تھے اور شام میں ملاقات کے جھوٹے دلاسے بھی اور دینے تھے۔ اس "کوچ" میں ہمارے علاوہ اس نو سرباز حسینہ کے ڈسے ہوئے چند اور بھی ڈشکرے بیٹھے تھے اور اس یقین سے بیٹھے تھے کہ جونہی شام ڈھلے گی وہ سیلز گرل ان کے پہلو میں ہوگی۔ حالانکہ اگر غور کیا جائے تو کسی خوش فہمی کی گنجائش ہرگز نہیں رہتی۔ کیونکہ دن بھر درجنوں جہاز آتے ہیں اور سینکڑوں مسافروں کو وہ فیلا مڈ ٹاؤن ہوٹل میں "بک" کر کے بھیجتی ہے۔ وہ اگر چاہے بھی تو آخر کس کس کے پہلو کو گرما سکتی ہے اور پھر فیلا میں ..... جہاں پیسہ ہو تو آپ کے پہلو "نمک" جائیں یعنی ختم ہو جائیں گے مگر پہلو میں آنے والے اور سمانے والے کبھی ختم نہ ہونگے۔

فیلا کے موسم میں گاڑی "ایرکنڈیشنڈ" نہ ہو تو بندہ بھیگا چوہا سا بن کے رہ جاتا ہے۔ بھلے ہی اس کا اصلی سائیز بھالو یعنی درویش دوم سا ہی کیوں نہ ہو۔ مگر فیلا مڈ ٹاؤن ہوٹل کی یہ "کوچ" باقاعدہ "ایرکنڈیشنڈ" تھی اور سنہری بتیسی والا ڈرائیور باقاعدہ باوردی تھا۔ اور فر فر انگریزی بولتا تھا۔ انگریزی بھی ایسی لچھے دار کہ ہمارے انگریزی

دان پروفیسر اس کی زبان کی روانی سن سن شرمندہ ہوں۔ ویسے اس ڈرائیور کی انگریزی زبان پر گرفت عجب بات بھی نہ تھی کیونکہ فلپائینز میں ۸۸ فی صد لوگ تعلیم یافتہ ہیں۔ پھر منیلا تو ہے ہی طالب علموں کا شہر جہاں پہلی یونیورسٹی ۱۶۲۱ء میں کھولی گئی اور پہلا پرنٹنگ پریس ۱۶۰۲ء میں لگایا گیا۔ اسی طرح منیلا میں پہلا ہسپتال بھی ۱۵۷۸ء میں کھولا گیا۔ یہ سب صدیوں پرانی باتیں ہیں ـــــ گاڑی سٹارٹ کرتے ہی ڈرائیور نے اپنا روائتی لیکچر شروع کیا۔ "لیڈیز اینڈ جنٹلمین .....! ماہوہائی ..... ویلکم ٹو منیلا ..... یعنی خواتین و حضرات منیلا میں جی آیاں نو ....." ہمارا ڈرائیور کم گائیڈ ابھی پوری روانی پکڑ بھی نہ پایا تھا۔ کہ درویش اول نے "ایکسکیوزمی" کہہ کر اسے ٹوک دیا۔ ڈرائیور نے تیور بدلتے ہوئے اپنا مائیک بند کیا۔ ونڈ سکرین پر لگے آئینے میں درویش اول کو جھانکا اور جانچا ـــــ" بٹ ویئر آر نو لیڈیز ان دس بس ..... لیکن اس بس میں تو کوئی خواتین نہیں صرف جنٹلمین ہی ہیں ـــــ" درویش اول کے اس اعتراض پر دوسرے ڈشکروں نے ایک زور دار قہقہہ لگایا۔ مگر اس شائستہ زبان ڈرائیور نے جواب دیا تو قہقہے شرمندگی میں بدل گئے۔ "سر! ویئر آر نو جنٹلمین ود آوٹ لیڈیز ..... یعنی حضور خواتین بنا حضرات' حضرات نہیں سمجھے جاتے ..... سو اف یو ڈونٹ مائنڈ لیٹ می کیٹینو .... اگر آپ برا نہ مانیں تو میں اپنا بیان جاری رکھوں اور آپ حضرات کو شہر منیلا کے متعلق تفصیلات فراہم کردوں۔ کھسیانے سے درویش اول نے اقرار میں اپنا وزنی سا سر ہلا دیا مگر زبان بند رکھی۔

روخاص بلیوارڈ' آبنائے منیلا کے ساتھ ساتھ شہر تک چلا جاتا ہے۔ اس دوہری شاہراہ کے بائیں ہاتھ حد نظر تک پھیلے ہوئے سمندر میں ہچکولے کھاتے سلیٹی رنگ جہاز اور ساحل پر جھومتے ناریل کے پیڑ اور دائیں ہاتھ فائیو سٹار ہوٹل' دیس بدیس کے ریستوران اور نائٹ کلب جو دن کو تو سنسان ہی نظر آتے ہیں۔ مگر شام ڈھلتے ہی ان کی جگمگ کرتی روشنیوں سے آنکھیں چندھیا جاتی ہیں۔ روخاص بلیوارڈ کی ٹریفک کا بٹوارہ کرنے کے لئے درمیان میں ایک "گراسی" پٹی چھوڑی گئی ہے جس میں ناریل کے پیڑوں کے جھنڈ کے جھنڈ موجود ہیں۔ ان پیڑوں کے نیچے بھی ایک مخلوق آباد ہے۔ جس مخلوق نے درختوں کی سوکھی شاخوں سے روزی کمانے کا ڈھب نکال لیا ہے۔ ماہ دسمبر میں کرسمس کے تہوار پر ہر عیسائی خاندان اپنے گھر میں "کرسمس ٹری" سجاتا ہے۔ چنانچہ روخاص بلیوارڈ کے یہ کاریگر شاخوں کی کٹائی' بناوٹ اور سجاوٹ اس ہنر مندی سے کرتے ہیں کہ درختوں کی وہ سوکھی اور بیکار شاخیں جو ایندھن کے کام بھی نہ آسکیں' جگمگ کرتی "کرسمس ٹری" بن جاتی ہیں۔ جو فلپائینز کے علاوہ یورپ اور امریکہ بھی سجاوٹ کے لئے بھیجی جاتی ہیں۔

منیلا کی ہر شاہراہ پر "جیپنی" کا راج اور رنگ دکھائی دیتا ہے ـــــ دوسری جنگ عظیم میں استعمال ہونے والی لاکھوں خاکی رنگ امریکن جیپیں۔ جنگ ختم ہونے کے بعد فلپنوں کے ہاتھوں لگیں تو انہوں نے ان بیکار جیپوں کو کار آمد بنا لیا اور سجا لیا۔ اور سجایا بھی ایسے کہ ہر جیپ کسی بڑے مصور کا چلتا پھرتا شاہکار دکھائی دیتی ہے۔ سب سے پہلے تو جیپ کو "جیپنی" بناتے ہی اسے ایک دلفریب نام دیدیا جاتا ہے۔ مثلاً جیپسی' فائیر گرل' پنک لیڈی' سینٹیمنٹل ویلیو' اور اسی طرح کے اور جذباتی نام جو مالک اور "جیپنی" کے گہرے لگاؤ کا مظہر ہوتے ہیں۔ جیپنی کے "بونٹ" پر رنگ برنگی' نیلی پیلی' لال گلابی بتیوں کا ایک جنگل سا سجا ہوتا ہے' جن کی جلتی بجھتی قوس قزح سی روشنیاں سڑک پر کھڑے مسافروں کو دعوت دیدار بھی دیتی ہی اور سوار ہونے کی ترغیب بھی۔۔ اسی طرح سٹیل اور تانبے کے بنے گھوڑوں اور مرغوں کے مجسمے بھی "بونٹ کی زینت کا لازمی جز سمجھے جاتے ہیں۔ "شین لیس" سٹیل کی لشکارے مارتی باڈی پر "سٹکر" ' "سلوگن" اور ڈیزائین اس ہنرمندی سے سجائے جاتے ہیں کہ منیلا کی "جیپنیاں" سجاوٹ اور بناوٹ میں اور ناز اور نخرے میں ہمارے رکشوں اور ٹرکوں سے کئی ہاتھ آگے ہیں۔ گو "جیپنیاں" بھی ہماری ویگنوں کی طرح دن رات سڑک سڑک گلی گلی مسافر چڑھاتی اتارتی رہتی ہیں۔ مگر وہ موت کے ان کھیلوں سے ناواقف ہیں جو ہماری ویگنوں کے ڈرائیور چرس کے سوٹے' لگا کر ہماری سڑکوں پر کھیلتے ہیں اور مسافر اٹھانے کے لالچ میں نہ جانے کتنے مسافروں کا خون کرتے رہتے ہیں اور حیرت کی بات ہے کہ ہر قتل پر صاف صاف بچ نکلتے ہیں۔

کمپیوٹر دماغ درویش دوم نے درویش اول کے کان میں کچھ سازشی گھسر پھسر کی۔ جس پر درویش اول نے اقرار میں سر ہلا دیا اور "ریسپشن" پر کھڑی بی بی کو دو کی بجائے تین کمرے بک کرنے کو کہا۔ لڑکی نے اسے کمروں کی چابیاں تھمائیں تو اس نے کاؤنٹر کے پیچھے کھڑی چابیاں تھمانے والی لڑکی کے ساتھ کچھ مزید سرگوشی کی۔ اس لڑکی نے جوابی سرگوشی کی اور درویش اول نے اسے ایک چابی واپس کر دی۔ تھوڑی دیر اس نے اپنے ریزرویشن والے کمپیوٹر کیساتھ چھیڑ چھاڑ کی اور پھر ایک اور چابی درویش اول کے ہاتھ میں تھما دی اور ہم تینوں کمروں میں جانے کے لئے لفٹ کی جانب چل دیئے۔ لفٹ میں داخل ہوتے ہی درویش اول نے مجھے میرے کمرے کی چابی تھما دی اور ساتھ ہی دوسری منزل کا بٹن دبا دیا۔ میں نے دوسری منزل پر لفٹ سے باہر قدم رکھا ہی تھا کہ انہوں نے دوبارہ بٹن دبایا اور لفٹ کو ہانکتے ہوئے کسی بالائی منزل پر لے گئے۔ چنانچہ میں سامان گھسیٹتا ہوا اپنے کمرے میں جا پہنچا۔ جزیرہ بالی کے بعد اب پہلی مرتبہ مجھے علیحدہ کمرے میں سونے کا موقع مل رہا تھا۔ کمرے علیحدہ لینے کی بات تو سمجھ میں آگئی مگر منزل علیحدہ کرنے میں کیا راز تھا یہ میری سمجھ میں نہ آیا۔ ویسے کمرہ تو میرا بھی ٹھیک ٹھاک تھا البتہ پردہ ہٹا کر کھڑکی کھولی تو ٹریفک کا شور تھا اور ہوٹل کا پچھواڑہ تھا۔ اور یہ شور اور ہنگامہ ہی درویشوں کی منزلیں الگ کرنے کا سبب تھا۔ کیونکہ اکثر ہوٹلوں میں بغیر نظاروں اور شور اور ہنگامے والے نچلی منزلوں کے کمرے اونچی منزلوں کے کمروں کی نسبت کم کرائے پر ملتے ہیں۔ اسی لئے دونوں درویشوں نے کفایت شعاری کا یہ تجربہ مجھ پر کیا۔ مگر درویش دوم کے خراٹوں کے مقابلے میں گلی کا یہ شور مجھے گوارا تھا اور میں دل لگا کر شام کی تیاری میں مصروف ہو گیا۔

فلپائینز کے بارے میں ایک کہاوت مشہور ہے کہ صدیوں پہلے ایک دیو سر پر پتھروں کا ٹوکرہ اٹھائے بحیرۂ اوقیانوس (Pacific Ocean) سے گزر رہا تھا کہ اس کا پاؤں پھسل گیا اور ٹوکرے میں رکھے پتھر سمندر میں بکھر گئے۔ دیو بادشاہ کے وہ بکھرے ہوئے پتھر دھیرے دھیرے جزیروں میں بدل گئے۔ وہ جزیرے جغرافیائی لحاظ سے صدیوں پہلے تجارت کے لئے بڑے اہم اور صدیوں بعد دفاع کے لئے اہم ہو گئے۔

چنانچہ ان پر قدم جمانے کے لئے ہر قوم کی رال ٹپکتی رہی۔ سکینڈی نیویا کے وائیکنگ اور پرتگالی یورپ کے پہلے بحری قزاق ہیں۔ جو اپنی بحری طاقت کے بل بوتے پر دور دراز سمندروں میں نکلے اور جہاں جہاں تجارت کی تلاش میں یہ پہنچے وہاں وہاں "ڈچ" ہسپانوی اور برطانوی بھی پہنچ گئے۔ چنانچہ سولہویں صدی میں جب پرتگالیوں نے ان جزیروں کا رخ کیا تو ان کو سونگھتے سونگھتے ہسپانوی بھی یہاں آن پہنچے۔ پرتگالیوں کو گالیاں دیکر مار بھگایا اور اپنے روائتی دشمن مسلمانوں کے ساتھ جنگ کی تیاری شروع کر دی۔ یہ وہ دور تھا کہ جب ہسپانوی' "موروز" یعنی مسلمانوں کو اندلس سے نکال چکے تھے اور مسلمانوں کی ابدی کمزوری یعنی آپس کی چپقلش اور غداری کی خصلت سے بخوبی واقف تھے۔ چنانچہ انہوں نے دریائے پاسگ کے کنارے راجہ سلیمان کے لکڑی کے قلعہ کا محاصرہ کیا۔ یہ قلعہ اسی مقام پر واقعہ تھا جہاں اب منیلا کا شہر آباد ہے۔ راجہ سلیمان نے بڑی جوانمردی سے ہسپانوی فوجوں کا مقابلہ کیا۔ مگر راجہ سلیمان کی صفوں میں بھی سراج الدولہ اور ٹیپو سلطان کی طرح میر قاسم اور میر جعفر جیسے غدار موجود تھے۔ جنہوں نے بارودی سرنگوں کے ذریعے لکڑی کے قلعے میں آگ لگا دی۔ قلعہ کی دیواروں میں شگاف پڑتے ہی ہسپانوی فوجوں نے حملہ کر دیا۔ اک گھمسان کا رن پڑا۔ راجہ سلیمان شہید ہوا اور ہسپانیوں کا ان جزیروں پر قبضہ ہو گیا۔ جو ساڑھے تین صدیوں تک جاری رہا۔ مسلمانوں کی صدیوں پرانی وہ جنگ اب بھی جاری ہے اور جنوبی جزیروں کے مسلمان جن کو اندلس کی نسبت سے "مورو" کہا جاتا ہے راجہ سلیمان کے عزم پر اب بھی قائم ہیں اور آزادی کی جنگ لڑ رہے ہیں۔

ہسپانیوں نے راجہ سلیمان کی شہادت کے بعد جزیروں کے اس ملک کو اپنے شہنشاہ فلپ دوم کے نام سے منسوب کرتے ہوئے اس کا نام فلپائینز رکھا اور ساتھ ہی منیلا شہر کی بنیاد رکھی اور راجہ سلیمان کے لکڑی کے قلعہ کی جگہ پتھر کا قلعہ تعمیر کیا جو اب بھی وہاں موجود ہے۔ ہسپانیوں کے قدم جمتے ہی تجارت نے بھی فروغ پایا اور تبلیغ نے بھی۔ چنانچہ ایک طرف تو ہسپانوی جہاز چاندی کے سکے لاتے رہے اور منیلا میں اکٹھی کی گئی چائے' ریشمی کپڑے' مسالے اور قیمتی پتھر لے جا کر منافع کماتے رہے اور

دوسری طرف ان کی تبلیغی جماعتوں نے عیسائت پھیلانے کا کام جاری رکھا چنانچہ اس وقت فلپائینز کی ۸۵ فی صد آبادی عیسائی ہے۔ اور یہ مشرق بعید کی واحد عیسائی سلطنت ہے۔

جب تک میں تیار ہو کر نیچے ہوٹل کی لابی میں پہنچا دونوں درویش پہلے سے ہی رات کی واردات پر نکل چکے تھے۔ الگ الگ کمرے اور علیحدہ علیحدہ منزلیں تو خیر کسی حد تک قابل قبول بھی تھیں اور قابل وضاحت بھی۔ مگر یوں سرے سے ہی مجھے تنہا چھوڑ جانا یقیناً اس بات کی علامت تھی کہ سفر کی طوالت ہماری رفاقت میں شگاف ڈال رہی تھی۔اس لئے مناسب یہی تھا کہ یا تو اس سفر کو منیلا پر ہی ختم کر دیا جائے اور یا ہر درویش اپنی اپنی الگ راہ اختیار کرے۔ اس طرح کے کئی وسوسے اور خیالات میرے ذہن میں دوڑنے لگے اور میں اسی تگ و دو میں بے منزل و بے مقصد ہوٹل کی لابی سے نکل پڑا۔

منیلا کی سڑکوں پر آفت کا شور، غضب کا رش اور بلا کی رونقیں ہوتی ہیں۔ جونہی آپ کسی فٹ پاتھ پر قدم رکھتے ہیں۔ تو اک سیل رواں کا حصہ بن جاتے ہیں۔ جو کندھوں سے کندھے اور جسموں سے جسم ٹکراتے ٹکراتے ہر وقت ہر سڑک اور ہر گلی پر ہر سو بہتا دکھائی دیتا ہے۔ چنانچہ ہوٹل سے نکلتے ہی میں بھی ایک ایسی سمت چل نکلا جس جانب زیادہ تر غیر ملکی سیاحوں کا رخ تھا۔ میں جانتا تھا کہ یقیناً اس جانب سفر کرنے میں بھلائی ہی بھلائی ہے۔ کیونکہ ادھر "مبینی" (mabini) کا علاقہ ہے جسے سیاحوں کی عیاشی کی لئے مخصوص کر دیا گیا ہے۔ راستہ بھر فٹ پاتھوں کے ساتھ ساتھ افلاس زدہ سوداگروں کے اڈے ہیں۔ جہاں زیادہ تر چھابڑی والی بوڑھی عورتیں موجود ہیں۔ جو اپنے خوانچوں میں "چوانگم" سگریٹ، ماچس، افلاس اور امید سجائے بیٹھی ہیں۔ پاس ہی ان کے معصوم بچے دنیا والوں کی ناانصافیوں سے بے خبر سو رہے ہیں۔ انہی فٹ پاتھوں پر نوخیز نوسرباز بھی ملتے ہیں جو اناڑی سیاحوں سے مال بٹورنے کی فکر میں ہوتے ہیں۔ پھر جگہ جگہ پر چھوٹے چھوٹے سٹال بھی دکھائی دیتے ہیں۔ جہاں کھانے کو مہک دار مچھلیاں، سفید چاول، تلے ہوئے کیلے، گوشت کی سلاخیں، بھنی ہوئی سبزیاں اور پینے کو ناریل کا پانی کوکا کولا اور بیئر ملتی ہے۔کونے کونے پر سرکاری لائسنس یافتہ ایکسچینج کے ڈیلروں کے کاونٹر ہیں جو دن رات کھلے رہتے ہیں اور سیاحوں کا غیر ملکی سرمایہ فلپائینز کے "پیسو" میں بدل دیتے ہیں۔ ایسی ہی جگہوں کے اردگرد "بلیک" میں پیسے بدلنے والے بھی گدھوں کی طرح منڈلاتے رہتے ہیں اور سیاحوں کو "بلیک" میں پیسے بدلنے پر اکساتے رہتے ہیں۔ "بلیک" کا دھندہ "بلیک آؤٹ" گلیوں میں ہی اکثر پھلتا پھولتا ہے۔ جیسا کہ ہمارے ملک میں جب سے "لوڈشیڈنگ" شروع ہوئی ہے تب سے کالے دھندے نے بڑا فروغ پایا ہے اور اب تو دن کے اجالے میں سیاہ من والے اپنے سیاہ دھن کی کھلے بندوں نمائش کرتے رہتے ہیں اور قانون کا ہاتھ ان کے گریباں تک نہیں پہنچ سکتا کیونکہ قانون جاری کرنے والے تو ان کے حضور میں "سلوٹ" کے لئے اپنے ہاتھ پیشانی پہ چپکائے رکھتے ہیں۔ ہاں تو بات منیلا کے "بلیکیوں" کی ہو رہی تھی۔ جو لالچی سیاحوں پر کڑی نظر رکھتے ہیں اور جونہی کوئی مرغا پھنس جائے اس پر چھری پھیر دیتے ہیں۔ ہمارا کمپیوٹر دماغ درویش دوم بھی ان کی چابک دستی کا شکار ہوا۔ اور منیلا میں پہلی رات ہی شکار ہو گیا یہ واردات اسی روز ہوئی تھی جبکہ دونوں درویش مجھے تن تنہا چھوڑ کر نکل گئے تھے۔ مگر ان دونوں نے وہاں مجھے اس بات کی کانوں کان خبر نہ ہونے دی البتہ پاکستان لوٹنے پر انہوں نے بتایا کہ جونہی وہ دونوں ہوٹل سے نکلے تو گلی کی نکڑ پر ان کی ایک "بلیکئے" سے ملاقات ہو گئی۔ جس نے بینک کے مقابلے میں تقریباً ڈیڑھ گنا بہتر ریٹ فی ڈالر کی پیشکش کی۔ یہ ایسی پیشکش تھی جسے درویش دوم ہرگز نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ چنانچہ وہ اس "بلیکئے" کے پیچھے پیچھے اک اندھیری گلی میں چل نکلا۔ وہاں اس نو سرباز نے پراسرار اور اندھیرے ماحول کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ایسی ہوشیاری سے نوٹوں کی تھدیوں کا ہیر پھیر کیا اور پھر اس پھرتی سے غائب ہوا کہ کمپیوٹر دماغ ہکا بکا رہ گیا۔ جب درویش دوم نے اپنی جیب میں چھپی اس نوٹوں کی تھدی کا جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ اس تھدی کے اوپر اور نیچے نوٹ تھے اور باقی سب کورے کاغذ کے ٹکڑے تھے۔

ویسے مجھے کسی نوسرباز سے کوئی خطرہ نہ تھا۔ کیونکہ اول تو میرے پاس لٹانے کے

لئے کچھ تھا ہی نہیں اور دوسرے یہ کہ نوسرباز بھی تن تنہا سیاحوں پر حملے کرتے ہیں اور میں آسٹریلین سیاحوں کے ایک جتھے کا دم چھلا بن کے گھوم رہا تھا۔ چنانچہ جہاں وہ جاتے وہیں میں جاتا اور جو وہ کرتے بس میں بھی وہی کر گزرتا۔ مینی کے اس علاقے میں قدم قدم پر جنس فروش بیسیاں ملتی ہیں' گھاٹ گھاٹ کے جنسی بیوپاری ملتے ہیں اور بھانت بھانت کی جنسی بیماریاں ملتی ہیں۔ اسی طرح کونے کونے پر ڈاکٹروں کے کلینک بھی ملتے ہیں جو ان جنسی بیماریوں کا مداوا کرتے ہیں۔ ویسے بھی ہر کاروباری بی بی پر یہ لازم ہے کہ وہ ہفتے میں کم از کم ایک مرتبہ اپنا میڈیکل معائنہ کروا کر ڈاکٹر سے باقاعدہ سرٹیفکیٹ حاصل کرلے۔ مگر وہاں بھی ہمارے ملک کی طرح ایسے ڈاکٹر موجود ہیں۔ جو جعلی سرٹیفکیٹ دینے میں عار محسوس نہیں کرتے۔ مینی کے اس علاقے میں سوداگر تو ہر طرح کے ملتے ہیں مگر گداگر نہیں ملتے۔

رات بڑھتی رہی اور میرے آسٹریلین ساتھیوں کی بدمستی بھی بڑھتی رہی اور میری فاقہ مستی بھی چمکتی رہی تو میں کھانے کا متلاشی ہوا۔ عام طور پر اس طرح کی جنسی کمین گاہوں میں پینے کی تو ہر شئے ملتی ہے مگر کھانے کا خاطر خواہ بندوبست نہیں ہوتا۔ مگر مینی میں ایسا نہیں۔ وہاں کھانے کے چھوٹے چھوٹے کھوکھوں کے علاوہ اچھے اچھے ریستوران بھی ہیں جہاں ملک ملک کی خوراک مل جاتی ہے۔ چنانچہ مختلف ریستورانوں کے "نیون سائنوں" میں ایک عربی زبان میں لکھا "مطعم الباکستانی" کا سبز رنگ سائین دکھائی دیا تو میں بے اختیار ادھر کو چل نکلا۔ الشمس ایک لہوریئے کا ریستوراں ہے اور عجب ریستوراں ہے۔ کہ "نیون سائین" عربی میں لکھا ہے' اندر موسیقی ہندوستانی ہے اور خانسامہ فلپسینو ---- البتہ دو پاکستان کی نشانیاں اس ریستوران میں دکھائی دیں جنہیں دیکھ کر دیار غیر میں اپنائیت محسوس ہوئی --- ایک مینار پاکستان کی تصویر اور دوسرا با آواز بلند گپیں ہانکتے اور قہقہے لگاتے ہوئے چند پاکستانی نوجوان جو ایک میز پر قبضہ جمائے بیٹھے تھے۔ اور خدا جانے کب سے بیٹھے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی انہوں نے ایک لمحے کے لئے خاموشی اختیار کی اور آپس میں کھسر پھسر شروع کر دی۔ ایک فلپسینو ویٹرس نے مجھے ایک میز سنبھالنے کا اشارہ کیا اور میرے ہاتھ میں الشمس ریستوران کا بھدا سا مینیو کارڈ تھما دیا۔ جس بے دلی سے اس خاتون نے مجھے مینیو کارڈ تھمایا وہاں کی سروس کا تو مجھے بخوبی اندازہ ہو گیا۔ مگر کھانا تو بہرحال کھانا تھا۔ چنانچہ میں کھانوں کی تفصیل میں الجھ گیا۔

الشمس ریستوران کے مرغ مسالے کو مچھلی مسالہ بھی بجا طور پر کہا جا سکتا تھا کیونکہ آبنائے ملیلا میں جتنا پانی ہے۔ مرغ مسالے کے اس ڈونگے میں اتنا ہی شوربا تھا۔ ہم نے ڈونگے میں چمچ کا چپو گھمایا اور بار بار گھمایا مگر ہر بار بوٹی چمچ سے نکل نکل جاتی۔ تنگ آکر میں نے نان کے ٹکڑے ڈونگے میں پھینکے۔ سینچ نما نان نے شوربا پیا تو ڈونگے کی گہرائی میں ایک سہمی ہوئی بوٹی دکھائی دی۔ میں اس کمزور سی بوٹی پر حملہ کرنے ہی والا تھا کہ پاکستانی نوجوانوں کا ایک نمائندہ میرے قریب آیا اور بغیر پوچھے میرے سامنے بیٹھ گیا۔ بہ امر مجبوری میں نے اسے کھانا کھانے کی صلاح دی۔ مگر شکر ہے اس نے کھانا کھانے سے تو انکار کر دیا۔ البتہ ویٹرس کو ایک بیئر لانے کا آڈر دیدیا۔

میں شکل سے یقیناً بدھو لگتا ہوں گا۔ تبھی تو اس موصوف نے بلا جھجک مجھے درجنوں نوکریاں دلوانے کا جھانسہ دیدیا۔ اور ہر جھانسہ دینے کے ساتھ ساتھ وہ یہ یقین دہانی متواتر کرواتا جا رہا تھا۔ کہ وہ میری مدد صرف پاکستانی ہونے کے ناطے کر رہا تھا۔ اس کی ملازمتوں کی فہرست میں سرکس کی نوکری بھی تھی۔ میں اکثر سوچتا ہوں کہ اگر مجھے واقعی نوکری چاہئے ہوتی تو سرکس میں بھلا مجھے کیا نوکری ملتی؟ اس سے پیچھا چھڑانے کے لئے جونہی اسے میں نے اپنا پی آئی اے کا کارڈ دیا تو اس کا رویہ سرے سے ہی بدل گیا اور اب وہ میرا بل چکانے پر بضد تھا۔ غیر ملکوں میں اکثر پاکستانی نو سرباز گروہوں سے بھی واسطہ پڑتا ہے جو نووارد ہم وطنوں کو اعتماد میں لے کر ان کی پونجی بٹور کر غائب ہو جاتے ہیں۔

میں نے ہوٹل پہنچ کر دونوں درویشوں کا پتہ کیا تو وہ ابھی تک غائب تھے۔ یقیناً عیش کر رہے ہوں گے۔ میں نے سوچا اور اپنے کمرے میں جانے کے لئے لفٹ میں سوار ہو گیا۔ اس ہوٹل کی ہر منزل پر پستول سے لیس سیکورٹی گارڈ موجود تھے جو ہر

www.iqbalkalmati.blogspot.com

آنے جانے والے پر خصوصی نظر رکھتے تھے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ منیلا میں سیکورٹی گارڈ تو ہر ہوٹل، سٹور، ہر بلڈنگ اور ہر گھر کا ضروری حصہ سمجھے جاتے ہیں اور ان تربیت یافتہ باوردی گارڈوں کو سپلائی کرنے کے لئے باقاعدہ کمپنیاں موجود ہیں۔ گارڈوں کے علاوہ حفاظتی دیواریں بھی نہایت بلند و بالا تعمیر کی جاتی ہیں۔ جن کی منڈیروں پر کانچ کے ٹکڑے لگائے جاتے ہیں۔ مگر ان حفاظتی تدابیر کے باوجود آئے دن وہاں چوری چکاری کی وارداتیں ہوتی ہی رہتی ہیں۔ میں نے کمرے میں داخل ہوتے ہی جیمز باونڈ کی طرح کھڑکی دروازے مضبوطی سے بند کئے اور مینلا میں مقیم اپنے ایک پرانے دوست میرو کو فون کیا۔ میرو حسب معمول گھر پہ موجود نہ تھا۔ چنانچہ میں نے فلپینو بھابی "مرسی" کو پیغام دیا اور لمبی تان کے سو گیا۔ مگر منیلا میں آرام کہاں سب سے پہلے تو سرہانے رکھا فون چنگھاڑنے لگا۔ جی چاہا کہ فون کو جڑوں سے اکھاڑ کر کھڑکی کے باہر دے ماروں ...... مگر پھر ایسا کرنے سے خود ہی باز رہا۔ دل پر پتھر رکھ کر...... ہیلو!۔ کہا تو دوسری جانب میرو کی آواز تھی۔ وہ خدا خبر منیلا کے کس کونے میں رہتا تھا مگر فوراً ہوٹل پہنچنے کو تیار ہو گیا۔ میں نے بڑی مشکل سے اسے باز رکھا اور دوسری شام ملنے کا وعدہ کیا ـــ میرو بڑا یار باش اور بادشاہ بندہ ہے۔ اس نے منیلا کی سیر کرانے کے لئے گاڑی اور ڈرائیور کی پیشکش کی اور بڑے خلوص کے ساتھ پیشکش کی۔ چنانچہ دوسری صبح ۹ بجے کا وقت طے کیا اور میں پھر سے سونے کی کوشش کرنے لگا۔

مگر صاحب منیلا میں آرام کہاں ـــ دروازے پر دستک اور گھنٹی ایک ساتھ شروع ہو گئے اور اس وقت تک جاری رہے جب تک میں نے دروازہ نہیں کھولا۔ دروازہ کھلتے ہی دونوں درویشوں نے یک لخت بولنا شروع کیا اور "نان سٹاپ" بولتے چلے گئے۔ جب ان کی روانی میں کچھ کمی ہوئی تو میں نے ان سے کہا کہ وہ جو کچھ بھی کہہ رہے تھے اگر باری باری کہیں، دوبارہ کہیں اور تسلی سے کہیں تو ممکن ہے میری سمجھ میں کچھ آجائے۔ یہ سنتے ہی درویش دوم نے اپنا خالی بٹوہ میرے سامنے پھینک دیا۔ اور درویش اول پر الزام کی انگلی اٹھاتے ہوئے بپھر کر کہا کہ "یہ سب کچھ اس کی وجہ سے ہوا ـــ" درویش اول اس سے بھی زیادہ جوش میں غرایا اور

درویش دوم [illegible] کو واپس کر دیا۔ اور یوں دیکھتے دیکھتے دونوں طرف سے الزامات کی فائرنگ کھل گئی۔ میں ابھی تک اسے ہوائی فائرنگ سمجھ رہا تھا۔ جو مجھے الو بنانے کے لئے ناٹک کے طور پر کی جا رہی تھی تاکہ میں ان دونوں سے یوں تنہا سیر پر نکل جانے کے بارے میں سوال جواب نہ کر سکوں۔ مگر وہ دونوں تو ایک دوسرے کے بال نوچنے کو تن گئے۔ میری کمینگی نے میرے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔ "یو۔ این۔ او بن جاؤ! بس دل ہی دل میں امن کی بات کرنا ـــ لڑنے دو دونوں کو۔ میچ بڑا دلچسپ رہے گا.... ایک فارغ البال اور دوسرا بال ہی بال..." مگر میں یو۔ این۔ او کیسے بن سکتا تھا۔ ایمانداری سے کوشش کی تو وہ دونوں ٹھنڈے ہو کر بیٹھ گئے اور خالی بٹوے کی کہانی چھیڑ دی۔

دراصل ان کے اس بٹوے کو خالی کروانے کے پیچھے ہوٹل منیلا مڈ ٹاؤن کے اس پورٹر کا مشورہ تھا جو ان دونوں کا سامان پہنچانے ان کے کمرے تک آیا تھا۔ یہ پورٹر لوگ بڑے سیانے ہوتے ہیں۔ لمحے بھر میں لوگوں کی طبیعت کو پہنچان اور نیت کو جان لیتے ہیں اور پھر دونوں درویشوں کی اول جلول طبیعت کو جاننا کونسی بڑی بات تھی۔ چنانچہ اس نے ان دونوں کی طبیعت بحال کرنے کے لئے رضال پارک کے جاپانی اور چینی باغوں کی سیر کا مشورہ دیا۔ خالی خولی سیر میں تو اتنی کشش نہ تھی کہ دونوں درویش اس پھرتی سے وہاں پہنچے کہ انہوں نے مجھے بلانے پر وقت ضائع کرنا بھی گوارا نہ کیا۔ پورٹر نے انہیں اس لئے وہاں فی الفور پہنچنے کی ہدایت کی تھی کہ منیلا کی طالبات صرف سرشام ہی ان باغوں میں ساتھیوں کی تلاش میں نکلتی ہیں اور جونہی کوئی ساتھی مل جاتا ہے فوراً اپنی کمین گاہوں میں گل کھلانے اور رنگ رلیاں منانے چلی جاتی ہیں۔

جب ہمارے یہ گھس صفت یار وہاں پہنچے تو چینی اور جاپانی وضع کے ان باغوں کی رونقیں اپنے پورے شباب پر تھیں۔ ہر طرف باہوں میں باہیں ڈالے نوجوان جوڑے دکھائی دیئے جو دنیا سے بے خبر اس مہکتی شام میں ڈوبے گلگشت کر رہے تھے۔ پھر دو عدد غنچہ دہن۔ گلبدن بیساں، بغلوں میں کتابیں دبائے ان خرانٹ بھنوروں کو دکھائی دیں تو یہ دونوں شکروں کی طرح جھپٹ کر ان تک جا پہنچے۔ چونکہ منیلا میں بچہ بچہ

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

انگریزی بولتا ہے۔ اس لئے گفتگو کا تو مسئلہ تھا ہی نہیں۔ چنانچہ انہوں نے پورٹر کے مشورے پر عمل کیا اور شام کے ساتھی چن لئے۔ اب لڑکیوں کی بغل میں کتابیں تھیں اور درویشوں کی بغل میں لڑکیاں.... یہ عمل اس قدر پھرتی سے ہوا کہ درویش کچھ سوچے سمجھے بغیر ہی ان لڑکیوں کے ہمراہ ان کی گاڑی میں سوار ہو گئے اور ان کی اپارٹمنٹ میں جانے کو چل نکلے۔ جو طالبات یوں گاڑیوں میں تنہا گھومتی ہوں اور گھر والوں سے علیحدہ اپارٹمنٹ رکھتی ہوں۔ وہ یقیناً تعلیم گاہوں سے نکل کر تربیت گاہوں میں قدم رکھ چکی ہوتی ہیں مگر ان باریکیوں پر دھیان دینے کا کس کو ہوش تھا۔ وہ دونوں تو بس لڑکیوں کے عشق میں سرشار مدہوش اور مست تھے۔ چنانچہ گلیاں چوک چوراہے گزرتے رہے اور خدا خبر کہاں کہاں سے گھما پھرا کر وہ انہیں اپنی اپارٹمنٹ تک لے گئیں۔ وہاں ایک معمر خادمہ نے ان کا پرجوش استقبال کرتے ہوئے مشروب مغرب پیش کیا اور دونوں درویش ٹھاٹھ سے وہاں بیٹھ گئے۔ دونوں طالبات اپنے اپنے کمروں سے لوٹیں تو غضب کا رنگ روپ دھارے ہوئے تھیں۔ سکول یونیفارم کی جگہ جذبات بھڑکانے والا شوخ لباس تھا۔ لباس بھی کیا بس ایک تکلف تھا۔ جس کے اندر سے ان کا شوخ و شنگ انگ انگ بار بار بے تکلفی کر رہا تھا۔ درویشوں کے ہاتھوں میں جام آنکھوں میں سرور اور بانہوں میں شباب ایسی حسین زندگی کہ بس خواب کا گماں ہوتا تھا۔ خواب زندہ تعبیر ہونے سے پہلے ہی دروازے پر گھنٹی بجی۔ خادمہ نے دروازہ کھولا تو دو نوجوان داخل ہوئے۔ لڑکیاں اچھل کر ان سے بغل گیر ہو گئیں۔ اور درویشوں کا پتا پانی ہو گیا — چنانچہ درویشوں نے اپنی جان بچانے کی خاطر اپنی جیب میں جتنا مال تھا۔ ان لڑکوں کے حوالے کیا۔ نہ کھایا پیا' نہ گلاس ہی توڑے اور پونچی لٹا کر خالی ہاتھ ہوٹل میں لوٹ آئے۔

فیلا مڈ ٹاؤن ہوٹل کا پورٹر' طالبات' خادمہ اور لڑکے سب اس جال کی کڑیاں تھے۔ جو درویشوں جیسے معصوم مسافروں کو لوٹنے کے لئے ان پر پھینکے جاتے ہیں اور ایسے حادثوں میں لٹنے والے اپنی شرمندگی پر پردہ ڈالنے کی غرض سے ان کو کبھی بے پردہ نہیں کرتے۔ مگر ہم لوگوں نے یہ فیصلہ کیا کہ جس ہوٹل کے پورٹر اپنے مہمان کے ساتھ ایسا سلوک کرتے ہوں اس ہوٹل میں قیام ہرگز نہیں کرنا چاہئے۔ چنانچہ دوسری صبح ہم حیات ریجنسی میں منتقل ہو گئے اور وہاں مجھے بھی ایسا باعزت کمرہ مل گیا۔ جس کی کھڑکی سے آبنائے فیلا کے خوبصورت نظارے ہوتے تھے۔

ان طالبات کی کارروائی سے مجھے لاہور کی گونگی گشتی یاد آگئی۔ جو ایک زمانے میں' بغل میں کتابیں دبائے' کالج یونیفارم پہنے' لاہور کی اس سڑک کے بس سٹاپوں پر کھڑی دکھائی دیتی تھی۔ جس سڑک پر طالبات کے کالج ہیں۔ دوپہر کی چھٹی کے وقت اس سڑک پر بلا کی بھیڑ ہوتی ہے۔ جہاں سکوٹروں اور گاڑیوں میں سوار نوجوان اکثر پھیرے لگاتے دکھائی دیتے ہیں۔ یہ یونیفارم بھی انسانوں کے لئے بڑی کمزوری کا باعث بنتی ہے۔ جب یونیفارم بندہ پہن لے تو دوسرے بندوں پر عذاب الٰہی بن جاتا ہے۔ اور خود عذاب الٰہی سے بے نیاز ہو جاتا ہے جب یونیفارم عورت پہن لے تو وہ بندوں پر عذاب الٰہی کا سبب بن جاتی ۔ مثلاً فضائی میزبانوں کو دیکھیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ لڑکی بھلے چونی کی ہو۔ ہوائی کمپنی کی یونیفارم پہنتے ہی سونے کی بن جاتی ہے اور بڑے بڑے پھنے خان ان یونیفارم والی چونیوں کو حاصل کرنے کے لئے جائدادیں لٹا دیتے ہیں۔ لاہور کی وہ گونگی گشتی مردوں کی اس ابدی کمزوری سے بخوبی واقف تھی اور اکثر بڑی بڑی کاروں میں گھومتی دکھائی دیتی تھی۔

میرو کا ڈرائیور فرنینڈو پاکستانیوں کی رگ رگ سے واقف تھا۔ کیونکہ جب سے میرو فیلا میں مقیم ہوا۔ اس کے لہوری یاروں نے فیلا کا رخ کیا۔ صرف "لہوری" ہی کیا۔ جو پاکستانی بھی میرو کو فیلا میں مل جاتا۔ میرو اس پر بچھ جاتا۔ اور بیچارہ فرنینڈو ان کو گھمانے پھرانے پر لگا دیا جاتا۔ چنانچہ دس سال کے اس عرصے میں وہ ایک پختہ گائیڈ بن چکا تھا۔ جو پاکستانیوں کی ہر اچھی اور بری ضرورت کو پورا کرنے پر پوری طرح دست رس رکھتا تھا۔ چنانچہ ہمیں ہوٹل حیات ریجنسی میں منتقل کرنے کے بعد اس نے فیلا کے سکے بند ٹور کا آغاز کیا اور سب سے پہلے ہمیں راجہ سلیمان کے قلعے لے گیا— جو اب سیتیاگو کا قلعہ کہلاتا ہے۔ دوسری جنگ عظیم میں جاپانیوں نے فلپائنیز سے امریکنوں کو مار بھگایا تھا۔ اور تین سال تک چلک پر اپنا قبضہ جما لیا تھا۔ ۱۹۴۵ء

میں جنرل میکارتھر نے جب فلپائنز پر دوبارہ قبضہ کیا تو قلعہ سینتیاگو پر زبردست بمباری کی گئی۔ کیونکہ اسی قلعے کے اندر ہی جاپانیوں نے اپنا ہیڈ کوارٹر بنا رکھا تھا۔ ہم نے قلعے کی شکستہ دیواروں سے دریائے پاسگ کے نظارے کئے اور فرنینڈو کو جذباتی ہونے سے پہلے ہی اسے اس تاریخی قلعے سے نکالا اور رضال پارک لے گئے۔ جی ہاں! یہ وہی رضال پارک ہے جس کے چینی اور جاپانی باغوں کی سیر کو درویش اول اور درویش دوم گئے تھے اور دو بیبیوں کے ہاتھوں اپنی پونجی لٹا آئے تھے۔ مگر اس وقت ہم خوزے رضال کے مجسمے کے سامنے کھڑے تھے۔ خوزے رضال فلپائنز کا ایک انقلابی ہیرو تھا۔ جس نے ہسپانوی حکمرانوں کے خلاف آواز بلند کی۔ یہ انیسویں صدی کا ذکر ہے جب انقلابی وکلاء نے اپنے اپنے ملک کے حکمرانوں کو چیلنج کیا اور آزادی کی جدوجہد کا آغاز کیا۔ خوزے رضال وکیل ہونے کے علاوہ ڈاکٹر' مصور' مصنف' شاعر اور بہت سی زبانوں کا ماہر تھا۔ جس کے ایک ناول نے وہاں تہلکہ مچا دیا اور ہسپانوی حکمرانوں نے اسے دیس نکالا دے دیا۔ چند سالوں بعد جب وہ واپس لوٹا تو اس پر بغاوت کا الزام لگایا اور اسی مقام پر جہاں ہم کھڑے تھے اسے ۱۸۹۶ء میں گولیوں کا نشانہ بنا دیا گیا۔ اسی جگہ پر اب اس کا مجسمہ نصب ہے۔ چونکہ حکمرانوں کی گولیاں انقلابوں کو دبایا نہیں کرتیں بلکہ اور بھڑکایا کرتی ہیں۔ اسی لئے سپین کی گرفت فلپائنز پر کمزور پڑ گئی اور انہوں نے اپنی جان چھڑانے کی خاطر پورا ملک دو کروڑ ڈالر میں امریکہ کو فروخت کر دیا۔ چنانچہ سات ہزار جنیریروں کا یہ ملک تین سو سال کی غلامی کے بعد آسمان سے ٹپکا اور اگلے پچاس سال کی غلامی کے لئے کھجور میں اٹک گیا۔ مگر امریکنوں کی غلامی فلپنوں کو راس آ گئی۔ کیونکہ وہ ہسپانیوں کی نسبت بہتر حکمران ثابت ہوئے اور انہوں نے کچھ ترقی کے کام بھی کئے جس سے ملک کی معیشت پر خوشگوار اثر پڑا۔ دوسری جنگ عظیم میں جب جاپانیوں نے فلپائنز پر قبضہ کیا تو ان کو نکالنے کے لئے امریکن اور فلپنوں شانہ بہ شانہ لڑے اور ۱۹۴۵ء میں جاپانیوں سے ملک آزاد ہو گیا۔ چنانچہ امریکہ نے بھی دوسری جنگ عظیم میں کئے گئے وعدے کے مطابق ۱۹۴۶ء میں فلپائنز کو آزاد کر کے ریپبلک بنا دیا۔ مگر امریکہ نے اپنا اثر و رسوخ بھی قائم رکھا اور فوجی اڈے بھی قائم کر لئے۔ فلپائنز کو آزادی ملتے ہی معاشی بدحالی اور کرپشن کا دور دورہ شروع ہو گیا۔ جس سے عوام کو بڑی مایوسی ہوئی۔

۱۹۶۵ء میں مارکوس کو بڑی امیدوں اور آرزوؤں کے ساتھ عوام نے صدر منتخب کیا۔ تاکہ وہ فلپائنز کی معاشی بدحالی کو سدھار سکے۔ فلپینوز اگرچہ ہمارے عوام کے مقابلے میں بہت زیادہ پڑھے لکھے اور باشعور لوگ ہیں مگر وہ بھی اچھے "کل" کی خاطر اپنا "آج" یعنی ووٹ کا اکلوتا حق نعرے باز مداریوں کے حوالے کر دیتے ہیں اور بار بار وہی دھوکہ کھاتے ہیں۔ مارکوس دو مرتبہ صدر منتخب ہوا مگر آٹھ سال کے عرصے میں غریب اور امیر کے مابین خلیج بڑھتی ہی گئی۔ ہمارے ملک کی طرح چند خاندان تو سب کچھ بن گئے اور عوام ہر شے سے محروم ہو گئے۔ فلپائنز کا آئین امریکہ کے آئین کی طرح ہے۔ جس کے مطابق کوئی صدر تیسری مرتبہ انتخاب نہیں لڑ سکتا۔ چنانچہ ۱۹۷۲ء کے انتخاب کے وقت مارکوس نے مارشل لاء کا اعلان کر دیا۔ کانگریس کو چلتا کیا اور اپنی پسند کا آئین بنا لیا۔ ساتھ ہی ساتھ سیاسی حریفوں کو بھی قید کر دیا۔ جس میں اکینوں بھی شامل تھا۔ یہ وہ دور ہے جب ہمارے ملک میں عوامی مارشل لاء موجود تھا۔

آٹھ سالہ قید و بند کے دوران اکینوں کو دو مرتبہ دل کے دورے پڑے چنانچہ اسے علاج کے لئے امریکہ جانے کی اجازت مل گئی۔ وہ تین سال تک امریکہ میں رہا اور جب ۱۹۸۳ء میں وطن لوٹا تو اسے منیلا کے ہوائی اڈے پر قتل کر دیا گیا۔

جو چپ رہے گی زبان خنجر' لہو پکارے گا آستین کا

چنانچہ اکینوں کا لہو پکارا۔ سرکاری مداخلت کے باوجود عوام نے مقتول اکینوں کی بیوہ کا ساتھ دیا اور وہ الیکشن جیت گئی۔ مگر مارکوس نے عوام کے فیصلے کو رد کرتے ہوئے ان کی امنگوں کو کچلنے کے لئے سڑکوں پر ٹینک چلا دیئے۔ چنانچہ منیلا کی سڑکوں پر ایک جانب ایک آمر کے ٹینک تھے اور دوسری جانب "پیپلز پاور" یعنی عوام کی طاقت کہ جو حقیقت میں طاقت کا سرچشمہ ہیں۔ عوامی جوش و ولولے کے سامنے ٹینکوں کی سٹیل کی ناباں پگھل گئیں۔ مارکوس کے چہیتے سفید بالوں والے بیوکریٹس' موٹی

توندوں والے جنرل اور ان کی بادردی عسکری قوت عوام کے سیل رواں میں تنکوں کی طرح بہہ گئی۔ بے رحم تاریخ نے پھر اپنا انتقام لیا۔ اور پھر ثابت کر دیا کہ آخری فتح ہمیشہ عوام کی ہوتی ہے۔ جو جو قائد' عوام کے کندھوں پر بیٹھ کر تخت طاؤس تک پہنچا ہے۔ وہ جب جب عوام سے آنکھیں پھیرتا ہے تب تب اسے تختہ دار پر چڑھا دیا جاتا ہے۔

فیلا کے "فیتھ ہیلر" لاعلاج مریضوں کا علاج کرنے میں بڑی شہرت پا گئے ہیں۔ ان کے اس انوکھے علاج سے مستفید ہونے کے لئے دور دراز ملکوں سے لوگ آتے ہیں اور علاج کرا کرا کر واپس چلے جاتے ہیں۔ درویش اول ہر انوکھی جگہ دیکھنے اور ہر عجیب و غریب شہرت کے شخص سے ملنے میں گہری دلچسپی رکھتا تھا۔ درحقیقت تجسس پسندی ہی تو سیاحت کی محرک ہے۔ چنانچہ اس نے میرو کے ڈرائیور اور ہمارے گائیڈ فرنینڈو سے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا۔ فرنینڈو پلک جھپکتے ہی ہمیں فلپائینز کے بین الاقوامی شہرت یافتہ "فیتھ ہیلر" ایلیکس اور بیتو (alex orbtio) کے کلینک میں لے گیا۔ ویسے تو فلپائینز میں ہزاروں "فیتھ ہیلر" ہیں مگر اس میں کوئی ڈیڑھ سو کے لگ بھگ ایسے ہیں جو اپنے اس انوکھے علاج پر قدرت رکھتے ہیں۔ "فیتھ ہیلنگ" کا طرز علاج جیسا کہ نام سے ظاہر ہے یقین اور اعتماد کا علاج ہے۔ بالکل ویسا ہی علاج جیسا کہ ہمارے ہاں پیر فقیر اور سادھو سنت لوگ کیا کرتے تھے۔ جس طرح پیروں فقیروں اور سادھو سنتوں میں با کرامت لوگ بھی ہوتے تھے اور ڈبہ پیر بھی۔ اسی طرح "فیتھ ہیلروں" میں کچھ تو واقعی اپنے اس مخصوص علاج پر گرفت رکھتے تھے اور کچھ سراسر فراڈ ہیں۔ کامیاب "فیتھ ہیلروں" کے بارے میں بھی یہ مشہور ہے کہ کبھی کبھی ان کی علاج کی صلاحیت ختم ہو جاتی ہے۔ جسے حاصل کرنے کے لئے انہیں دوبارہ پوجا' پاٹ' ریاضت' محنت اور مشقت کرنی پڑتی ہے۔ اس علاج کے لئے یہ امر لازمی ہے کہ مریض کا اپنے معالج پر پکا یقین اور اعتقاد ہو۔ اس کے بعد "فیتھ ہیلر" کھلے ہاتھوں' بغیر اوزار مریض کی سرجری کرتا ہے۔ جسم کے جس حصے میں بیماری ہو اسے اپنے علم اور عمل کی طاقت سے کھولتا ہے۔ ناکارہ حصے کو نکال کر جسم کو جوں کا توں بند کر دیتا

ہے اور جسم پر سرجری کا کوئی نشاں تک باقی نہیں رہتا۔ ایلیکس اور بیتو کے کلینک میں اس علاج کا ہم نے عملی مظاہرہ تو دیکھا۔ مگر اس مریض کا مکمل علاج ہوا اور اس نے صحت پائی یا نہیں اس کے بارے میں ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ کیونکہ وقتی طور پر تو وہ مریض ہشاش بشاش لگ رہا تھا۔ بعد میں کیا ہوا۔ اس کی ہمیں خبر نہیں۔ البتہ ایک پاکستانی دوست امتیاز ابلہ کے بارے میں میں جانتا ہوں جو اپنی بیوی کا علاج کرانے فیلا کے ایک "فیتھ ہیلر" کے پاس گیا تھا اور اس علاج کے بعد اس کی بیوی مکمل طور پر صحت یاب ہو گئی تھی۔

ہیرسن پلازہ اور شو مارٹ فیلا کے بہت بڑے ڈیپارٹمنٹل سٹور ہیں جہاں دنیا بھر کی شاپنگ کا سامان ملتا ہے اور خاصہ سستا ملتا ہے۔ درویش دوم کے جیتے جی شاپنگ سے بچ نکلنا ممکن ہی نہ تھا۔ چنانچہ ہم نے شاپنگ کے فرض کو ادا کرنے کے لئے سیدھا شو مارٹ کا رخ کیا۔ دنیا کے ہر شاپنگ سنٹر میں ہمہ وقت گاہکوں کی بھیڑ بھاڑ ہوتی ہے۔ وہ چاہے کراچی کی طارق روڈ ہو' ملتان کا حسین آگاہی ہو' لاہور کی لبرٹی مارکیٹ ہو' پنڈی کا راجہ بازار ہو یا پشاور کا بازہ' ہمیشہ زنانہ اکھاڑہ ہی دکھائی دیتے ہیں۔ جہاں گاہکوں اور دوکانداروں کا دنگل جاری رہتا ہے۔ ایسے بھیڑ بھڑ کے والے شاپنگ سنٹروں میں "دل' پشوری" کرنے والے جوانوں کی بھی کمی نہیں ہوتی جو بھیڑ سے بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے بھرپور جسموں سے ٹکراتے ہیں اور سکون پاتے ہیں۔ جسم تو درویش دوم کا بھی بھرپور تھا مگر کسی مائی کے لال کی ہمت نہ ہوتی جو اس سے ٹکراتا۔ چنانچہ ہم قطار بنا کر اس کے پیچھے پیچھے چلتے چلے جاتے اور راستہ خودبخود ملتا چلا جاتا تھا۔

فیلا میں شاپنگ کے لئے کھیلوں کے کپڑے اور سامان' جرابیں' بنیان' انڈرویئر' ٹوتھ پیسٹ' شیمپو' قمیضیں اور جوتے بہت معیاری اور سستے ملتے ہیں۔ چنانچہ درویش دوم نے ہر شے کو کلو کے حساب سے خریدا اور شاپنگ بیگ بھروا لئے۔ وہاں ادرک بھی بہت عمدہ اور بہت ہی سستی ملتی ہے اور اس ظالم نے چار کلو ادرک بھی خرید ڈالی۔

البتہ ایک ایک "بارونگ" درویش اول اور مَیں نے بھی خریدا۔ "بارونگ" فلپائنیز کا مردانہ قومی لباس ہے۔ جو پائین ایپل اور کیلے کے باریک ریشوں سے بنا جاتا ہے۔ لمبی آستین والی اس بشرٹ کے سامنے والے حصے پر بڑی نفیس کڑھائی کا کام ہوتا ہے۔ ہسپانوی حکمرانوں نے فلپینوں عوام کو ان کی غلامی کا احساس دلانے کے لئے ان پر یہ پابندی عاید کر دی تھی کہ وہ نہ تو ٹائی باندھ سکتے تھے اور نہ ہی اپنی قمیص کو پتلون کے اندر ڈال سکتے تھے۔ چونکہ ہر مجبوری ایجاد کی ماں ہوتی ہے۔ اس لئے فلپینوں نے "بارونگ" ایجاد کیا جو حکمرانوں کی پابندی بھی پوری کرتا تھا۔ اور پہننے میں خوبصورت بھی لگتا تھا۔ اب "بارونگ" ان کا قومی لباس بن گیا ہے جسے ہر تقریب پہ ہر جگہ پہنا جاسکتا ہے اور بڑے فخر سے پہنا جا سکتا ہے۔

دوپہر ڈھلے' شاپنگ کے تھیلوں سے لدے جب ہم اپنے ہوٹل حیات ریجنسی پہنچے تو شرم سے پانی پانی ہو گئے۔ کیونکہ جاپان ایئر لائینز والوں نے درویش دوم کا گم شدہ سامان ہمارے اس ہوٹل میں پہنچا دیا تھا۔ حالانکہ جب سامان کی رپورٹ لکھوائی تھی تو ہم نے منیلا مڈ ٹاؤن ہوٹل کا پتہ دیا تھا۔ جاپان ایئر لائینز کے عملے نے فرض شناسی کرتے ہوئے ایمانداری سے کوشش کی اور ہمیں ڈھونڈھ کر سامان ہم تک پہنچ دیا۔ جو بات باعث شرمندگی تھی وہ جاپان ایئر لائینز اور پی آئی اے کی سروس کی تھی۔ کیونکہ پی آئی اے کے افسر ہونے کے ناطے ہم یہ جانتے تھے کہ اگر پی آئی اے کے کسی مسافر کا سامان گم ہو جاتا۔ جو اکثر گم ہوتا ہے۔ تو ہمارا عملہ کبھی بھی سامان پہنچانے کا تردد نہ کرتا۔ اور شاید یہ تردد اور احساس ذمہ داری ہی وہ فرق ہے۔ جس نے جاپان کو تو ترقی کے آسمان پر پہنچا دیا اور ہم ابھی تک پستیوں میں پڑے ہوئے ہیں۔

ہوٹل کے کمرے میں پہنچتے ہی دونوں درویشوں یعنی درویش اول اور درویش دوم نے منیلا سے وطن واپسی کا ڈنکا بجا دیا۔ میں ان کے اس یک طرفہ اعلان پر خاصہ پریشان ہوا کیونکہ ابھی ہماری چھٹیاں بھی باقی تھیں اور اپنے اصل پروگرام کے مطابق سیر و تفریح کے لئے ممالک بھی کئی باقی تھے۔ اور پھر منیلا بھی تو پوری طرح نہیں دیکھا تھا۔ مگر انہوں نے تو صاف صاف بتا دیا کہ یہ منیلا میں ان کی آخری رات تھی۔ اور وہ بہر صورت پاکستان لوٹ جائیں گے۔ چنانچہ میرے لئے صرف دو ہی راستے باقی تھے۔ یا تو مَیں ان کے ساتھ واپس وطن لوٹ جاتا اور چھٹیاں اور سیر و تفریح دونوں کو ادھورا چھوڑ دیتا۔ اور یا پھر دونوں درویشوں کو واپس جانے دیتا اور خود اپنا سفر جاری رکھتا۔ مگر یہ بڑا ہی کٹھن فیصلہ تھا۔ اور بحیثیت قوم اور فرد ہم لوگ کٹھن فیصلے کرنے کے عادی نہیں ۔ چنانچہ مَیں نے بھی یہ فیصلہ حالات پر چھوڑ دیا --- اور منیلا میں درویشوں کی الوداعی رات کی تیاری شروع کر دی۔

میرو منیلا کا شہزادہ ہے جس سے امریکن اور فلپینوں بے پناہ محبت کرتے ہیں اور میرو پاکستانیوں سے بے پناہ محبت کرتا ہے ۔ ائرپورٹ کا عملہ' ہوٹلوں کے مینجر' گاڑیوں کی صفائی اور دروازے کھولنے والے چھوکرے' منیلا کے نائیٹ کلبوں کی حاسین ' ایشین ڈویلپمنٹ بینک کے عہدیدار ' امریکی فوجی اڈوں کے افسر اور سفارت خانے کے ڈپلومیٹس سب کے سب میرو کے چاہنے والے ہیں ۔ بالخصوص امریکن تو اس کے بغیر اپاہج دکھائی دیتے ہیں یہاں تک کہ جب ان میں سے کوئی فلپینوں بیوی کا انتخاب بھی کرتا ہے تو میرو سے مشورہ ضرور کرتا ہے ۔ ویسے کچھ عرصے سے امریکنوں اور دوسرے یورپین میں مشرقی بیویاں کرنے کا رواج عام ہو گیا ہے ۔ کیونکہ نسوانیت' خدمت اور گھر گرستی' مشرقی لڑکیوں کا زیور ہے ۔ جو انہیں مغربی لڑکیوں میں نہیں مل سکتا ۔ کیونکہ مغربی لڑکیاں تو مردوں کی برابری کرتے کرتے اتنی دور نکل گئی ہیں کہ اب وہاں کے مردوں کو ان کی برابری کرنے کی مہم چلانی پڑے گی ---- خدا کرے پاکستانی لڑکیوں کو مردوں سے برابری کا اتنا شوق نہ بڑھ جائے کہ یہاں کے مردوں کو مشرق بعید کا رخ کرنا پڑے۔ مگر میرو نے تو پہل کرتے ہوئے فلپینوں لڑکی سے شادی کر رکھی ہے ۔ جس سے دوسرے پاکستانیوں کے لئے راستہ صاف ہو گیا ہے --- ہاں تو بات میرو اور اس کے وسیع تعلقات کی ہو رہی تھی ۔ کہ اگر وہ پرائے دیس میں امریکنوں کی بیساکھی بن سکتا ہے تو اپنے ملک میں کیا ہوتا ؟ میرو اپنے ملک میں کچھ نہ ہوتا ۔ صرف اچکا ہوتا ۔ کیونکہ ہم اپنے ملک کے ہر ٹیلنٹڈ" آدمی کو اچکا بنا دیتے ہیں۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہم تینوں درویشوں نے اپنے اس سفر کی آخری رات یکساں لباس یعنی "بارونگ" پہنے اور رات کی واردات پر نکل پڑے ۔ "بارونگ" گو بہت ہی خوبصورت لباس ہے مگر جچتا صرف ان جسموں پر ہے جو قدرے بھر پور ہوں ۔ درویش اول پر تو وہ لباس خوب سجا البتہ درویش دوم اور میں اس لباس میں خاصے چغد لگ رہے تھے ۔ اس کے جسم پر "بارونگ" یوں ٹھنسا ہوا تھا کہ اسے اپنی ہر ہر سانس پر بٹن ٹوٹنے کا خطرہ لاحق تھا ادھر میرے جسم پر یہ لباس ہینگر کی طرح لٹکا ہوا تھا ۔ ہوٹل کی لابی میں ہر شخص ہمیں یوں دیکھ رہا تھا گویا ہم نے سرے سے کچھ پہنا ہی نہ ہو ۔ اس حالت میں گھومنا پھرنا تو ہمارے لئے ناممکن تھا ۔ درویش اول نے ہماری حماقت کا احساس کرتے ہوئے ہمیں بتایا کہ "بیوقوفو اوپر جا کر اپنے "بارونگ" بدل کے آؤ ۔ افراتفری میں تم لوگوں نے ایک دوسرے کے "بارونگ" پہن لئے ہیں" واقعی اس کی بات سچی تھی ۔ جونہی ہم نے "بارونگ" بدلے تو اس کی جان میں جان آئی" اور میرے جسم پر "بارونگ" فٹ آگیا ۔ اور ہم دونوں بھی درویش اول کی طرح اچھے خاصے انسان دکھائی دینے لگے ۔

میرو سے ملاقات تو میبنی کے ایک نائیٹ کلب میں ہونا تھی ۔ جس میں ابھی خاصی دیر تھی ۔ چنانچہ ہم لوگوں نے اپنے ہوٹل حیات ریجنسی کے قریب روخاس بلیوارڈ کے نائیٹ کلبوں میں جھانکا تانکی کا فیصلہ کیا ۔ یہاں کے نائٹ کلب 'ڈسکو' مساج پارلر اور ریستوران میبنی کے مقابلے میں خاصے مہنگے ہیں ۔ مگر یہاں کی سروس کا سٹینڈرڈ بھی وہاں کی نسبت بہت بہتر ہے ۔ کہ یہاں کے کلبوں میں ڈانس کرنے والی لڑکیاں اکثر فیشن ماڈل اور ہلکی پھلکی ایکٹرسیں ہوتی ہیں جب کہ وہاں صرف وہ نوخیز لڑکیاں ہوتی ہیں جو فلپائینز کے پسماندہ علاقوں سے روزی کی تلاش میں مینسلا پہنچتی ہیں ---- اس بلیوارڈ پر سرگشتی کرتے کرتے جو زفین ریستوران کے سامنے سے گزر ہوا تو میں نے درویشوں کو مشورہ دیا کہ کیوں نہ پہلے پیٹ پوجا کر لی جائے کیونکہ فاقہ مستی میں عیاشی ہرگز رنگ نہیں دکھاتی ۔ حیرت کی بات ہے کہ اس سفر میں پہلی مرتبہ وہ دونوں بلا حیل و حجت میری بات مان گئے ۔ اور ہم تینوں جو زفین ریستوران میں میز سنبھال کر بیٹھ گئے ۔ یوں آسانی سے میز ملنے پر ہم باقاعدہ فخر کر سکتے تھے ۔ کیونکہ یہ ریستوران بھانت بھانت کے سیاحوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا ۔ ہماری میز کے مخصوص دبلے پتلے ویٹر نے ایک ضمیمہ نما مینو کارڈ ہمیں تھما دیا ۔ ریستوران کی دھیمی روشنی میں مینو کارڈ ہمیں کیا خاک نظر آتا تھا ۔ چنانچہ ہم نے اپنے لاغر سے ویٹر سے ریستوران کی خاص "ڈش" کے بارے میں مشورہ لیا ۔ ریستوران کے ویٹروں سے خوراک کے بارے میں مشورہ لینے سے صرف دو خطرے ہوتے ہیں ۔ اول تو وہ اس خوراک کو منگانے کا مشورہ دیں گے جو کوئی گاہک نہ کھاتا ہو اور اس کے باسی اور ضائع ہونے کا خطرہ ہو اور یا اس خوراک کا مشورہ دیں گے جو ان کو پسند ہو اور وہ خود نہ کھا سکتے ہوں ۔ ان خطروں کے باوجود ہم نے اس چوزے کی رائے مانگی تو اس نے "لاپو لاپو" مچھلی کھانے کا مشورہ دیا ۔ مچھلی گو بہت ہی معصوم غذا ہے اور یہ حرام حلال کے چکر سے بھی بچی ہوئی ہے مگر غیر ملکوں میں اگر دوران سفر غلط وقت پر مچھلی کھا لی جائے تو "فوڈ پوائزننگ" کا خطرہ لاحق ہو جاتا ہے اور کوئی سیاح ہرگز یہ خطرہ مول نہیں لے سکتا ۔ مگر درویش اول نے مچھلی کھانے کے بارے میں ایک محفوظ سا کیلنڈر یاد کر رکھا تھا ۔ اس کیلنڈر کے مطابق جس انگریزی مہینے میں "آر" کا لفظ آتا ہے ۔ مثلاً مارچ ' اپریل 'ستمبر' اکتوبر' وغیرہ اس مہینے میں مچھلی کھانا بالکل محفوظ ہے ۔ بشرطیکہ مچھلی تازہ ہو ۔ ویسے دنیا کے ہر خطے میں کوئی نہ کوئی مچھلی ضرور ہوتی ہے جو لذت کے لئے بہت مشہور ہو ۔ مثلاً دریائے راوی کا کھگا واقعی بہت لذیذ مچھلی ہے ۔ بالخصوص کھگا اگر ہمارے دوست منور میر کے ہاتھ کا پکا ہو تو وہ کشتہ بن جاتا ہے ۔ شاید اسی لئے منور میر قریبی دوستوں میں کھگے کے نام سے مشہور ہے ۔ سندھ کی پلا مچھلی بھی لذت میں اپنا جواب نہیں رکھتی ۔ مگر اس مچھلی کا لطف اٹھانے کے لئے خلوص اور تحمل سے دھیرے دھیرے کانٹے نکالنے پڑتے ہیں ۔ اگر جلد بازی کی جائے تو یقیناً کانٹا حلق میں اٹک جاتا ہے ۔ در حقیقت صوفیوں اور سنگیتوں والی سندھ کی سر زمین کا یہی مزاج ہے ۔ کہ وہاں کے باسی پیار اور محبت پر جان نچھاور کر دیتے ہیں ۔ مگر نفرت کا جواب اس شدت سے دیتے ہیں کہ وہ پلا مچھلی کے کانٹے کی طرح حلق

میں اٹک کر رہ جاتا ہے ۔ چونکہ اسلام آباد کے ایر کنڈیشن ایوانوں میں بیٹھ کر تقدیروں کے فیصلے کرنے والے سندھ کے مزاج سے ناواقف ہیں ۔ یقیناً اسی لئے پیار کا وہ گہوارہ نفرتوں کا مرکز بن گیا ہے ۔

ہاں تو بات "لاپو لاپو" مچھلی کی ہو رہی تھی ۔ جسے کھانا درویش اول کے کیلنڈر کے مطابق محفوظ تھا ۔ چنانچہ ہم نے اس مچھلی کا آرڈر دے دیا ۔ ہمارا لاغر سا ویٹر جنوبی فلپائینز کے جزیرے مندا ناؤ کا رہنے والا مسلمان تھا ۔ "بارونگ" کے باوجود خدا خبر وہ کیسے یہ اندازہ لگا گیا کہ ہم لوگ کسی مسلم ملک کے باشندے ہیں ۔ اور جب درویش دوم نے اسے بتایا کہ ہم پاکستانی مسلمان ہیں تو اس کی مسکراہٹوں میں بھی اضافہ ہو گیا اور سروس بھی بہت بہتر ہو گئی ۔ جب وہ ہمارا کوکا کولا کا آرڈر لے کر آیا تو خالی بوتلیں رکھنے کے لئے لکڑی کا ایک ڈالا بھی لے آیا۔ فیلا میں اکثر جگہوں پر یہ رواج ہے کہ جب گاہک بیئر وغیرہ پینے بیٹھتے ہیں تو ہوٹل والے ایک ڈالا بھی ساتھ رکھ دیتے ہیں تاکہ گاہک خالی بوتلیں اس ڈالے میں رکھتے جائیں اور یوں بل چکاتے وقت کوئی غلط فہمی نہ ہو سکے ۔ کمپیوٹر دماغ درویش دوم کے ہوتے ہوئے ہمارے بل میں تو کسی قسم کی غلط فہمی کی گنجائشیں ہی نہ تھی ۔ پھر ہم نے تو پینے ہی صرف تین کوکا کولا تھے ۔ جن کی بوتلیں ہم نے مضبوطی سے تھام رکھی تھیں ۔ رہی "لاپو لاپو" مچھلی تو اس سے ہمارے ویٹر نے اس ہنرمندی سے کانٹے الگ کئے کہ ہم آنکھ بند کر کے وہ لذیذ مچھلی کھا گئے ۔

حسب وعدہ پورے نو بجے ہم میسنی پہنچے تو اس وقت میسنی کی رونقیں پورے شباب پر تھیں ۔ سڑک کے دونوں جانب ڈسکو بار ہیں ۔ اور سینکڑوں ڈسکو بار ہیں۔ جن کے رنگ برنگ ' جلتے بجھتے "نیو ان سائن" نمائشی برقی جھالریں ' باوردی دربان اور راہگیروں کو بے دردی سے ڈسکو کے اندر کھینچتی بے وردی بیساں ' پھر سیاحوں کے جتھے اور ان جتھوں کے ارد گرد منڈلاتے دلال۔ بنکاک کی پیٹ پاؤنگ روڈ کے علاوہ میں نے ایسا جسم ' جنس اور جوانی کا بازار کہیں نہیں دیکھا ۔ جسم ' جنس اور جوانی کی تجارت تو زمانہ قدیم سے ہوتی آئی ہے ۔ مگر فیلا اور بنکاک جیسی کھلی نیلامی شاید انسانی تاریخ میں پہلے کبھی نہیں ہوئی۔ اس جنسی تجارت کی فروغ کا سہرا سو فی صد امریکنوں کو جاتا ہے کیونکہ جس ملک میں بھی امریکی فوجوں نے اپنی چھاؤنیاں ڈالی ہیں ۔ انہوں نے سب سے اول اس ملک کی حیا اور آبرو پر چاند ماری کی ہے ۔ کوریا ' فلپائینز ' تائیوان ' جاپان ' ویت نام اور تھائی لینڈ ایسے ممالک ہیں جن کی نسلوں پر امریکی فوجیوں کی جنسی یلغار کے بد نما نشان تا قیامت ثبت رہیں گے ۔ اب امریکنوں کی زد میں عربوں کی آبرو ہے ۔ اپنے بے انتہا پیٹرو ڈالر کے بل بوتے پر غریب ملکوں میں جا کر آبرو ریزی کرنے والے عرب ' اپنی چار دیواری کا دفاع کرنے والے امریکن فوجیوں سے اسی چار دیواری کے اندر سہمی سہمی حیا کو کیسے بچائیں گے یہ دیکھنا ہو گا !

فائیر ہاؤس ' پائپ لائن ' نیو بنکاک ' سیکس سیکنڈل ' ڈیشنگ گرل اور نہ جانے کس کس نام کے ڈسکو بار دیکھتے دیکھتے ' دلالوں کے آنکھ چراتے ' دربانوں سے بازو چھڑاتے اور بیباک بیبیوں سے اپنے نئے نویلے "بارونگ" بچاتے ہم روڈ ہاؤس ڈسکو بار میں پہنچے ۔ اس ڈسکو کا مالک امریکن ' مینجر آسٹریلین اور مال یعنی لڑکیاں سب کی سب فلپینوں ہیں ۔ اسی ڈسکو میں میرو نے ہمیں ملنے کا ٹائم دیا تھا ۔ دھیمی روشنی سے کچھ سمجھوتہ ہوا تو ہم نے دیکھا کہ اس ڈسکو میں تو پاکستانیوں کا جمعہ بازار سجا ہوا تھا۔

ہر پاکستانی کے پہلو میں ایک ایک فلپینوں حور ۔ گویا جیتے جی' دنیا میں ہی ان فرزندان اسلام نے جنت کا ایڈوانس لے لیا ہو۔ ہماری آمد سے بے خبر ہمارا میزبان میرو حوروں کی جامہ تلاشی میں الجھا ہوا تھا ۔ قریب ہی ایک اونٹ سا لمبا پاکستانی جھوم رہا تھا جس نے ایک ہاتھ میں ڈیڑھ فٹ لمبا دارو کا گلاس تھام رکھا تھا اور دوسری جانب بغل میں ایک پانچ فٹ لمبی حور دبا رکھی تھی ۔ ایک اور پاکستانی موصوف نے حوروں کے جھرمٹ میں بھی سر پر ہیلمٹ پہن رکھی تھی ۔ ایک آدھ حور تو اس چمکیلی ہیلمٹ پر باقاعدہ ہاتھ پھیر رہی تھی ۔ موت کے کنویں میں موٹر سائیکل چلانے والوں کو حفاظتی ہیلمٹ پہنے تو ہم نے دیکھا تھا ۔ مگر ڈسکو بار میں ہیلمٹ پہننے والا یہ پہلا شخص تھا جو ہماری نظر سے گزرا ۔ سٹیج پر بھی ایک پاکستانی نے ہی رنگ جما رکھا تھا ۔ سیاہ رنگ ' شلوار قمیص میں ملبوس ' وہ پیٹا نما بندہ ' نیم برہنہ ڈانسروں کے ہمراہ ناچ

رہا تھا ۔ گوہر تان پہ وہی اوٹ پٹانگ بھنگڑا ناچ رہا تھا ۔ اس نفسا نفسی کے عالم میں ہمارا کس کو ہوش تھا ۔ مگر جونہی میرو کی نظر ہم پر پڑی تو اس نے ایسا خوش آمدیدی نعرہ لگایا کہ لمحہ بھر کے لئے تو ڈسکو بار میں خاموشی چھا گئی اور تعارفوں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو گیا ۔ اب تک تو ہماری آنکھیں بھی مدہم روشنی سے پوری طرح مانوس ہو چکی تھیں ۔ ہیلمٹ والے صاحب سے تعارف ہوا تو وو انکشاف ہوئے ۔ اول تو انہوں نے سر پر ہیلمٹ نہیں پہنی ہوئی تھی ۔ بلکہ وہ چمکیلی شے ان کی اپنی ٹنڈ تھی ۔ جس پر وہ باقاعدہ تیل مالش کرواتے تھے ۔ ان سے واقفیت ہونے کے باوجود بارہا میرا دل چاہا کہ ان کی ٹنڈ پر تھاپ دے ماروں اور کہوں ۔ گنجو بیشل تیری کھوپڑی میں تیل ـــــ دوسرا یہ کہ ان کا نام زاہد ہے اور وہ یقیناً دنیا کا پہلا زاہد تھا جو کھلے بندوں شراب پیتا تھا ۔ یہ کہاوت مشہور ہے کہ برا آدمی ہر وہ کام کھلے بندوں کر گزرتا ہے بھلا آدمی جس کی خواہش تو رکھتا ہے مگر کر نہیں پاتا ۔ زاہد کی اس صداقت سے میں بہت متاثر ہوا۔ ادھر درویش اول تو جھپٹ کر اس سے بغل گیر ہی ہو گیا ۔ خدا خبر یہ ریچھ جپھہ دانستہ تھا یا اتفاقاً کہ یہ دونوں اپیکسونین دیر تک جپھہ ڈالے اپنے پرانے کالج کے بارے میں باتیں کرتے رہے ۔ حالانکہ دونوں جانتے تھے کہ ان دونوں کے جپھے میں زاہد کے پہلو میں بیٹھی نیم برہنہ حور بھی ہے ۔ میں نے بھی میرو کو جذباتی جپھہ ڈالا مگر بد قسمتی سے ہم دونوں کے بیچ نہ کوئی حور نہ لنگور ـــــ شتر مرغ محبوب سرور سے بھی ملاقات ہوئی ۔ اس ظالم نے اس زور سے پنجہ ملایا کہ میری انگلیاں بے جان ہو گئیں ۔ موصوف کسی امریکن آئل کمپنی میں بہت بڑے افسر تھے اور یہ اونچا عہدہ اُسے اپنی دراز قامتی کی وجہ سے نہیں بلکہ ہنرمندی کے سبب ملا تھا ۔ اسی اثناء سٹیج پر بھنگڑا ڈالنے والا پیتا بھی ملاقات کے لئے پہنچ گیا ۔ خواجہ صاحب دن بھر تو گلی گلی گھوم ' قالین بیچتے تھے اور رات میں ڈسکو باروں میں جھوم جھوم بھنگڑا ڈالتے تھے ۔ صدیوں سے فیلا میں مقیم تھے ۔ اور واپس لاہور لوٹنے کا ارادہ بھی نہیں رکھتے تھے۔

فیلا کے ڈسکو بار چوبیس گھنٹوں میں صرف چند گھنٹوں کے لئے ہی بند ہوتے ہیں ۔ حقیقت میں تو جب وہ بند ہوتے ہیں تو ان کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں تاکہ صفائی بھی کی جا سکے اور دھوئیں کی گھٹن بھی دور ہو سکے ۔ دوپہر ڈھلے ان باروں میں ہیپی آور (happy hour) یعنی خوشگوار لمحے شروع ہو جاتے ہیں ۔ جو شام ڈھلے تک جاری رہتے ہیں ۔ ان اوقات میں گاہکوں کو ہر شے آدھی قیمت پر ملتی ہے کیونکہ " ہیپی آور" کے دوران ان کلبوں میں ناچنے والی لڑکیاں بھی یہ کام "پارٹ ٹائم" کرتی ہیں اور زیادہ تر گاہک بھی ایسے ہوتے ہیں جو دفتروں سے آنکھ بچا کر نکلتے ہیں اور تھوڑی دیر عیاشی کر کے اپنے اپنے گھروں کو شریفانہ وقت میں لوٹ جاتے ہیں ۔ اس "شارٹ ٹائم" عیاشی والے لوگوں کی سہولت کے لئے اس علاقے میں درجنوں "لووٗ ہوٹل" (love hotel) ہیں ۔ جہاں کمرے دنوں کی بجائے گھنٹوں کے لئے کرائے پر ملتے ہیں ۔ جونہی رات اپنا سیاہ دامن پھیلاتی ہے تو یہاں کے کلبوں کا کاروبار اپنے معمول پر آجاتا ہے ۔ فصلی بٹیرے غائب ہو جاتے ہیں اور پھر پو پھٹنے تک صرف انہی لوگوں کا راج ہوتا ہے جو اس جنسی کاروبار کو دل و جان سے چاہتے ہیں ۔ ان کلبوں کی "گوگو" ڈانسر فلپائینز کے دور دراز پسماندہ جزیروں سے فیلا پہنچتی ہیں اور اپنے حسن ' جسم اور جوانی کے بل بوتے پر اسی طرح شہرت اور دولت حاصل کرنا چاہتی ہیں جس طرح برسوں پہلے امیلڈا مارکوس نے پائی ۔ امیلڈا کی کہانی سنڈریلا کی طلسمی داستان سے ملتی جلتی ہے۔ ۱۹۵۴ء میں وہ بھی (Leyte) لیٹے کے جزیرے سے صرف حسن اور جوانی کی پونجی لے کر فیلا پہنچی تھی ۔ تو اس کے بے پناہ حسن نے فیلا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا اور وہاں کی ملکہ حسن قرار پائی ۔ نوجوان کانگریس مین ' فرڈیننڈ مارکوس نے ملکہ حسن کو اپنی ملکہ بنا لیا ۔ کچھ برس بعد جب مارکوس فلپائینز کا صدر بنا تو پسماندہ جزیرے سے آنے والی غریب لڑکی فلپائنز کی خاتون اول بن گئی ۔ اور پھر بیس (۲۰) برس تک اس نے اسی طرح فلپائینز پر راج کیا ۔ جس طرح ملکہ نور جہاں نے مغل شہنشاہ جہانگیر کے دور میں ہندوستان پر راج کیا تھا ۔ ان کے دور میں ملک غریب رہا اور عوام فاقہ مست رہے مگر امیلڈا نے غربت سے ایسی آنکھیں پھیریں کہ پھر پیچھے مڑ کر نہ دیکھا اور ۱۹۸۶ء میں جب انہیں جلا وطن کیا گیا تو ان کے محل سے سینکڑوں قیمتی

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اشیاء کے علاوہ دو ہزار جوتوں کے جوڑے بھی ملے جو اماڈا نے اٹلی اور فرانس سے منگا رکھے تھے۔

میرو بڑا ہی فراخدل میزبان ہے۔ اس کی میزبانی میں کلب کی ہر شے شامل تھی۔ رہے ہم پاکستانی تو ہم تو ہیں ہی کھلے دل کے مہمان۔ یعنی مفت کے گناہ بھی نہیں چھوڑتے۔ شراب اور شباب کی تو کھلی چھٹی میرو نے دے رکھی تھی۔ مگر ہم تو اس فکر میں تھے کہ کسی صورت پورا ڈسکو بار ہی اکھاڑ کر پاکستان لے جائیں۔ چنانچہ درویش اول نے حسب عادت ایک مماسین سے ٹیلا میں ڈسکو بار کھولنے کی رام کہانی چھیڑ دی۔ یہ مماسین ہر ڈسکو بار اور نائٹ کلب میں ہوتی ہیں۔ جو جوانی میں تو ڈانسر ہی ہوتی ہیں مگر ریٹائرڈ ہونے پر دوسری "گوگو" ڈانسروں کو کنٹرول بھی کرتی ہیں اور "ٹرین" بھی کرتی ہیں۔ چونکہ وہ ڈانسروں کی اچھی بری خصلت سے بخوبی واقف ہوتی ہیں۔ اس لئے خرانٹ گاہک لڑکی کے انتخاب میں ہمیشہ مماسین کا مشورہ لیتے ہیں۔ شائد اسی لئے درویش اول نے اس مماسین سے ناطہ جوڑا تھا۔ پوہ پھٹے تک "روڈ ہاؤس" میں پاکستانیوں کا اکھاڑہ جما رہا اور یوں ناریوں کے جھرمٹ میں درویشوں نے اپنے سفر کی آخری رات گزاری۔

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com